غلبۂ اسلام

اور دوسری تحریریں

غلبۂ اسلام

اور دوسری تحریریں

راشد شاز

ترتیب و تدوین

کوثر فاطمہ

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی-۲۵

سال اشاعت ۲۰۰۷

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	غلبہٴ اسلام اور دوسری تحریریں
مصنف	:	راشد شاز
مرتبہ	:	کوثر فاطمہ
اشاعت اول	:	۱۹۸۷ء
اشاعت جدید مع اضافہ	:	۲۰۰۳ء
اشاعت سوم	:	۲۰۰۷ء
قیمت	:	ایک سو چالیس روپے (Rs.140/-)

یکے از مطبوعات

انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز

4/1176-D، نیو سرسید نگر، علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۲

Telefax: +91-571-2400182

ناشر

ملّی پبلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

Tel.: +91-11-26926246

Fax: +91-11-26325499

Email: militime@del3.vsnl.net.in

www.barizmedia.com

بسم الله الرحمن الرحیم

اسلام کو ایک ایسی صورتحال مطلوب ہے جہاں ہر شخص کے لئے آزادانہ طور پر خود اپنے آپ کو برتنے، الٰہی ہدایتوں کو خود اس کی روشنی میں سمجھنے اور وحی کے نور سے اپنی شمع کو روشن کرنے کے مواقع میسر آجائیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم پر قطعی یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے کہ ہم کسی قوم کی جاہ و حشمت کی بحالی کے لئے کام کریں یا غرناطہ، بغداد اور مغل دہلی کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کریں۔ اس کے برعکس اسلام کو ایک ایسی صورتحال مطلوب ہے جہاں رنگ و نسل، وطن اور مذہب کی شناخت سے پرے نجات و ہدایت اور سکون و انبساط کا ایک عمومی دینی ماحول پیدا ہو۔ یہی وہ صورت حال ہے جسے ہم غلبۂ اسلام سے موسوم کرتے ہیں اور جسے قرآن میں "وَيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ" (انفال: ۳۹) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ترتیب

- عرض مرتب ۱۱

غلبۂ اسلام

۱۶—۸۱

- پیش لفظ (طبع اول) ۱۶
- ابتدائیہ ۱۹
- تحریک غلبۂ اسلام ۲۰
- غلبۂ اسلام کی مساعی پر ایک نظر ۲۶
- انبیائی مشن کا نیا منصوبہ ۴۸
- جدید ہندوستان میں باطل کے مراکز و مآخذ ۵۵
- سیاسی اقتدار ۵۵
- دانش گاہیں ۵۶
- ذرائع ابلاغ ۵۶
- اسلام مخالف تحریکیں ۵۷
- باطل کے حمایتی ۵۸
- جدید ہندوستان میں قوتِ اسلامی کے مراکز ۶۰
- مساجد ۶۰

○ دینی مدارس ۶۱
○ مسلم تنظیمیں ۶۲
○ مسلم قیادت ۶۳
○ اسلام کے حمایتی ۶۴
○ باطل کو کیسے اکھاڑ پھینکا جائے ۶۵
○ خلاصۂ بحث ۷۷

۳

امت میں جھوٹے پیغمبروں کا ظہور

۸۵—۱۰۸

○ شعوری زندگی سے انحراف ۸۹
○ معصوم آئیڈیالزم ۹۲
○ تعلیمی تحریک ۹۴
○ خدمت خلق ۹۷
○ جمہوریت ۹۹
○ سیکولرازم ۱۰۴
○ مہذب دنیا ۱۰۵

۴

بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان

۱۱۲—۱۲۹

ایمانی سیاست کی راہ

۱۴۴—۱۵۱

○ نجات کی راہ ۱۴۶

○ ایمانی سیاست کا مفہوم ۱۴۷

○ نئی سیاسی پارٹی کا منشور ۱۴۸

موجودہ انتخابی نظام میں کامیابی کے امکانات

۱۵۵—۱۶۲

استفسارات

۱۶۵—۲۱۷

○ غایت دین کیا ہے؟ ۱۶۵

○ اجتہاد کا حق کسے ہے؟ ۱۶۸

○ قضیہ بامیان مجسموں کے انہدام کا ۱۷۰

○ امتِ وسط سے کیا مراد ہے؟ ۱۷۳

○ نظام کفر میں شرعی امارتیں ۱۷۶

○ شیعہ سنی اختلاف کا مسئلہ ۱۸۱

- کیا اسلامائزیشن کے راستے غلبہ اسلام کا معرکہ سر کیا جاسکتا ہے؟ ۱۸۷
- بین المذاہب مکالموں کا شرعی جواز؟ ۱۹۴
- اسلام کو کیا مطلوب ہے؟ ۱۹۶
- جب علماء و مشائخ کو خدا بنالیا جائے ۲۰۱
- کیا مسلمان انسانی حقوق کے لئے کام کرسکتے ہیں؟ ۲۱۲

عصر حاضر میں غلبہ اسلام کے امکانات
ایک ہمہ جہتی مکالمہ

۲۲۱—۲۴۴

- غلبہ اسلام کا مفہوم ۲۲۱
- اسلام کی نئی تعبیرات ۲۲۶
- اسلام ایک رویہ ہے یا شناخت ۲۲۷
- دینِ خالص بنام مذاہب فقہ ۲۳۱
- طاعت گزاروں کا عالمی محاذ ۲۳۴
- مستقبل کا عالمی نظامِ عدل اور موجودہ فقہی مسلمان ۲۳۷
- اسلام اور مستقبل کی تہذیبی جنگ ۲۴۱
- نظامِ عدل اور مسلم حکومت میں فرق ۲۴۲

عرض مرتب

"غلبۂ اسلام: ہندوستان میں احیائے اسلام کا منشور" پہلی بار ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس مختصر سی کتاب کو جس قدر پذیرائی ملی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک نئی مسلم سیاسی فکر وجود میں آئی۔ ۱۹۹۱ء میں دہلی میں ہندوستانی مسلمانوں کا ملک گیر کنونشن اور ۱۹۹۳ء میں دہلی کے ماؤلنکر ہال میں ملی پارلیامنٹ کے پہلے ہمہ گیر اجلاس اور بعد کے دنوں میں پٹنہ میں مسلم سیاسی بل کی منظوری کو اس کتاب کا ہی پیش منظر سمجھنا چاہیے۔ گو کہ ایک نئی مسلم سیاسی فکر کا مکمل خاکہ اس کتاب میں نہیں ملتا۔ یہاں صرف چند مجمل اشارات ہیں۔ البتہ بعد کی جن تحریروں میں اس نقشۂ کار کا بیان ہوا ہے اسے ہم نے اس ایڈیشن میں شامل کر دیا ہے۔

غلبۂ اسلام کا موجودہ ایڈیشن اب ان مشمولات پر مشتمل ہے جس کے بغیر اس تحریک کے عملی خدوخال کو سمجھنا شاید آسان نہ ہو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسی موضوع پر مصنف کا ایک تازہ ترین ہمہ جہتی مکالمہ (Round Table) بھی اس مجموعے میں شامل ہے جس سے اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی کہ فی زمانہ غلبۂ اسلام کا عالمی منصوبہ کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ اس مکالمے میں بعض ایسے قیمتی نکات آگئے ہیں جو ہمیں بدلتی دنیا میں دعوت کے ایک بالکل ہی نئے طریقۂ کار سے آشنا کرتے ہیں اور جس میں اہل فکر مضطرب مسلمانوں کے لئے غور و فکر کا خاصا سامان ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں مضامین، انٹرویو اور گفتگو کا انتخاب میرا اپنا ہے۔ کتاب کی ترتیب میں عمداً اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض ذہنوں میں غلبۂ اسلام کی اصطلاح سے مسلم قوم کی حکمرانی کا جو غلط تصور پیدا ہوتا ہے اس کا ازالہ ہو اور خالص اسلامی قالب ایک بار پھر ہماری نگاہوں میں مجسم

ہو سکے۔ جو لوگ غلبۂ اسلام کے لئے دلی فکر مندی کے ساتھ ان مضامین کا مطالعہ کریں گے ان کے لئے موضوع کے مختلف گوشوں کو سمجھنے میں یہ مجموعہ اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

کوثر فاطمہ، نئی دہلی

جنوری ۲۰۰۳

١

غلبۂ اسلام

یعنی ہندوستان میں احیائے اسلام کا منشور

پیش لفظ

(طبع اول)

پچھلے دنوں ایک عرب عالم سے دورانِ گفتگو جب میں نے انہیں بین الاقوامی تناظر میں اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی طرف توجہ دلائی' اپنی اور ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا' اس بارے میں عالمِ اسلام کے مجوزہ رول کے لیے اپنی نیک خواہشوں پر اصرار کیا اور دنیا میں اسلام کو عملاً برپا کرنے کے لئے اپنی گردن کے حقیر نذرانے کی پیش کش کی تو عالم موصوف آبدیدہ ہوگئے۔ انہوں نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا' عزم واستقامت کے لیے ڈھیر ساری دعائیں مانگیں' بڑی قدر و منزلت اور محبت و شفقت سے پیش آئے۔ رخصت کرتے ہوئے اس بات کی توقع ظاہر کی کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اسلام کی سربلندی کا کام لے گا۔ البتہ انہوں نے مجھے کچھ زیادہ پرجوش قرار دیا اور اس آیت کی طرف توجہ دلائی لاَ یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفساً اِلاَّ وُسْعَهَا......

چند ہی ماہ بعد جب عرفات کے میدان میں اللہ کے حضور باریابی کا اعزاز حاصل ہوا اور وہ وقت بھی آ ہی گیا جو بندے کے لیے خدا سے سب کچھ مانگ لینے کا ہوتا ہے تو نہ جانے کیوں میرا دل بار بار غلبہ اسلام کی طرف منتقل ہو ہو گیا۔ ابھی جبل رحمت کے سائے میں بار الٰہا کے حضور اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے سوال پر اصرار جاری ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں' انسانوں کا ایک غول جن کے چہروں پر نور برس رہا ہے' جن کی ایک ایک ادا سے شانِ بندگی نمایاں ہے' **اللّٰهم انصر من نصر دین محمد** کے رقت آمیز کلمات بلند کرتا ہوا میرے قریب سے گزر جاتا ہے۔ انسانوں کے

اس وسیع سمندر میں بھی اپنی شانِ بندگی کی وجہ سے ممتاز و منفرد یہ ملکوتی گروہ قریب کی چوٹی پر رک جاتا ہے' دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے ہیں' ٹپکتی آنکھوں اور زخمی دلوں کی گریہ وزاری سے خفت ہوتی ہے' ہائے! اس مبارک ساعت میں بھی مجھ گنہگار کے آنسو کیوں خشک ہوئے جاتے ہیں؟ اے اللہ! محمدؐ کے دین کی مدد فرما' کے ساتھ اسلامی افغانستان اور مجاہدین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور انسانوں کا یہ گروہ بے اختیار زار و قطار پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتا ہے' قدرے بھرائی ہوئی گلوگیر آواز میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا عزم ہوتا ہے' استقامت اور نصرت کی طلب جاری ہے' گرد و پیش کا ہر شخص اس عمل میں شریک ہے' آنسوؤں کا بندھ ٹوٹ چکا ہے۔ اے اللہ! محمدؐ کے دین کو غالب فرما' شیطان کی ہمالیائی قوتوں سے مقابلے میں مٹھی بھر مجاہدین کی مدد فرما۔

یہ دو تصویریں دراصل دو تفسیریں ہیں اس آیت مبارکہ کی جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ پہلی تصویر یا پہلی تفسیر ٹھنڈے ٹھنڈے زندگی جینے کا فن سکھاتی ہے' فرار کی ترکیب یہاں واضح ہے۔ یہ مقبول عام رویہ ہے دنیائے اسلام کی تحریکوں' اداروں اور انجمنوں کا۔ اسلام کی خدمت بھی ہوئی اور باطل کے غیض و غضب سے بھی محفوظ رہے۔ دل کی تسلی کا سامان یہاں وافر مقدار میں موجود ہے کہ زندگی بہر طور اسلامی عمل میں مصروف گزرتی ہے۔ دوسرا رویہ خالصتاً انقلابی ہے۔ مقابلہ خواہ کتنی ہی بڑی قوت سے کیوں نہ ہو' حق کی حمایت کے لیے ساری دنیا کی مخالفت ہی کیوں نہ مول لینی پڑے' اپنے اندر خواہ قوت کی کتنی ہی کمی کیوں نہ ہو' حق کی حمایت میں چپ بیٹھ جانے کے بجائے آخری قطرے تک لڑتے رہیں گے' اپنی بچی کھچی قوتوں کو جمع کرتے ہوئے بار بار ایک نئے عزم سے دشمن پر حملے کرتے رہیں گے یہاں تک کہ خود اللہ کو کہنا پڑے: "اچھا تو اے محمدؐ! کیا تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو' اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔" (کہف)

میرے نزدیک یہ دوسری تشریح و تعبیر اسلام کے انقلابی پیغام اور اس کے انقلابی طریقۂ کار سے زیادہ ہم آہنگ ہے اور اسی طریقۂ عمل میں یہ قوت ہے کہ مستحکم اور منظم باطل کو اکھاڑ پھینکے۔ مستقبل میں غلبۂ اسلام کی مہم اس انقلابی رویے کے حاملین کے ذریعہ ہی کامیابی کے مراحل تک پہنچے گی۔ اس کے برعکس پہلا رویہ دراصل تسکین نفس اور فریب نفس کی ہی نو دریافت شدہ ایک "اسلامی شکل" ہے۔

بے شمار اسلامی اداروں، انجمنوں اور تنظیموں کی موجودگی کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام کی تحریک کسی قابل ذکر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہی ہے؟ اس اہم سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ عہد جدید کے بریف کیس داعیوں میں اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے بے چینی، غلبۂ اسلام کے لیے انتہائی درجے کی تڑپ اور اللہ کی راہ میں مر مٹنے کی تمنا کا بڑی حد تک فقدان ہے۔ اور جب تک انسانوں کے ایک قابل ذکر گروہ میں فکر و عمل کی اس درجہ تبدیلی نہیں ہوتی اور جب تک اسلام کے انقلابی رویے کے حاملین کا ایک گروہ پیدا نہیں ہوتا ذلت کی زندگی سے مسلمانوں کی نجات ناممکن ہے، اسلام کے غلبہ کا خیال عبث ہے۔ اس کتاب کا مقصد اسی تڑپ کو عام کرنا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہم سبھوں کو اس مبارک عمل میں شرکت کی توفیق دے، اس راہ میں استقامت عطا فرمائے اور اپنی بہترین نصرت سے نوازے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم.

راشد شاز

ابتدائیہ

ہندوستان کا ہر مسلمان خواہ اس کی ایمانی کیفیت کیسی ہی گئی گزری کیوں نہ ہو اسلام کے غلبہ کا کم از کم آرزومند ضرور ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مقدس خواہش کے پیچھے اس کی اپنی پریشانیاں ہیں جو ملک کے موجودہ غیر اسلامی نظام نے اس کے لیے پیدا کر دی ہیں۔ گویا غلبۂ اسلام کی آرزوان کی خود غرضی سے غذا حاصل کرتی اور جذبۂ افتخارِ قومی سے نشو ونما پاتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ ہی اپنے دنیاوی وقار کی بات سوچتے ہیں۔ لیکن یہ اندیشے اس لیے باطل ہیں کہ مسلمانوں کے ان تمام طبقوں نے جو دنیا کے حصول کے لیے کسی راستے کی تلاش میں تھے' دوسرے کامیاب ذرائع حاصل کر لیے ہیں۔ لہٰذا ان حضرات کے نزدیک غلبۂ اسلام دراصل ایک غیر یقینی اور ناممکن العمل خیال ہے۔ حصول دنیا کی دوڑ دھوپ میں یہ لوگ ایک ایسے مقام پر جا پہنچے ہیں جہاں پیغمبرانہ مشن کی کوئی علامت ان کے ہاں محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ مسلم سماج سے بھی ان کا رشتہ بہت حد تک منقطع ہو چکا ہے۔

اب رہے وہ لوگ جو اس کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں بھی غلبہ اسلام کی باتیں سوچتے ہیں' اس تصور سے ان کی زندگی تحریک حاصل کرتی ہے جن کے سینوں میں احیائے اسلام کی چنگاری موجود ہے' جو آج بھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی باتیں کرتے نہیں تھکتے اور آج بھی جن کے ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں اسلام اور مسلمانوں کے وقار کی بازیابی کے لیے اٹھتے ہیں تو بلاشبہ یہ وہ لوگ ہیں جو نہایت مبارک ہیں' ملت اسلامیہ کا متاع گراں بہا ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن سے امید بندھتی ہے کہ ملت اسلامیہ ہند آج بھی ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے حالات کا رخ موڑ سکتی ہے۔

تحریک غلبۂ اسلام

موجودہ ہندوستان میں اسلام اور غلبۂ اسلام کے سلسلے میں مختلف گروہ میدانِ عمل میں ہیں جنہیں ہم کام کی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ پہلا گروہ نظریاتی حد تک ''احیائے اسلام'' ''تجدید واحیائے دین'' ''اقامت دین'' اور ''حکومتِ الٰہیہ'' جیسی اصطلاحات کا چمپئن ہے۔ اس گروہ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے خلافت کے سقوط کے بعد اسلام کے اس اہم علامتی ادارے کی اہمیت کا احساس مسلم ذہن پر برقرار رکھا اور اس کے احیاء کے لئے کم از کم نظریاتی سطح پر فضا ہموار کی۔ اس اندیشے سے جو مغرب کے زیر اثر دیگر مذاہب کی طرح اسلام کو بھی ''ذاتی عقائد'' کے ایک مذہب سمجھنے کے سلسلے میں پیدا ہو گیا تھا' بڑی خوش اسلوبی سے بچالیا۔ اسلام کی انقلابی فکر کی ہمارے زمانے تک منتقلی میں ان بزرگوں نے ایک اہم کڑی کا کام انجام دیا۔ البتہ بلند بانگ دعووں کے درمیان ایک عظیم انقلابی تحریک کے فقدان اور نظریے کو عمل کا لباس عطا کرنے کے لیے ایک انقلابی منشور کی غیر موجودگی سے ایک نقصان یہ ہوا کہ ہمارے زمانے میں اسلامی انقلاب بڑی حد تک ایک جامد نظریہ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ نتیجتاً ٹھوس فکری اساس کے باوجود اس کے انقلابی اور عملی پہلو پس پشت چلے گئے۔ ایک طویل سفر کے بعد اب اس گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف یہ کہ غلبہ اسلام ایک نظریے کی حیثیت سے محفوظ ہے، اسی تشریح و تعبیر کے ساتھ جو نصف صدی قبل کے سیاسی ماحول میں کی گئی تھی۔ اس گروہ کی پالیسی' پروگرام اور طریقہ کار کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس بات کے اعلان کے لیے کافی ہے کہ یہ کسی ایسے انقلابی گروہ کا منشور نہیں ہوسکتا جس کے پیش نظر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام ہو۔

دوسرا گروہ جسے بڑی حد تک پہلے گروہ کا پروردہ کہا جاسکتا ہے اور جس کی ایک مخصوص تعداد پہلے گروہ کے اندر بھی موجود ہے' نظریے کو عمل کا لباس دینے کا خواہاں ضرور ہے البتہ عملی مہم کی دشواریوں کا ادراک یہاں بھی موہوم ہے۔ چوں کہ اس گروہ کی تربیت اور فکری اٹھان بھی بڑی حد تک پہلے گروہ کی

مرہون منت ہے جہاں خوش کن بلند آہنگ نعروں کو عملی شکل عطا کرنے کی کوئی واقعی ترکیب نہ تھی اس لیے ایک انقلابی منشور کے ادراک سے یہ گروہ بھی قاصر رہا۔ چوں کہ دوسرا گروہ غلبۂ اسلام کی عملی تعبیر کا بھی خواہاں تھا اور کبھی کبھی طے شدہ زاویوں سے ہٹ کر اپنے ذاتی زاویہ نگاہ کو بھی اہمیت دے دیتا تھا اس لیے اس میں پہلے گروہ کی بہ نسبت زیادہ بے چینی محسوس کی گئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جماعتی نظم کے غیر معمولی دباؤ کے زیر اثر ان کے زاویوں کی ہیئت اتنی مسخ ہوگئی کہ ایک ہی زاویہ میں کئی کئی زاویے وجود میں آگئے اور ان بے چاروں کو کنفیوژن کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس خلط مبحث اور پراگندگی افکار کے باعث کچھ افراد گروہی حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے اور ہر شخص نے اپنے اپنے وجدان کی روشنی میں انقلابِ اسلامی کو نئی سمت میں لے چلنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن عملاً جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ان حضرات کو چھوٹے چھوٹے اداروں میں وہی سکون میسر آگیا جس کا اول الذکر گروہ نسبتاً بڑے جماعتی نظام میں رہ کر رسیا ہو چکا تھا۔

تیسرا گروہ جو بہ اعتبار تعداد موجودہ ہندوستان میں سب سے بڑا دینی دعوتی گروہ ہے۔ اس بات سے تعرض نہیں کرتا کہ غلبۂ اسلام' اسلامی تحریکوں کا منتہائے مقصود ہونا چاہیے یا نہیں۔ یہ حضرات غیر شعوری طور پر کوئی انقلابِ عظیم تو یقیناً لانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے واقعی سرگرم بھی دکھائی دیتے ہیں البتہ یہ انقلاب کب آئے گا؟ کیسے آئے گا؟ کس نوعیت کا ہوگا؟ اور اس کے مختلف مراحل کیا ہوں گے؟ ان سوالوں کے جوابات ان کے بہترین کارکنان کے پاس بھی نہیں ہیں۔ البتہ یہ نکتہ قابل تحسین ہے کہ اول الذکر گروہ کی طرح انہوں نے اسلام کو کسی کامیاب نظریے اور ہمہ گیر فلسفے کی حیثیت سے قبول نہیں کیا ہے بلکہ خالص رضائے الٰہی اور عقیدۂ آخرت کی بنیاد پر افراد کے قلوب کی تبدیلی کی کوشش کی ہے۔ یہ افراد کی تبدیلی کے ذریعے معاشرہ کی تبدیلی کا فطری طریقہ تو ضرور اپناتے ہیں لیکن دعوت اسلامی کے انقلابی پہلو سے صرف نظر کرنے اور ایک واضح پروگرام کے فقدان کی وجہ سے ایک ایسے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں جس کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس امر کا اعتراف نہ کرنا شاید بددیانتی ہو کہ خود اس گروہ کے اندر چند ایسے نفوس موجود ہیں جو موجودہ دعوت کو انقلابِ اسلامی کی مکمل دعوت مانتے ہیں اور نہ ہی اس مرحلے کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں بلکہ انقلابی عمل کو درستگی عقائد

کے بعد کا مرحلہ قرار دیتے ہیں اور موجودہ مرحلے کو اسلام کی ہمہ گیر انقلابی دعوت کا عبوری عمل قرار دیتے ہیں۔ بظاہر یہ خیال کتنا ہی خوش کن کیوں نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ نصف صدی سے چند نکات پر جس قدر زور دیا جاتا رہا ہے اس نے ایک نئی نسل کو' جس نے اس نظام میں تربیت پائی ہے' اسلام کو محض چند عقائد کا مجموعہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ صوفیانہ ماحول کے غیر معمولی غلبے کی وجہ سے انقلابی روح کلیتاً رخصت ہو چکی ہے۔ ان مخلصین کی سمجھ میں یہ بات جتنی جلد آجائے بہتر ہے کہ اس غیر انقلابی طریقۂ تربیت سے کل اگر وہ غلبۂ اسلام جیسا انقلابی کام لینا چاہتے ہیں تو یہ ایک خطرناک خوش خیالی ہے' اسباب و عمل کی دنیا میں ایسا ممکن نہیں۔

اوپر غلبۂ اسلام کے حوالے سے جن گروہوں کا ذکر آیا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلبۂ اسلام کی شدید خواہش کے باوجود ان کی موجودہ مساعی کامیاب اقدام کی ضمانت نہیں دیتیں۔ بلکہ یہ عین ممکن ہے اور ایسا ہوتا بھی رہا ہے کہ غیر مفید لائحہ عمل کی ناکامیابی ان گروہوں میں مایوسی کی شدید کیفیت پیدا کر دے اور ان گروہوں کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی اغیار کی نظر میں ان کے طریقۂ کار کی ناکامی کے بجائے عین اسلام اور تحریک اسلامی کی شکست قرار پائے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا' آخر الذکر دعوتی گروہ نے ایک عرصے کے لیے غلبۂ اسلام کی مہم میں انقلابی شرکت کا پروگرام مؤخر کر رکھا ہے۔ اول الذکر گروہ غلبۂ اسلام کے ترانے اس ذوق و شوق اور جذب و مستی سے گاتا رہا ہے کہ اب اسے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ سب عملی باتیں بھی ہو سکتی ہیں' لہٰذا اسے بھی غلبۂ اسلام کی عملی مہم سے دور ہی سمجھنا چاہیے۔ اب رہا ثانی الذکر گروہ تو اس کی تسکین نفس کا واقعہ بھی ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

ان گروہوں کے علاوہ اب بھی ہندوستان میں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے مسلمانوں کی موجود ہے جو اپنے دلوں میں غلبۂ اسلام کی شمعیں جلائے کسی بطل جلیل کے انتظار میں بیٹھے ہیں' ان کی نگاہیں کسی مردِ راہ داں کی منتظر ہیں جو اپنی گہری بصیرت اور ژرف نگاہی سے اسلام اور مسلمانوں کو عظمت رفتہ کی بازیابی کی راہ دکھائے گا۔ جذباتی اور عملی اعتبار سے یہ گروہ انقلابی عمل کے لیے سب سے مفید اور مؤثر ہے کہ یہ اسلام کے حوالے سے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ لہٰذا جب بھی کوئی انقلابی عمل شروع ہوگا اور غلبۂ اسلام کی بات ہوگی' اس گروہ کے مؤثر رول کو نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔ ان

ہی میں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو ساری مصلحتوں سے بے پروا احیائے اسلام کی اپنی سی انفرادی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کاوشوں کے مؤثر نہ ہونے کا سبب یہاں بھی وہی ہے یعنی مرکزی نظم' جامع منصوبہ اور صورتِ حال کی نزاکت کے احساس کا فقدان۔ ان گمنام مخلصین کو' جن کا ہر عمل بلاشبہ اللہ کی رضا اور دین کے غلبہ کے لیے ہوتا ہے۔ ایک مرکزی رخ نہ ملنے کے باعث اس سطح کی کامیابی حاصل نہیں ہو پا رہی ہے جیسا کہ ہونی چاہیے۔ انہیں باطل کی صحیح قوت کا اندازہ ہے اور نہ ہی اس امر سے واقف ہیں کہ باطل کی کلائی کیسے مروڑی جا سکتی ہے؟

دعوتِ اسلامی کے تناظر میں موجودہ ہندوستان کی تصویر آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ حقیقت پسندانہ طریقۂ اظہار قنوطی احساسات پر مبنی معلوم ہو اور ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے شدتِ احساس کا نتیجہ قرار دیں' البتہ وہ لوگ جو نعروں کی دنیا میں نہیں رہتے اس تصویر کو یقیناً حقیقت پر محمول کریں گے خواہ ایسا سمجھنا کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ ایسا اس لیے بھی کہ کسی کام کی ابتداء حقائق کے ادراک کے بغیر مضر ہی نہیں انتہائی خطرناک ہے۔ خود احتسابی ایک مشکل عمل ہے بالخصوص ایک ایسی قوم کے لیے جو سیاسی اقتدار سے محرومی کی زندگی گزار رہی ہو' جس کو مختلف قسم کے اندیشے درپیش ہوں اور گوناگوں مسائل نے جس کا جینا دوبھر کر دیا ہو۔ ایسی قوم جو کسی وجہ سے سیاسی عمل کے دوران اپنا سب کچھ کھو ڈالتی ہے' شدتِ مصائب کی وجہ سے رومان میں زندگی تلاش کرتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اس کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے' اسے اپنا دشمن گردانتی ہے۔ رہبر اور رہزن کی تمیز جاتی رہتی ہے' اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک انقلابِ اسلامی کی خود ساختہ اور خوش کن قصے کہانیاں زیادہ معتبر ہوں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ آپ کے کہے سنے قصے کہانیوں کو معتبر ٹھہراؤں۔ کاش! آپ ہی کی تصویر صحیح ہوتی لیکن یہاں چوں کہ حقائق کو پس پشت ڈالنے سے مستقبل کی منصوبہ بندی کو شدید صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے فی الوقت گرانیٔ خاطر کے باوجود اس حقیقت کو قبول کر لیجیے اور آپ نے اگر یہ حقیقت واقعتاً قبول کر لی تو ذرا بتائیے غلبۂ اسلام کے لیے کوشش کہاں ہو رہی ہے؟ کون کر رہا ہے؟ کس طرح کر رہا ہے؟ ہم سے پوچھا جاتا ہے اللہ کا دین کب غالب ہوگا؟ اسلامی نظام کب اپنی برکتوں سے اس سرزمین کو نوازے گا؟ وہ دن کب آئے گا جب اہل

ہند اللہ کی بے شمار نعمتوں سے ہمکنار ہوں گے؟ ہر شخص کو اس کا حق مل سکے گا اور کوئی انسان کسی انسان پر ظلم نہ کر پائے گا؟ آخر کب آئے گا وہ دن؟ یہ سچ ہے کہ ہم نے اسلام کو غالب کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے لیکن اگر ہم نے عرفات کے میدان میں رسول اکرم ﷺ کے مشن کی ذمہ داری قبول کی ہے تو غلبۂ اسلام کے لیے اپنی حد تک سر توڑ کوشش کرنا اور اس راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن انقلابِ اسلامی کے لیے محض نعرے بلند کرنا اور عملی قربانیوں سے کنارہ کشی کرنا ایسا عمل ہے جو نہ صرف تحریک اسلامی کے قافلے کو مخالف سمت میں لے جاتا ہے بلکہ اللہ کے نزدیک ہماری مومنانہ حیثیت کو بھی بڑی حد تک مشکوک بنا دیتا ہے۔ ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا وہ نظریہ کیسا لولا لنگڑا ہے جو تمہاری نصف صدی کی کوششوں کے باوجود اب تک کھڑا نہیں ہو پایا ہے۔ کیا تم اسی غیر عملی نظریہ کے ذریعہ مسائل عالم کے حل کی بات کرتے ہو؟ کیا تم اسی نظریے کے بل بوتے پر معاشرہ اور مملکت کی تعبیر کا خواب دیکھتے ہو جو تمہاری انتھک کوششوں کے باوجود لوگوں کے قلوب تبدیل کرنے میں ناکام رہا ہے؟ ہمیں ان اعتراضات کا جواب دینے کی فرصت نہیں' ہم نعروں میں مگن انقلابِ اسلامی کی خیالی دنیا تعمیر کیے بیٹھے ہیں۔ کاش! ان معترضین سے کوئی یہ بتائے کہ یہ قصور نظریے کا نہیں ہمارا اپنا اپاہج پن ہے۔ کاش کہ ہم اب بھی اس حقیقت کا اعتراف کر سکیں کہ ہماری ساری تگ و دو انقلابِ اسلامی کے نعروں تک محدود رہی' ہم نعروں میں ایسے کھوئے اور انقلابِ اسلامی کا کورس اس ذوق و شوق سے گاتے رہے کہ عمل کا خیال ہی نہ آیا۔ ہمارے بلند آہنگ نعروں سے اغیار نے جو توقعات قائم کی تھیں ہماری بے عملی اسے پورا نہ کر سکی۔ نتیجتاً اسلام ایک غیر عملی نظریے کی شکل میں ان کے سامنے آیا۔ ان ساری غلط فہمیوں کے قصوروار ہم ہیں۔ اے خدا! ہمیں معاف فرما' ہمیں اپنی غلطیوں کو قبول کرنے اور ایک نئی مومنانہ زندگی شروع کرنے کے لیے نیا حوصلہ اور نیا ولولہ عطا فرما۔ اپنے دین کی راہ میں ہماری گردنوں کے حقیر نذرانے کو قبول فرما۔

اس حقیقت کے انکشاف اور اس اعتراف کے بعد کہ جدید ہندوستان میں غلبۂ اسلام کے لیے کوئی منظم جدوجہد نہیں ہو رہی ہے' ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ یہ ایک سانحہ تو ضرور ہے اور یقیناً بہت بڑا سانحہ ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی والے ملک میں چند نفوس پر مشتمل

دیوانوں کا ایک ایسا گروہ بھی نظر نہیں آتا جو غلبۂ اسلام کی مہم میں سب کچھ لٹا دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا ہو۔ یوں تو روایتی اور عصری علوم کے بڑے بڑے ماہرین موجود ہیں اور وہ بھی ہیں جن کی زبانیں دعوتِ اسلامی کے موضوع پر کلام کرتے نہیں تھکتیں اور جن کا قلم ان موضوعات پر دفتر کے دفتر لکھ ڈالتا ہے۔ لیکن انقلابِ اسلامی کی اس بھیڑ بھاڑ اور چہل پہل میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جسے صورتِ حال کی نزاکت کا حقیقی ادراک ہو' جسے انقلابِ اسلامی کے مختلف مدارج اور پیش آمدہ خطرات کا شعور ہو اور جسے انقلابی عمل کے نتیجے میں پیش آنے والے مطلوبہ انقلاب کے خط و خال کا مکمل وجدان ہو۔ ہماری بہترین کاوشوں کی حیثیت گھپ اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارنے سے زیادہ نہیں ہے۔ اب اگر یہ ممکن ہو کہ باطل کی قوت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ایک ایسا جامع پروگرام ترتیب دیا جائے جو براہِ راست نظامِ باطل کی جڑوں پر ضرب لگاتا ہو اور جس میں بنیادی طور سے مستحکم باطل کو ہلا پھینکنے کی قوت موجود ہو تو عجب نہیں کہ نہایت قلیل مدت میں ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی جغرافیے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو جائے۔ اسباب و علل کی دنیا میں ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ ایسی صورت میں امت مسلمہ ہند کو بہت سے ان خود ساختہ مسائل سے نجات مل جائے گی جن کے غیر فطری حل کے لیے وہ خالص ملی رہنماؤں کی قیادت میں گذشتہ چھ سات دہائیوں سے اپنی قوت ضائع کرتی رہی ہے۔ لیکن اتنی بڑی تبدیلی ٹھنڈے پیٹوں ہرگز نہ آئے گی۔ اس منصوبے کو اسی قوت کے ساتھ برتنا ہوگا کہ جس کا یہ مستحق ہے اور اس کاز کو ہر وہ نذرانہ پیش کرنا ہوگا جس کا یہ مختلف مراحل میں طالب ہے۔

منصوبے پر براہ راست گفتگو سے قبل ایک اندیشے کی وضاحت ضروری ہے تاکہ سارے ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر اس منصوبے پر غور و فکر کیا جا سکے۔ میرے پاس اکثر ایسے خطوط آتے رہتے ہیں جس میں اس اندیشے کا اظہار ہوتا ہے کہ جب بڑی بڑی تحریکیں اور بڑے بڑے صاحبِ عزم و عزیمت اس سرزمین میں غلبۂ اسلام کی مہم میں ناکام رہے اور جب بڑی پرزور اور پرشور آوازوں والی پُرسحر شخصیات ہندوستان میں مطلوبہ تبدیلی برپا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو بھلا تمہارے ہاتھوں یہ کام کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر ہم یہ کیسے یقین کر لیں کہ تمہاری اس دعوت کا وہی حشر نہ ہوگا جو اس سے پہلے تمہارے پرکھوں کے ساتھ ہو چکا ہے؟

ان سوالات اور اندیشوں میں مایوسی کی شدید کیفیت طاری ہے۔ یہ ایک فطری نفسیات ہے اس امت کی جو مسلسل کئی صدیوں سے تنزلی کے عمل سے گزر کر یہاں تک آپہنچی ہے۔ اسے اپنے وجود پر سائے کا گمان ہوتا ہے' ہر حقیقت سراب معلوم ہوتی ہے اور وہ ہر زندگی بخش عمل کو قتل کی سازش پر محمول کرتی ہے۔ آیئے ذرا ان اندیشوں کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ان صلحائے عظام اور بزرگانِ ملت کی کاوشیں کہاں تک کامیاب رہیں اور کہاں ناکامیوں سے دوچار ہوئیں اور یہ کہ ان ناکامیوں کے اسباب کیا تھے؟ اسباب کا صحیح تعین نہ صرف یہ کہ امت کو مایوسانہ کیفیت سے نجات دلانے کا باعث ہوگا بلکہ ایک جامع منصوبے کی تعمیر و ترتیب میں بھی اس سے بڑی مدد مل سکے گی۔ پھر جو منصوبہ وجود میں آئے گا اس میں کم از کم ان غلطیوں کے دوبارہ سرزد ہونے کا امکان بہت حد تک کم ہو جائے گا۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ میں جو منصوبہ پیش کرنے جا رہا ہوں وہ اپنی نوعیت اور کیفیت میں ان بزرگوں کے منصوبوں اور پروگرام سے اعلیٰ و ارفع ہے یا یہ کہ میں اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہوں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اپنے اس منصوبے کو برصغیر میں ان بزرگوں کے ساتھ دعوتی تجربوں کی توسیع مانتا ہوں اور اسے تاریخی تجربات کی روشنی میں زیادہ کار آمد' زیادہ فعال اور زیادہ مؤثر بنا کر پیش کرنے کو ہی اپنی سعادت جانتا ہوں۔

غلبۂ اسلام کی مساعی پر ایک نظر

ہندوستان میں احیائے اسلام کی پہلی باضابطہ کوشش' شیخ احمد سرہندی جو اپنے اصل نام سے کہیں زیادہ مجدد الف ثانی کے لقب سے جانے جاتے ہیں' کے ہاتھوں ہوئی۔ شیخ کے دور میں اکبر کے درباری دین سے اسلام کو جو خطرہ پیدا ہو چلا تھا اس کی سنگینی کا صحیح اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عہدِ اکبری کی شاہی سماجیات سے واقف ہیں اور جن کو ایک قدیم شاہی نظامِ مملکت میں بادشاہ کی اہمیت کا کچھ بھی اندازہ ہے۔ خود شیخ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے: کسی معاشرہ میں بادشاہ کی اہمیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ اگر دل کی حالت تسلی بخش نہیں ہے تو اس کا اثر لامحالہ جسم پر

پڑتا ہے' اسی طرح بادشاہ کی غیر تسلی بخش حالت معاشرے کو متاثر ہونے سے نہیں بچاسکتی۔ شیخ نے اس خطرے کو محسوس کیا اور اس کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ آپ کی انتہائی کوششوں سے اتنا تو ضرور ہوا کہ عوام بڑی حد تک اس گمراہی سے بچ گئے' حکومت کے اداروں میں آپ کے ہمدردوں اور ارادت مندوں کا ایک حلقہ پیدا ہوگیا اور اسلام کو اکبر کے عہد میں جو دربار نکالا ملا تھا اس کی بعد کے عہد میں کسی حد تک تلافی بھی ہوگئی۔ شیخ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو ہند ایرانی اثرات سے پاک کیا' اللہ کے آخری پیغام کی صورت مسخ ہونے سے بچالی اور بعد کی نسلوں تک روایتی اسلام منتقل کرنے کی کڑی بن گئے۔ اس عہد کے مسائل' اندیشے اور خطرات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اس عظیم الشان کامیابی کے باوجود' یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ شیخ کی تحریک معاشرے کا رشتہ باطل سے یک سر کاٹ کر حق سے نہ جوڑ سکی۔ زندگی کا نظام جو عرصے سے اسلام سے انحراف کی راہ پر چل پڑا تھا' اسے پھر سے خالص الٰہی اصولوں پر منظم نہ کیا جاسکا۔ اسلام کو ملوکیت کے درباری خوشہ چیں کی جو حیثیت پہلے حاصل تھی وہی بعد تک قائم رہی۔ سیاسی سطح پر اس تحریک نے صرف اتنا کیا کہ اکبر کے عہد میں اسلام کا سرکار دربار سے جو رشتہ ٹوٹ گیا تھا وہ بعد کے عہد میں پھر سے قائم ہوگیا۔ چوں کہ یہ تبدیلی ہمہ گیر نہ تھی' اس نے زندگی کے چند مخصوص گوشوں کو ہی ہدف بنایا تھا اس لیے بعد کے عہد میں اس کے وہ اثرات محسوس نہ کیے جاسکے جو کہ عام طور پر کسی ایسی تجدیدی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ شیخ کی تحریک کا اس کے مخصوص سیاسی اور معاشرتی تناظر میں مطالعہ چند اہم نکات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ شیخ کی ساری تنقیدی اور تجدیدی کاوشوں کا محور عقائد اور الٰہیات رہے' ان کی درستگی اور تجدید کے بعد اسلام کے اس چشمۂ صافی کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے سیاسی اور سماجی ادارے قائم نہ کیے جاسکے اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ثانیاً کارکنان کی تربیت غیر حرکی اور صوفیانہ قالب میں کی گئی' ایسی تربیت بادشاہِ وقت کے سامنے حق گوئی کی جرأت تو پیدا کرسکتی ہے اور اسے ابوبکرؓ و عمرؓ کے سے نظام کے قیام کی دعوت بھی دے سکتی ہے لیکن خود سالک میں ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسا statesman' مدبر اور حکمراں بننے کی صلاحیت پیدا نہیں کرسکتی۔ ثالثاً شاہی نظام جس کے غیر اسلامی ہونے

کا خیال مسلمانوں کے ذہن سے محو ہو گیا تھا اور مسلم حکمراں کی موجودگی جو غیر شعوری طور پر خلافت کی متبادل تسلیم کر لی گئی تھی' ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ خود شیخ کو اس بات کا خیال کم ہی آیا کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ منہاج النبوۃ پر خلافت قائم کرنے کی کوشش کریں۔
رابعاً ملک کی سب سے بڑی اکثریت ہندوؤں کی طرف اس تحریک کا رویہ خیر خواہانہ کے بجائے معاندانہ رہا۔ اکبر کے عہد میں ہندوؤں کے ایک خاص طبقے کو عروج حاصل ہوا تھا لیکن ردعمل میں اس تحریک نے بلا تخصیص سارے ہندوؤں کو اپنا دشمن قرار دے دیا' کھلے عام ان کی ذلت و رسوائی اور گردن زدنی کو عین اسلامی شعار بتایا گیا اور اس کی تبلیغ کی گئی۔ اس رویے سے عملاً ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلموں میں اکبر کے خود ساختہ دین کے لیے دلچسپی میں اضافہ ہوا اور شیخ کی حقیقی دعوتِ اسلامی کے لیے ان کے دل کے دروازے بند ہوتے چلے گئے۔ اس طرح یہ تحریک صرف اسلام کی حفاظت کی تحریک بن کر رہ گئی' انقلابی اور اقدامی عمل کی تحریک نہ بن سکی۔

شیخ احمد سرہندی کے عہد میں مسلم حکمراں کی موجودگی سے اسلام کی اقامت کا جو طلسم قائم تھا وہ شاہ ولی اللہ کے عہد تک بہت حد تک ٹوٹ چکا تھا۔ شاہ صاحب کو اس امر کا بخوبی احساس ہو چلا تھا کہ اب ہندوستان میں مسلم حکمرانی کا قصر بس گرنے ہی والا ہے' کوئی مصنوعی کوشش اس کھنڈر کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اب ضرورت تھی کہ نئے سرے سے اسلام کے علمی اور تہذیبی مآخذ پر اس ژرف بینی سے کام کیا جائے جو آنے والے عہد میں نظامِ اسلامی کے قیام میں معاون ہو سکے گویا نئے زمانے کا ایک علمِ کلام مرتب کیا جائے۔ شاہ صاحب نے اس عظیم کام کے لئے خود کو مختص کر دیا' ان کی کاوشوں سے ایسا عظیم علمی سرمایہ تیار ہوا جو عرصۂ دراز تک دعوتِ اسلامی کے کارکنان کے لیے رہنمائی کا کام انجام دیتا رہا۔

شاہ صاحب کی علمی سرگرمیاں کئی لحاظ سے انقلابی اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک طرف تو آپ نے بنیادی مآخذ سے اسلام کی صحیح اور صاف ستھری تصویر عصری اسلوب میں پیش کی' بہت سے ایسے مسائل جن پر ان کے ہم عصر سختی سے جمے ہوئے تھے اور جن فروعی امور سے سختی سے چمٹے رہنا ہی عین اسلام سمجھ لیا گیا تھا' ان پر تنقیدی اور عقلی روش کی بنا ڈالی۔ دوسری طرف متقدمین کے کاموں پر صحت مند تنقیدی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ خود شیخ سرہندی سے چند علمی امور پر نہ صرف اختلاف کی جرأت کی

بلکہ نہایت خود اعتمادی کے ساتھ ان کے نقطۂ نظر کی کمزوری بھی واضح کی۔ اس اسلامی طریقۂ فکر اور طرزِ تفہیم نے بعد کی صدیوں میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں ایک اہم رول انجام دیا۔

شاہ صاحب کا یہ علمی کارنامہ ہی اتنا وقیع اور حیرت انگیز ہے جو انھیں اپنے زمانے کا مجدد قرار دینے کے لیے کافی ہے' لیکن ہم چوں کہ یہاں مسئلے کے دوسرے پہلو یعنی اس کی عملی تعبیر سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے عملی اثر انگیزی کے پہلو پر بھی گفتگو کریں گے۔ ایک طرف شاہ صاحب کا علمی مشن ہے' علوم اسلامی کی عصری لب ولہجے میں تشریح و تعبیر کی عظیم الشان مہم ہے' قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے جو بہ لحاظ زمانہ بذاتِ خود ایک بڑا انقلابی قدم ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی یرقان زدہ مسلم تہذیب ہے۔ چوک سعد اللہ خاں اور چاندنی چوک پر انسانوں کے ریلے ہیں' برقعہ پوش مسلم خواتین اور نوجوان لڑکیوں کی بھیڑ بھاڑ ہے' بازاری جنسی حکیموں کا ریلا ہے' جنسی ترغیب کے نسخوں کا کھلے عام اشتہار ہے' ادویات بیچی اور خریدی جارہی ہیں' فحاشی اور بے حیائی کا بازار گرم ہے۔ یہ تو ہے عوام کا حال۔ امراء فیشن پرستی میں کہیں آگے ہیں۔ خوبصورت دلکش چہروں اور جاذب نظر خال وخط کا زیادہ سے زیادہ حصول ان کی زندگی کا واحد مشن ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا علمی کام اور معاشرے کی نفس پرستی دونوں الگ الگ سمتوں میں ایک دوسرے سے قطعی غیر متعلق جاری تھے۔ ایک کا دوسرے پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب کی تحریریں تصوف کی جن اصطلاحات میں کلام کرتی تھیں ان کا سمجھنا عام لوگوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہاں صرف انسان کی روحانی حس کو خطاب کیا جاتا تھا جس کے لیے صرف اس شخص میں کشش ہو سکتی تھی جس نے دنیا کی رنگ رلیوں سے کنارہ کشی کے بعد روحانی ارتقاء کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا طے کر لیا ہو۔ صوفی حلقوں اور صوفیانہ مزاج کے حاملین کے علاوہ عام لوگوں کو متوجہ کرنے کی صلاحیت اس طریقۂ تبلیغ میں قطعی نہ تھی۔

شاہ صاحب کی حیثیت محض ایک روشن خیال عالم دین کی نہ تھی' وہ ایک سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے سیاسی موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس آرزو کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگر ان کو موقع ملا ہوتا تو وہ اسلام کی سیاسی برتری کے لیے تلوار بھی اٹھاتے لیکن در حقیقت جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ عملی سیاست میں شاہ صاحب کی پہلی باضابطہ کوشش' جس میں نادر شاہ کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی گئی

تھی' ناکامیابی کا شکار ہوگئی۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کو اسلام کے سیاسی اداروں کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ تھا' وہ دینی اور دنیوی معاملات پر یکساں نظر رکھتے تھے لیکن یہ امر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا کہ محض بیرونی امداد کی بدولت کسی نظام کی بظاہر تبدیلی تو عمل میں آسکتی ہے۔ البتہ ایسی امداد میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ ایک صالح نظام کا قیام بھی عمل میں لاسکے۔ انہوں نے نادر شاہ کو حملے کی دعوت تو دے دی اور یہ امید بھی لگائے رہے کہ اس سے مسلمانوں کی مظلومی کا مداوا ہو جائے گا لیکن اس امر کی جانب ان کی توجہ نہ گئی کہ صالح حکومت کے لیے کارکنان کا کوئی ایسا منظم گروہ تشکیل دیں جو معاشرے میں اپنے اخلاقی اثر کے ساتھ ساتھ امورِ مملکت کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور جو اس بیرونی مدد سے فائدہ اٹھا کر ایک متبادل نظامِ عدل قائم کرنے کا اہل ہو کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو خود شاہ صاحب کی کوششوں سے جو علمی سرمایہ تیار ہوا تھا وہ مستقبل میں اس نظام کے لیے افراد اور لائحۂ عمل فراہم کرنے کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔

ایک اور چیز جو مجھ جیسے طالب علم کو شاہ صاحب کے کام میں بار بار کھٹکتی ہے وہ ان کا دعوے سے کسی کام کا آغاز کرنا ہے۔ فیوض الحرمین اور تفہیماتِ الٰہیہ میں آپ نے بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ آپ کی باتیں سراسر الٰہی ہدایات پر مبنی ہیں اور یہ کہ اللہ نے آپ کو اسلام کی خدمت کے لیے مجدد' وصی اور قطب کے بلند مراتب پر فائز کیا ہے۔ ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں اسلام کی سیاسی برتری کے قیام کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس لیے انہیں قائم الزماں تصور کرنا چاہئے۔ تفہیماتِ الٰہیہ میں تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ خدا نے ہدایت کے سارے زمینی دروازے بند کر دیے ہیں سوائے اس راستے کے جو میری اطاعت اور محبت کا ہے۔ اس کے علاوہ کئی خوابوں کے بیان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اللہ کی طرف سے تجدید واحیائے دین کے فریضے پر مامور کیے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے ان باتوں سے مقصود یہ رہا ہو کہ اپنی دعوت اور شخصیت پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کیا جاسکے تاکہ ایک فیصلہ کن تبدیلی کی صورت پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے۔ لیکن تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس طریقۂ کار سے فائدہ بہت کم اور نقصان بہت زیادہ ہوا' مذہب کے اجارہ داروں اور علمائے سو کو جو ہر زمانے میں الٰہی احکام کے غلبہ کا روڑا ہوتے ہیں محاذ آرائی کا خوب موقع ملا۔

شاہ صاحب کی تصانیف سے ان کی منظم اور منضبط فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ قولِ جمیل میں آپ نے نہایت تفصیل سے داعی کے اوصاف اور تبلیغ کے آداب پر اظہار خیال کیا ہے۔ عملی منصوبہ بندی کے لحاظ سے اٹھارہویں صدی کی دعوتی مہم میں بہت حد تک یہ ایک 'جدید' خیال ہے جس میں داعیانِ اسلام کو عصری تقاضوں کے مطابق مسلح کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اشاعتِ اسلام کی مہم میں یہ طرزِ فکر آج بھی ہمارے لیے افادیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ آج بھی عملی منصوبے کی تشکیل میں اس رویے سے رہنمائی مل سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ایک طرف تو اس علمی تحریک کے اثرات اور دوسری طرف محرومیٔ اقتدار کے پھیلتے سائے نے مسلمانوں میں شدید احساسِ زیاں پیدا کر دیا تھا۔ سید احمد کی قیادت میں مولانا اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی کے تعاون سے اٹھنے والی تحریک جہاد دراصل اسلام کی سیاسی برتری قائم کرنے کی طرف ایک عملی اور انقلابی کوشش تھی جس کے لیے فکری سرمایہ شاہ ولی اللہ کی تحریروں میں قبل ہی اکٹھا ہو چکا تھا۔ مقصد کی بلندی' افراد کی تربیت' قربانی اور جدوجہد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر میں یہ اس نوعیت کی پہلی اور واحد تحریک ہے۔ اس تحریک کے ادنیٰ کارکنوں نے جس نوعیت کی قربانی پیش کی اور نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جس دیوانگی اور عزیمت کا مظاہرہ کیا اس کی مثال صرف قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں میں ہی ملتی ہے۔ مادی اور حربی اعتبار سے انتہائی تہی دست ہونے کے باوجود یہ محض ان کا شوقِ شہادت تھا جو انہیں میدانِ جہاد میں کھینچ لایا تھا۔

نہ برگ و ساز کی پروا نہ انتظارِ رفیق
یہی رہا ہے ازل سے، قلندروں کا طریق
اگر خدا پہ بھروسہ ہے ہو یگانہ رواں
خدا سے بڑھ کے نہیں برگ و ساز کی توفیق

اس تحریک کے کارکنوں کو جتنا بھی خراجِ عقیدت پیش کیا جائے کم ہے' لیکن ان مختصر صفحات میں ہمارے پیشِ نظر نہ تو کسی کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے اور نہ ہی ہم کسی ایسے بیان سے روح کو وجد میں لانا چاہتے ہیں بلکہ ایک نئے منصوبے کی تشکیل میں ان بیش قیمت تجربات سے استنباط مقصود ہے اس لیے

ہم اس مسئلے پر غور کریں گے کہ اٹھارہویں صدی کے دیوالیہ مسلم معاشرے میں یہ حیرت انگیز تبدیلی آخر کیسے آگئی؟ انسانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد محض رضائے الٰہی کے لیے اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنے پر کیسے آمادہ ہوگئی؟ اسی معاشرے سے جو ہر طرح کی اخلاقی برائیوں میں ملوث تھا' اچانک ایسے لوگ کیسے نکل آئے جو دن کے مجاہد اور رات کے عابد ثابت ہوئے اور جنہوں نے بالآخر اپنے مقدس خون سے ہندوستان میں تحریک اسلامی کی ایک انقلابی تاریخ لکھ ڈالی۔ ہر زمانے میں غلبۂ اسلام کی تحریک کو ایسے سرفروشوں کی ضرورت رہی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ ہوں اور آج بھی غلبۂ اسلام کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے جب دیوانوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آسکے جن کے دل خشیت الٰہی اور عشق رسول سے سرشار ہوں' جن کی نظریں دنیاوی جاہ و منصب اور مال و متاع سے بے پروا صرف اور صرف آخرت کے انجام پر گڑی ہوں' جن کو شہادت سے انتہائی درجے کا عشق ہو اور جن کے لیے موت و حیات کے معانی میں کچھ فرق نہ رہ گیا ہو۔ جب تک دیوانوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں نہیں آتا غلبۂ اسلام کی تحریک ہمہ گیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

اس کے علاوہ اس سوال پر بھی غور کرنا ہے کہ اعلیٰ اور روحانی کمالات کے باوجود یہ عظیم الشان تحریک آخر کیوں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی؟ وہ تحریک جس کی قیادت سید احمد اور شاہ اسمٰعیل جیسے انتہائی بلند کردار کے حاملین کررہے تھے' اسلام کی سیاسی برتری کے قیام میں کیوں ناکام رہی؟ عام طور پر وہ حضرات جوان بزرگوں کی تحریک کو عقیدت واحترام کی آنکھوں سے دیکھنا ہی پسند کرتے ہیں' وہ اس کی ناکامیوں میں ہی کامیابی کا پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور طرح طرح کی تاویلوں سے ان ناکامیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں احترام و عقیدت کا یہ ایک غیر صحت مندانہ پہلو ہے۔ یہ حضرات سید صاحب کی تحریک کا ذکر جس عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں وہ ان پر ایک ایسی کیفیت تو طاری کردیتی ہے جہاں وہ بند آنکھوں سے عالم بے خبری اور عالم بے حسی میں سبحان اللہ اور اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرسکیں لیکن یہ وجد آفریں بیان انہیں کبھی اس بات پر آمادہ نہیں کرتا کہ سید صاحب نے جس مشن کے لئے اپنا سب کچھ لٹادیا اس راہ میں کوئی ادنیٰ سا قدم بھی اٹھا سکیں۔ میرے خیال میں اس حقیقت کے اعتراف سے کہ سید صاحب کی غلبۂ اسلام کی مہم کو مطلوبہ کامیابی نہ

مل سکی اور ان کی قائم کردہ خلافت علی منہاج النبوۃ کی عمارت چند دنوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکی، ان کے مرتبے پر کوئی حرف نہیں آتا کہ اس شخص کا مرتبہ مسلّم ہے جسے اللہ کی راہ میں شہادت کا حقدار ٹھہرایا گیا ہو' البتہ ناکامیوں کے اسباب کا صحیح تعین غلبۂ اسلام کی نئی مہم میں معاون و مددگار ہوسکتا ہے۔

بعض مصنفین جن کی روشن خیالی اور تنقیدی فہم کا شہرہ عام ہے وہ بھی تنقیدی تجزیوں کے دوران مؤرخین کے بجائے عقیدت مندوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان مفکرین کا اندازِ گفتگو یہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کی تحریک گرچہ بظاہر ناکام رہی لیکن اس کے یہ اثرات اور وہ اثرات مرتب ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ اس بات کے تو ہم بھی قائل ہیں کہ آج ہم ہندوستان کی اس سرزمین پر غلبۂ اسلام کی جو باتیں کر رہے ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک مجدد صاحب سے لے کر بیسویں صدی کی اسلامی تحریکوں کی کاوشوں کا رہینِ منت ہے' لیکن گفتگو کا یہ انداز جو حقیقت کو چھپاتا ہو جذبۂ عقیدت کو تو ضرور مہمیز کرتا ہے البتہ ایسے جوابات سے سائل کی تشفی نہیں ہوتی۔ ان ہی حضرات سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ خلافت راشدہ فقط تیس سالوں میں کیوں ختم ہوگئی تو اصل سوال کا جواب دینے کے بجائے پوری کی پوری کتاب اس مسئلہ پر لکھ ڈالتے ہیں کہ خلافت گرچہ تیس برسوں میں ختم ہوگئی لیکن دراصل بالکل ختم نہیں ہوگئی' اس کے اثرات صدیوں باقی رہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس خالص روحانی طریقۂ مدافعت کے دوران بار بار ٹیپ کے یہ مصرعے بھی بج اٹھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ اس قبیل کی بحثوں میں قاری کو مبہم عقیدت اور کنفیوژن کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا' حالاں کہ اسی سوال کا جواب اگر تنقیدی تاریخ کی روشنی میں دیا گیا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ سائل کی تشفی ہوجاتی بلکہ عہد جدید میں احیائے خلافت کا طریقۂ کار بھی اس پر واضح ہوجاتا۔

سوال کا یہ پہلو کہ سید صاحب کو افراد کی زندگی حیرت انگیز حد تک بدل ڈالنے میں کیسے کامیابی ہوئی' مؤرخین کی اس قدر توجہ سے محروم رہا ہے جس کا یہ مستحق تھا۔ جدید تحریک کے رہنماؤں نے بھی اس پر کم ہی غور کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ سوال اس لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ میں قلوب کی اس درجہ تبدیلی کو ہر دور میں تحریک غلبۂ اسلام کی کامیابی کے لیے اولین شرط مانتا ہوں اور ایسے گروہ کے بغیر جو صرف اور صرف اللہ کے لیے جینے اور مرنے کے لیے وجود میں آیا ہو' اس مہم کی تکمیل کو ناممکن سمجھتا ہوں۔

سید صاحب کی تحریک بنیادی طور پر جہاد کی تحریک تھی‘ گویا روزِ اوّل سے ہی اس میں شمولیت گردنوں کا نذرانہ مانگتی تھی۔ مخاطب کو شمولیت کے پہلے ہی مرحلے میں یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ اپنی آخری متاع خدا کی راہ میں قربان کرنے نکلا ہے۔ آج کے ”ہمدردوں“ ”رفیقوں“ اور ”اراکین“ کی بہ نسبت کلّی طور پر خود کو اللہ کے لیے پیش کر دینے والوں میں مطلوبہ تبدیلی کے امکانات یقیناً بہت زیادہ تھے۔ ثانیاً اس تحریک نے اسلام کو محض ایک کامیاب فلسفہ یا نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا اور نہ ہی ان بنیادوں پر نظامِ اسلام کے قیام کی بات کی بلکہ مخاطب کو فکرِ آخرت اور فلاحِ آخرت کی طرف توجہ دلائی گئی اور اس کا رشتہ جہاد‘ یعنی اللہ کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کے عمل سے جوڑ دیا گیا۔ جوں جوں آخرت کی فکر غالب آتی گئی اللہ کی راہ میں شہادت کا شوق تیز تر ہوتا گیا۔ ثالثاً اس تحریک نے اپنا مخاطب ساری امت کو قرار دیا۔ یہاں اصلی اور نقلی مسلمانوں کی کوئی درجہ بندی نہ تھی بلکہ ہر شخص کو جو مسلمان ہونے کا دعویدار تھا‘ نظامِ اسلامی کے قیام میں تعاون کی دعوت دی گئی اور اس راہ میں اس سے گردنوں کا نذرانہ طلب کر لیا گیا۔ اسی عوامی مخاطبت کا اثر تھا کہ سید احمد جیسا نسبتاً غیر معروف شخص مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے جب کلکتہ تک پہنچتا ہے تو عاشقان کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ بیعت کے لیے اسے اپنا عمامہ کھول کر پھیلانا پڑتا ہے اور ہر لمحہ انسانوں کا ایک ہجوم اس مقصد عظیم سے وابستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو جہاد کے لیے آمادہ نہیں کرپاتے‘ خود کو اس جہاد سے متعلق محسوس کرتے ہیں‘ ان کی دلی ہمدردیاں اس تحریک کے ساتھ ہوتی ہیں۔ رابعاً تحریک کی دعوت اور اس کے طریقۂ کار کی تفہیم و تبلیغ خالص عوامی لب و لہجے میں کی گئی۔ یہ ایسی زبان تھی جو ہر شخص‘ خواہ وہ دانشور ہو یا عام آدمی‘ سمجھ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک قلیل مدت میں مختلف طبقوں کی سعید روحیں سید صاحب کے گرد جمع ہوگئی تھیں۔ خامساً خود قائد کا کردار اتنا عظیم تھا‘ اس کی بے دریغ قربانیاں اور اس کی زندگی کے شب و روز ایسے تھے جن سے عام کارکن کے ولولۂ عشق کو تحریک ملتی رہتی تھی۔

اب آیئے سوال کے دوسرے جزء یعنی ناکامیوں کے اسباب پر غور کریں۔ بعض ناقدین اس تحریک کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ صوفیانہ رجحانات کو قرار دیتے ہیں۔ ان ناقدین کے خیال میں سید صاحب نے ان مریضوں کو وہی دوا دے دی جس سے پرہیز کی سخت ضرورت تھی اور جس سے کارکنان میں

"بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی ذہنیت پیدا ہوتی تھی۔ ہوسکتا ہے نصف صدی قبل لکھی جانے والی اس قسم کی تنقید میں مصنف کے سامنے تحریک جہاد کے سلسلے میں وہ سارا مواد نہ رہا ہو جو پچھلے پچاس سال کی تحقیق کے نتیجے میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کج فکری کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قبیل کے مصنفین سید صاحب کی انقلابی تحریک کو ایک الگ عمل سمجھنے اور اسے اسی حیثیت سے پرکھنے کے بجائے شاہ ولی اللہ کی تحریک کا تتمّہ گردانتے ہیں۔ اس لیے نادانستہ طور پر شاہ صاحب کی تحریکی لغزشوں کو بھی اس کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی تحریک کی حد تک تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عصری محاورے میں انقلابی پیغام کی منتقلی کے باوجود صوفیانہ رموز واشارات کا قالب اسے ایک انقلابی عمل عطا کرنے میں ناکام رہا۔ لیکن سید صاحب کی تحریک میں مجھے تصوف کی ایسی شدید کارفرمائی نظر نہیں آئی جسے اس تحریک کی ناکامی کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جاسکے۔ بالاکوٹ کی سرزمین شہادت اس بات کے اعلان کے لیے کافی ہے کہ لوگوں کو ناکارہ بنادینے اور خانقاہوں میں پناہ لینے والے تصوف سے یہاں دور دور کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس واضح حقیقت کے باوجود بھی اگر کوئی شخص اس تحریک کو ذیابیطس کا مریض سمجھتا ہے تو میرے نزدیک ایسا ایک مریض ہزار صحت مندوں سے بہتر ہے۔

تاریخی پس منظر میں اس تحریک کا تنقیدی مطالعہ ان امور کی وضاحت کرتا ہے۔ شمالی ہند میں پھلنے پھولنے والی یہ تحریک جس کی جڑیں ابھی بڑی حد تک اسی خطے تک محدود تھیں' اچانک ایک ایسی سرزمین میں منتقل کردی گئی جہاں ان ترقی یافتہ خیالات اور انقلابی باتوں کا کچھ زیادہ رواج نہ تھا۔ ابتدا سے ہی شمالی ہند کو جو سیاسی حیثیت حاصل رہی تھی اس کی وجہ سے یہ خطہ صوفیاء و مشائخ کی سرگرمیوں کا مرکز تھا' خود شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت کے لوگ بھی اسی خطے میں زیادہ تھے لیکن چوں کہ اس تحریک کو ایک سیاسی قلعے کی ضرورت تھی اس لیے سرحد کا تعین کیا گیا۔ ہجرت کے اس پورے عمل میں اس حقیقت کو نظرانداز کردیا گیا کہ جس خطے کو مرکز اسلامی کی حیثیت سے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے' وہ مدینۃ الاسلام بننے کا اہل نہ تھا اور نہ ہی وہاں اس کام کے لئے پہلے سے کوئی منظم کوشش کی گئی تھی۔ چند سرحدی احباب کے اصرار پر ہجرت کا فیصلہ کرلینے کے بجائے فطری طریقہ یہ تھا کہ وہاں بھی کم از کم شمالی ہند کی طرح فضا ہموار کرلی جاتی اور اس وقت تک انتظار کیا جاتا جب تک کہ سید صاحب

کے مشن پر مرمٹنے والوں کا ایک مؤثر حلقہ پیدا نہ ہو جاتا اور اہل سرحد کی نگہ ہائے شوق سید صاحب کے استقبال میں نہ بچھ جاتیں۔ چوں کہ ایسا کچھ بھی نہ ہوا اس لیے مقامی لوگوں میں جہاد کا جذبہ پیدا ہوا اور نہ ہی اس مقصد کے لیے مرمٹنے کی تڑپ پیدا ہوئی بلکہ الٹا تحریک اسلامی کی اس ذمہ داری کو جو ان کے سر لاد دی گئی تھی' بوجھ محسوس کرنے لگے اور بالآخر اسے اتار ہی پھینکا۔ ہجرت کے فیصلے میں ایک اور غلطی بنیادی نوعیت کی تھی۔ سید صاحب اور ان کے معاونین یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ سرحد کے لوگ چوں کہ سکھوں کے ستائے ہوئے ہیں' ان کے ظلم سے پریشان رہتے ہیں اس لیے وہ ایک ایسے نظامِ عدل کے قیام کی حمایت کریں گے' یہ خود ان کی اپنی ضرورت اور مجبوری کا ایک حصہ ہوگا' لیکن اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا گیا کہ اپنی مجبوریوں کے لیے لڑنے والوں پر ایک بے لوث کام کا بوجھ ڈالنا کچھ مناسب نہ ہوگا اور ایسا ہوا بھی۔ جب ان کی مجبوریاں ختم ہوتی نظر آئیں اور دنیاوی کیریر کو داؤ پر لگانے کا وقت آیا تو اس مشن کو مطلوبہ تعاون دینے سے مکر گئے۔ الٹا نقصان یہ ہوا کہ اس عظیم جمعیت مجاہدین کو بھی لے ڈوبے جو انتہائی بے لوث جذبات سے سرشار' صرف نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے ہجرت کر کے سرحد تک آئی تھی۔ تیسرا سبب جو بہت واضح ہے اور جس کا اندازہ یقیناً اس تحریک کے کارکنوں کو بھی رہا ہوگا وہ غلبۂ اسلام کے سلسلے میں حقیقی دشمن کے تعین کی غلطی سے متعلق ہے۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف اور خود شاہ اسمٰعیل کی کتابوں میں کثرت سے اس حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ نظامِ اسلامی کے قیام میں اصل روڑا انگریز تھے جو اپنی قوت و سیادت سے بڑی تیزی سے ہندوستان پر چھاتے جا رہے تھے۔ سید صاحب کے عہد میں ہی دلّی انگریزوں کی پنشن خوار ہو چکی تھی' مسلمانوں کے سیاسی زوال کی کسک ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔ غلبۂ اسلام کی مہم کا کوئی حقیقی دشمن تھا تو وہ انگریز تھا جو ایک بڑی قوت کا علامیہ تھا' جس کے اثرات کا سیلاب ہر سمت سے بڑھتا ہی چلا آتا تھا۔ جہاد کی تیاری انگریزوں سے مقابلے کے لیے ہونی چاہئے تھی اور انگریزوں کی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے اسی لحاظ سے تیاری کا اہتمام بھی ہونا چاہئے تھا۔ یہ سب ایک منصوبہ بندی چاہتا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو فوراً میدانِ جنگ میں کود پڑنے کی نوبت نہ آتی اور صالحین کا یہ گروہ ایک منصوبہ بند جدوجہد کے نتیجے میں اس سرزمین کو نظامِ اسلامی کا مقدس تحفہ دینے میں شاید کامیاب ہو جاتا۔ جہاد کے باب میں سکھوں سے لڑائی کی حیثیت

جملۂ معترضہ سے کچھ زیادہ نہ تھی' سید صاحب اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ فیصلہ کن لڑائی انگریزوں سے ہونی ہے اور اسی لیے مدینۃ الاسلام کی تلاش میں سرحد تک گئے بھی تھے۔ لیکن اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اتنی بڑی قوت سے مقابلے کے لیے ان کی تیاری بہت تھوڑی تھی۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کم ہی کی گئی کہ یہ تہذیب جو مانند طوفان بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس کی اساس کن بنیادوں پر ہے اور اس کی جڑوں پر ضرب کیسے لگائی جاسکتی ہے؟ وہ علوم و فنون کا کون سا سرمایہ ہے جس سے یہ مسلسل غذا حاصل کر رہی ہے اور یہ کہ جنگ کا میدان اب جس انداز سے سجایا جاتا ہے اس کی کاٹ کیسے پیش کی جاسکتی ہے؟ ان نازک اور اہم سوالات سے صرف نظری کی وجہ سے مخلصین کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ یہ بات ہم بھی مانتے ہیں کہ روزِ اوّل سے تحریک اسلامی کا مختصر گروہ دشمنوں کے بڑے گروہ پر فتحیاب ہوتا رہا ہے۔ یقیناً یہ انقلابی تحریکوں کا مزاج نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایسے وقت کے انتظار میں بیٹھی رہیں جب ہر اعتبار سے ان کا لشکر دشمن سے بہتر ہو جائے۔ اس کے برعکس یہاں بنیادی اہمیت نصرتِ خداوندی کو حاصل ہوتی ہے۔ مومن اسی یقین سے سرشار طاقت ور دشمن کے مقابلے میں کود پڑتا ہے' البتہ دشمن قوت اور اسلامی لشکر کی قوت کے تناسب کے سلسلے میں اس لطیف نکتے کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے جس کی بہترین مثال جنگ بدر میں اسلام اور اسلام مخالف قوتوں کا تناسب ہے۔ جنگ بدر میں لشکر اسلام کی کامیابی کی بہت سی دیگر وجوہات کے علاوہ دو اہم وجہیں تھیں۔ اولاً قریش کی مکی تہذیب کے مقابلے میں اسلام کی حیثیت ایک نئی انقلابی تہذیب کی تھی جس نے صرف دلوں کی دنیا ہی نہ بدلی تھی بلکہ معاشرے کو ایک ترقی یافتہ رویے سے آشنا کر دیا تھا۔ ثانیاً گرچہ آلاتِ حرب اور تعداد کے اعتبار سے دشمن ان سے کہیں بڑھ کر تھا لیکن وقت کی تکنالوجی کے استعمال کی سطح پر ان دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ آج بھی اللہ کی مدد اور اس کی امید پر غلبۂ اسلام کی مہم میں جان کھپانے والوں کو اس نکتے کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ اللہ والوں کی سنت ہرگز نہیں ہے کہ دشمن تو ہر طرح کے جدید آلات حرب سے لیس ہو' جدید قسم کے میزائیل' لڑاکا طیارے اور خطرناک بموں کے ساتھ میدان جنگ میں آگیا ہو اور ہم جوشِ ایمانی میں محض مچھر دانی کے ڈنڈوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔

سید احمد کی تحریک جہاد کا تذکرہ میں نے قدرے تفصیل سے اس لیے کیا کہ میں اسے ہندوستان

میں غلبۂ اسلام کے سلسلے میں سب سے موثر' طاقت ور اور انقلابی قدم تصور کرتا ہوں اور اس مہم کے تجربوں کو غلبۂ اسلام کی از سر نو مساعی کے لیے زیادہ کار آمد اور ہم آہنگ خیال کرتا ہوں۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اٹھنے والی بے شمار تحریکوں میں چند نام ایسے ضرور مل جاتے ہیں جنہوں نے ہجرت' خلافت اور مسلم ہوم لینڈ جیسی اصطلاحوں کا سہارا لیا' لیکن ان کے مقاصد اور طریقۂ کار کے تنقیدی مطالعہ سے یہ بات بہت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی دلچسپیاں محض نعروں اور اصطلاحات تک محدود تھیں۔ نہ تو ان حضرات کو نعروں کی گہری معنویت کا احساس تھا اور نہ ہی ان کے پاس خوش کن اصطلاحوں کو عملی شکل دینے کے لیے کوئی واقعی منصوبہ تھا۔ خلافت تحریک کلی طور پر رد عمل کی تحریک تھی جو انگریزی سامراج کو خلافتِ عثمانیہ کے انہدام سے روکنے کے لیے اٹھی تھی۔ شروع سے ہی اس کے پیش نظر اسلام کی سیاسی برتری کا قیام تھا اور نہ ہی یہ کسی منصوبہ بند جدوجہد کے ذریعہ منہاج النبوۃ پر خلافت کے قیام کا کوئی پروگرام۔ ساری دوڑ دھوپ کا منتہائے مقصود یہ تھا کہ خلافت کے نام سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے قائم رکھا جائے۔ اس امر کی طرف قطعی توجہ نہ گئی کہ آخر اس زوال آلودہ خلافت کو کون سی بیماری لگ گئی ہے؟ کیوں اسے روز بروز زوال آتا جارہا ہے اور یہ کہ عہد جدید میں اس کے احیاء کا کام کن بنیادوں پر ہو سکتا ہے؟ اس تحریک کی سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے بہترین کارکنان خلافت کے چراغ کو روشن رکھنے کے لئے ہر لحہ اس کی لو کو اوپر اٹھاتے رہے۔ پیامِ ربانی کا انقلابی تیل ڈالنے کی طرف ان کی توجہ بالکل ہی نہ گئی' ان غریبوں کو یہ احساس ہی نہ رہا کہ چراغ روشن رکھنے کی یہ مصنوعی کوشش اس کی بتی کو بھی جلا ڈالے گی' جس کے بعد اس کا جلانا اور بھی دشوار ہو جائے گا اور ایسا ہوا بھی۔ ان بزرگوں کے طریقۂ عمل کی سطحیت کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ سقوطِ خلافت کے بعد جب ہندوستان کی تحریک خلافت کے قدموں سے زمین ہی نکل گئی تھی' مولانا محمد علی نے یہ تجویز رکھی کہ مسلم امراء و سلاطین کا ایک نمائندہ اجتماع کر کے جمہوری طریقۂ انتخاب کی بنیاد پر' ان میں سے ہی کسی کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ اس طریقۂ فکر میں زخمی دل کا کرب تو یقیناً ہے' خلافت کے سقوط کی کسک اور اس سانحہ کی شدت بھی ہے مگر تلافئ غم کا یہ انداز سراسر غیر فطری اور غیر منطقی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کا بہی خواہ' کوئی بھولا بھالا غمگسار' اس

کی صحت یابی کے لیے علاج و معالجے کے بجائے اس کے چہرے کو رنگ و روغن کی مالش سے شاداب دیکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی مصنوعی کوشش مریض کو زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رکھ سکتی۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلافت کا نعرہ عثمانیہ ترکی کی حفاظت کے علاوہ خود ہندوستان میں ایک متوقع تبدیلی کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر اس تحریک کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علی برادران کو یہ بصیرت ضرور حاصل ہو گئی تھی کہ خلافت ایک مذہبی لڑائی کے لیے مسلمانوں کو متحد کرنے میں ایک پر زور اور مؤثر علامت کا رول ادا کر سکتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ کسی عوامی تحریک کو برپا کرنے کے لیے ایسی علامتوں کا سہارا لینا کارگر ہوتا ہے جس سے عوام و خواص سبھوں کے دلوں کے مضراب بج اٹھیں۔ لیکن اس عظیم قوت کو برپا کرنے کے بعد وہ اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے‘ اس بارے میں ان کے پاس کوئی واضح پلاننگ نہ تھی۔ نتیجہ جو کچھ ہوا وہ پوری امت مسلمہ ہند کی انتہائی شکست خوردگی اور افسردگی کی شکل میں سامنے آیا۔ احیائے خلافت کے لیے اٹھنے والی تحریک "عدم تعاون" جیسے غیر ضروری جھمیلوں میں پھنس کر رہ گئی۔ اور پھر یہ ہوا کہ تحریک خلافت کی عظیم الشان جدو جہد اور قربانیوں کی بنیاد پر انتہائی چالاکی اور چابک دستی سے ایم کے گاندھی نے سوراج کی اینٹ رکھ دی۔ جدید ہندوستان میں احیائے اسلام کی کوششوں میں اگر کوئی شخص غیر مسلموں کے تعاون پر یقین رکھتا ہو اور اسے اپنی روشن خیالی پر محمول کرنے کے فریب میں مبتلا ہو تو اسے ان تجربات کی روشنی میں اپنے رویے پر نظر ثانی کر لینی چاہئے۔ بھلا گاندھی اور سوامی شردھانند جیسے لوگوں کو خلافت سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ تجربات نے ثابت کیا کہ ان کی شرکت کا مقصد دراصل تحریک خلافت کی برپا کردہ زبردست عوامی قوت کو سوراج اور دھرم راج کے قیام کے لیے استعمال کرنا تھا۔ بالآخر اسی گاندھی کے بارے میں‘ جسے کبھی محمد علی نے جوشِ خطابت میں امام تک قرار دیا تھا‘ شوکت علی کو مولانا عبد الباری کے نام ایک خط میں اس خطرے سے آگاہ کرنا پڑا‘ مبادا کہیں ایسا نہ ہو کہ گاندھی مسلمانوں کی مذہبی قیادت بھی لے اڑے۔ آج بھی مسئلہ خواہ احیائے اسلام کی مہم میں شرکت کا ہو یا بابری مسجد جیسی مذہبی علامتوں کا سوال ہو‘ غیر مسلموں سے تعاون کے سلسلے میں ہمیں اپنے رویے کی سخت نگرانی کرنی ہوگی۔

تحریک خلافت کی سیاسی ناکامی اور مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کو "عدم تعاون" کی شکل مل جانے سے مسلمانوں کا حساس مذہبی طبقہ انتہائی پریشان تھا۔ غالباً اسی احتیاط کے پیش نظر' جب مولانا الیاس نے ۱۹۲۷ء میں اپنی دعوتی مہم کا آغاز کیا تو انھوں نے اپنے پروگرام سے سیاست کو یکسر خارج کر دیا۔ مولانا الیاس کو شاید اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ محض سیاسی نعروں اور خوش نما اصطلاحات کا سہارا لے کر کوئی بڑی تبدیلی عمل میں نہیں لائی جاسکتی اور جب تک اس درجے کی تیاری نہ ہو کہ امت مسلمہ اس تبدیلی کو سہارنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرلے اور اسے مطلوبہ انداز سے آگے بڑھانے کی اہل بھی ہو اس وقت تک محض تبدیلی کی کاوشوں سے قوت کے زیاں کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہ ہوگا اور عملاً جو کچھ ہوگا وہ صرف یہ کہ اقتدار کی باگیں ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔ اس سے نہ تو اسلام کا کچھ بھلا ہوگا اور نہ ہی مسلمانوں کا۔ مولانا الیاس کی تحریک ایمان بنیادی طور پر مسلمانوں میں اصلاح کی تحریک تھی البتہ مولانا الیاس کے خطوط میں ایسے اشارے ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے مراحل میں وہ اس تحریک کو زیادہ ہمہ گیر بنانے کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن اجل نے ہی کچھ اس کی مہلت نہ دی۔ بعد کی قیادت چوں کہ اس بصیرت کی حامل نہ تھی اس لیے تحریک کی بین الاقوامی وسعت کے باوجود اس کے طرز فکر اور طریقہ تبلیغ پر میواتی رنگ غالب رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا الیاس کو اپنے دعوتی مشن میں حیرت انگیز کامیابی ملی' جاہل میواتیوں کی مختصر جماعت نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی بلکہ قابل ذکر مسلم آبادی والا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں کندھوں پر بوریا بستر ڈالے تبلیغی مشن کا کوئی قافلہ آپ کو نہ مل جائے۔ اس اعتبار سے یہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ تھا۔ مولانا الیاس کو جس نوعیت کی کامیابی ملی اس کی بظاہر تین وجوہات بہت نمایاں ہیں۔ مخاطب کو فکر آخرت کی دعوت دی گئی اور اسلام کو اصلاحِ آخرت کے طریقۂ کار کے طور پر پیش کیا گیا۔ ثانیاً پوری دعوت کا لب و لہجہ خالصتاً عوامی تھا۔ ثالثاً پہلی ہی گفتگو میں مخاطب کے سامنے ایک عملی منصوبہ میں شرکت کا پروگرام رکھ دیا جاتا تھا اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جاتی کہ وہ اپنے اوقات میں سے خواہ کتنا ہی مختصر لمحہ کیوں نہ ہو' نکالنے پر ضرور آمادہ ہو جائے۔

اس طریقۂ کار سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ دوسرے اجتماعات کی طرح تبلیغی جماعت کے

اجتماعات نشستند، گفتند، برخواستند تک محدود نہ رہے۔ پہلی گفتگو میں مخاطب کو شرکت کا عملی طریقہ بھی ہاتھ آگیا اور جس شخص نے پہلی دعوت پر چند گھنٹے لگا دیئے اُس کے لیے بعد کے مراحل میں چند ایام اور چلّے لگانا کچھ زیادہ مشکل نہ رہا۔ یہاں سیاسی مسائل سے تعرض کیا جاتا اور نہ ہی ان مسائل پر اظہار خیال کو دین کی محنت تصور کیا جاتا تھا' اس لیے مختلف سیاسی خیالات کے لوگوں کو محض تعمیر آخرت کے لیے یکجا ہونے کا موقع ملا۔ اسلام میں دین اور سیاست ہمیشہ سے ایک دوسرے سے خلط ملط رہے ہیں' دین اور دنیا کی علیحدگی کا تصور کسی بھی زمانے میں نہیں رہا ہے۔ خلیفہ کی ذات مذہبی اور سیاسی دونوں قیادت کے اجتماع کی علامت ہوتی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ مولانا الیاس نے سیاست کو دینی دعوت سے یکسر جدا کر دیا۔ ابتدائی عہد میں تو یقیناً اس سے بے پناہ فوائد حاصل ہوئے لیکن مولانا الیاس کی موت کے بعد جب سیاسی اور سماجی حالات بہت حد تک تبدیل ہوتے گئے' قدیم پالیسیوں پر سختی سے جمے رہنے کے عمل سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ایک قابل ذکر متحرک آبادی غلبۂ اسلام کا شعور کھو بیٹھی۔ آج ان حضرات کے لیے بھی غلبۂ اسلام کا تصور اتنا ہی عجیب ہے جتنا دینی شعور سے بے بہرہ کسی عام مسلمان کے لیے یا مغربی تہذیب کے سحر زدہ کسی بیمار ذہن کے لیے۔ مولانا الیاس نے جب سیاسی عمل میں شرکت سے روکنا مناسب سمجھا تھا' اس وقت ہندوستان کے حالات مختلف تھے اور یہ لائحہ عمل کسی حد تک سمجھ میں بھی آتا تھا' لیکن آج جب ملک کا سیاسی اور مذہبی جغرافیہ خاصا تبدیل ہو چکا ہے' عدم شرکت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تبلیغی جماعت میں آج بھی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو دین کی محنت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا عزم رکھتے ہیں' جو اپنے گھر بار بیچ کر دین کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان بے چاروں کو نہ تو اس بات کا احساس ہے کہ باطل کتنا مستحکم اور مسلح ہے اور نہ ہی اس امر سے واقف ہیں کہ اسے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کہاں اور کیسے ضرب لگانی ہو گی۔ اپنے اس غیر انقلابی رویے کی وجہ سے یہ ایک اصلاحی جماعت سے آگے بڑھ کر انقلابی گروہ کا روپ نہ اختیار کر سکی اور نہ ہی غیر انقلابی صوفیانہ بنیادوں کی وجہ سے مستقبل میں ہی اس سے کسی انقلابی عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں ایک اور تحریک بڑے شدومد کے ساتھ اٹھی لیکن افسوس

کہ یہ دریا جتنی تیزی سے چڑھا تھا اتنی ہی تیزی سے اتر گیا۔ زبان و بیان اور گفتار و افکار کے اعتبار سے بیسویں صدی میں اس سے زیادہ پر اثر اور سحر آفریں کوئی دوسرا گروہ مشکل ہی سے ملے گا۔ اسلام کی بہت حد تک مکمل دعوت دینے اور مکمل اسلام کو انقلابی عمل کا منشور بنانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ دلکش نعروں اور خوبصورت اصطلاحوں کی ایجاد اور اس کی تشہیر بھی اسی کی دین ہے۔ جو لوگ جدید دنیا میں نعروں کی اہمیت سے واقف ہیں وہ یقیناً اس کام کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کریں گے۔ ''حکومت الٰہیہ''، ''اقامت دین''، ''احیائے اسلام'' جیسی اصطلاحوں نے مسلمانوں کی بے راہ رَو سیاسی سرگرمیوں کو ایک تعمیری رخ دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کچھ تو سیاسی ہڑ بونگ کی وجہ سے اس دعوت کو وہ اہمیت نہ مل سکی جس کی یہ مستحق تھی اور کچھ حالات نے ایسا پلٹا کھایا اور ملک کی تقسیم سے ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ انقلابِ اسلامی کا یہ محل اچانک زمین پر آگرا۔ منقسم ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کو ایک بالکل ہی مختلف طریقۂ کار کی ضرورت تھی کہ جس سیاسی صورتِ حال میں سابقہ منصوبہ وجود میں آیا تھا وہ اب ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ پہلے سے زیادہ سخت اور مخالف ماحول نے لے لی تھی۔ لیکن جس زورِ خطابت، خوبصورت اور دلنشیں تحریروں اور بلند آہنگ نعروں پر اس کی بنا رکھی گئی تھی اس میں یہ قوت نہیں تھی کہ کسی واقعی لائحۂ عمل کے لیے عملی اقدام کے مراحل متعین کر سکے۔ اس قسم کی تحریروں کے سحر سے آزاد ہونا بذات خود ایک مشکل کام ہوتا ہے اس پر طرفہ یہ کہ جماعتی نظام کے وجود میں آنے کے بعد، متعلقین جماعت کو، جو سقوطِ خلافت سے بے چین ہو کر دوبارہ نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جماعت اسلامی کے جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے، غیر شعوری طور پر ایسا لگا جیسے ٹوٹا بکھرا ڈھانچہ دوبارہ وجود میں آگیا ہو، جیسے اسلام کا اجتماعی نظامِ زندگی لوٹ آیا ہو اور جیسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہو۔

پاکستان میں اس جماعت کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک الگ ہی قصہ ہے۔ وہ دل دکھا دینے والی ایک الگ ہی داستان ہے، ہمیں اس سے کچھ زیادہ سروکار نہیں۔ اس کی بہترین تنقید خود ''تجدید و احیائے دین'' میں مولانا مودودیؒ کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے سید احمدؒ شہید کی تحریک سے متعلق لکھا ہے اور جو بڑی حد تک جماعت اسلامی پاکستان پر صادق آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کی تحریروں میں کثرت سے ایسی مثالیں موجود ہوں، جو سائیکل کے کارخانے سے ہوائی جہاز کے پرزے ڈھل کر نکلنے کی

توقع نہیں کرتا ہو، آخر کیسے یہ یقین کر لیتا ہے کہ غیر اسلامی جمہوری عمل سے کوئی اسلامی قیادت وجود میں آسکتی ہے؟ غیر اسلامی نظام کا ڈھانچہ غیر اسلامی قیادت کو ہی وجود میں لا سکتا ہے، اس طرح کے انتخابی اور جمہوری طریقۂ عمل سے کسی تبدیلی کی توقع کے معنی ہیں کہ ہم کفر کے زینے سے اسلام تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کفر کا راستہ کفر ہی کی طرف لے جاسکتا ہے، اسلام کی طرف نہیں۔ چوں کہ اس تحریک کی نشو و نما غیر منقسم ہندوستان میں ہوئی تھی، برسہا برس کے غور و فکر کے بعد بانئ تحریک نے جو خاکہ ترتیب دیا تھا وہ غیر منقسم ہندوستان کے لیے تھا۔ صورتِ حال کی اچانک تبدیلی ایک بالکل ہی نئے لائحہ عمل کی متقاضی تھی، اب کام مسلمانوں کے ملک اور مسلم اکثریت کے درمیان کرنا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوئی تیاری تھی اور نہ ہی ان کی تحریروں میں ایسا کوئی مواد موجود تھا۔ قدیم تحریری سرمائے میں باتیں اعلیٰ وارفع تھیں، نعرے بلند آہنگ تھے، لیکن اب دنیا بڑی حد تک عملی شکل میں نظر آتی تھی۔ ان عملی دشواریوں کے حل کے لیے قدیم طریقۂ کار خاصا غیر عملی ثابت ہو رہا تھا۔ ذہن اب بھی منہاج النبوۃ پر خلافت کے قیام کی باتیں سوچتا تھا اور ان ہی تصورات میں مگن رہتا تھا جب کہ عملی دشواریوں کے زیر اثر طریقۂ کار خالص ''عملی'' اور ''غیر مثالی'' بنتا جا رہا تھا۔ فکر اور عمل کا بڑھتا اختلاف اجتماع ماچھی گوٹھ جیسے دھماکوں کی شکل میں ظاہر ہوا، لیکن افسوس کہ یہ دھماکے بھی کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہ لا سکے۔

منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی روزِ اول سے ہی کسی صاحبِ نظر سے محروم رہی، حالاں کہ ہندوستان کی بدلی ہوئی سیاسی صورتِ حال میں ایک خالص داعی گروہ کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس کی جاسکتی تھی اور پہلے کی بہ نسبت کسی داعی گروہ کے لیے کام کے امکانات بھی زیادہ پیدا ہو گئے تھے لیکن کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر فکری سرمایہ فراہم کرتا یا عملی منصوبہ بندی کا کام کرتا۔ پھر نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے اپنے مسائل بھی تھے اور ان مسائل کی شدت بھی تھی جس نے غیر محسوس طریقہ سے جماعت اسلامی ہند کو مسلم مسائل کی جماعت بنا کر رکھ دیا۔ اسلام کے احیاء کے لیے کام کرنے والوں میں ہر ممکن قربانی کا جذبہ ہوتا ہے اور اسی جذبے سے انقلابِ اسلامی کا کارواں کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ یہاں کارکنان کے قلوب انقلابی آئیڈیل سے تحریک

حاصل کرتے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی کو بھی نہ صرف خوش دلی سے سہار جاتے ہیں بلکہ شوق کی آگ ہر لحہ تیز ہوتی چلی جاتی ہے البتہ کسی مخصوص گروہ کے حقوق کے لیے لڑنے والوں میں اور اس کی حفاظت کے لیے کام کرنے والوں میں قربانی کا کوئی ایسا داعیہ ممکن نہیں ہوتا۔ مشاورت کی سیاست میں عملی شرکت نے جماعت اسلامی کی انقلابی نظریاتی قبا کو تار تار کرڈالا' داعیانہ ولولہ اور سرکٹادینے والا جوش و جذبہ رخصت ہوگیا اور بہت جلد یہ جماعت بھی مسلم قوم کے محافظ کی حیثیت سے میدانِ عمل میں آگئی۔ نئے جسم میں پرانی روح کی زندگی مشکل تھی' نیتجتاً قربانیوں کے وہ مظاہر' جس کا مظاہرہ پہلی نسل نے کیا تھا' رخصت ہوگئے۔ اللہ کی راہ میں سب کچھ دے ڈالنے کا جذبہ جلد ہی پھیکا پڑ گیا۔ ایک مبارک بخار تھا جو رخصت ہو گیا' ہاں مریض کے دل و دماغ اب بھی اس کیفیت سے آشنا ہیں۔ بیتے دنوں کی یاد سے اب بھی ایمان تازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ روزِ اول سے ہی اس تحریک کے طریقۂ کار میں چند ایسی خامیاں موجود تھیں جس سے کسی ہمہ گیر انقلاب کا برپا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں' صرف چند اشارات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔ جماعت نے دعوت کی بنیاد خالص عقلی دلائل و براہین پر رکھی اور اسلام کو ایک کامیاب اور قابل عمل فلسفہ کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ جدید ذہن سے مغربی نظام ہائے حیات کا طلسم ٹوٹا گیا اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو مرعوبیت کی فضا سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ لیکن عقلی طریقۂ دعوت پر ضرورت سے زیادہ زور اور انحصار انسان کے صرف آدھے وجود کو اپیل کرسکی۔ ماورائی یا مابعد الطبیعاتی اور غیر عقلی وجود اس دعوت سے یکسر محروم رہا۔ عقلی وجود میں انس اور محبت کا جذبہ تو پیدا ہوسکتا ہے لیکن عشق کی شدید کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ عشق جس کی تعریف ہی یہ ہے کہ ہر لحہ بڑھتا چلا جائے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دعوت عشق کے آشیانے میں اپنا نشیمن بنانے میں ناکام رہی۔ نیتجتاً سید احمد کی تحریکِ جہاد کی طرح سرکٹانے کا شدید داعیہ اور شہادت کے لیے انتہائی درجے کا شوق یہاں پیدا نہ ہوسکا۔ دوسری بات جو اس تحریک کے مطالعے کے دوران مجھے کھٹکی ہے وہ اس کا طریقۂ تفہیم و تبلیغ ہے' جو اپنی نوعیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے خالصتاً غیر عوامی ہے۔ یہاں خطاب کا سارا رخ دانشور طبقے کی طرف

تھا۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی کہ کوئی ہمہ گیر تبدیلی عوام کی شمولیت کے بغیر نہ تو آج تک برپا ہو سکی ہے اور نہ ہی آئندہ اس کا کوئی امکان ہے۔ عوام کی بیش تر تعداد ان بھاری بھر کم اصطلاحوں کو سمجھنے کی اہل تھی اور نہ ہی طریقۂ اظہار کی وجہ سے اس کے لیے اس دعوت کا سمجھنا آسان تھا۔ سارا زور مقالوں کی تیاری اور کتابوں کی طباعت پر صرف کیا جاتا رہا۔ یہ طریقۂ کار فکر اسلامی کے احیاء کے لئے تو یقیناً مفید ہو سکتا تھا لیکن عوامی دعوت کے اعتبار سے یہ کوئی بہت بامعنی عمل نہ تھا' اس لیے کہ عوام کی ۸۷٪ آبادی کے لیے مطبوعہ صفحات کچھ بھی معنی نہ رکھتے تھے۔ اس عظیم اکثریت میں دعوتِ اسلامی کے نفوذ کے لیے ان کے پاس کوئی منصوبہ بندی تھی اور نہ ہی کوئی بصیرت۔ تیسری بات جو بہت حد تک پہلی دو باتوں کی توسیع ہے اور کسی اعتبار سے بھی ان دو باتوں سے کم اہمیت نہیں رکھتی وہ تحریکِ حکومت الٰہیہ کے گرد مصنوعی حصار بندی کے عمل سے متعلق ہے۔ مولانا مودودیؒ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ مسلمانوں میں جدید انداز کی جماعت سازی کی ابتداء کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ' انجمن خدام کعبہ' انجمن حمایتِ اسلام' تحریکِ تنظیم' تحریکِ تبلیغ' تحریکِ خاکسار اور بے شمار ایسی تنظیمیں اور تحریکیں وجود میں آ رہی تھیں۔ ایک ایسی فضا میں غلبۂ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو ایک نئی تنظیم بنانے کا خیال آنا کچھ عجب نہ تھا لیکن یہ قدم خواہ کتنا ہی مبارک کیوں نہ ہو' تنظیم سازی اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک ایسا حصار ہوتی ہے جس کا بعد کے عہد میں جماعتی اور گروہی تعصب کی سل میں تبدیل ہونا یقینی ہے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ جہاد میں خطاب براہِ راست مسلم عوام سے تھا۔ عوام اس ندا پر لبیک کہتے ہوئے ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ہر شخص خود کو اس دعوت سے متعلق محسوس کر رہا تھا۔ اس کے برعکس تحریک اسلامی کا گروہی حصار اور جماعتی تعصب اس تحریک کو عوامی بنانے میں حائل رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رکاوٹ زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ غیر شعوری طور پر عوام کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کام صرف ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو اس سے متعلق ہیں 'جو رکن' رفیق یا ہمدرد ہیں' بقیہ لوگ اس ذمہ داری سے آزاد ہیں۔

یہ ایک مختصر تجزیہ ہے ان تحریکوں کا جو اس سرزمین میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اٹھتی رہی ہیں' یہ ان مقدس و بلند مرتبہ ہستیوں کا ذکر ہے جنھوں نے دنیا کی لذات سے دامن بچاتے

ہوئے اپنی ساری دوڑ دھوپ اللہ کے لیے وقف کردی‘ تاریخی تسلسل کی روشنی میں دیکھا جائے تو دراصل یہ سب ایک ہی تحریک کا تسلسل معلوم ہوتی ہیں جو مختلف عہد میں حالات کے تقاضوں اور قائد کی بصیرت کے مطابق احیائے اسلام کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ یہ دیوانوں کی ایسی داستان ہے جس سے مستقبل میں بھی دیوانگی کو فروغ ملتا رہے گا‘ جنون کا بازار گرم رکھنے والوں کو اس شہر جنوں کا فسانۂ غم دل بھلایا نہ جاسکے گا۔ یہ وہ قیمتی تجربات ہیں جس سے اس راہ کے راہی ہر زمانے میں فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اور آج بھی ہندوستان میں غلبۂ اسلام کے لیے جو شخص اٹھے گا وہ ان سابقہ تجربات سے صرف نظر نہ کرسکے گا‘ ایک جدید منصوبہ بندی کے لیے اس میں بیش بہا نکات موجود ہیں۔

جدید ہندوستان میں غلبۂ اسلام کے کارواں کو منظم کرنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے درج ذیل امور پر خاص طور سے توجہ دینی ہوگی:

☆ باطل کی قوت کا ٹھیک اندازہ لگایا جائے اور اس کی بنیادوں پر ایک بہترین حکمت عملی اور کامیاب منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کیا جائے۔

☆ منصوبہ بندی میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ منصوبہ بند حد تک ہمہ جہت ہو اور مختلف پروگرام منتہائے مقصود تک پہنچنے میں ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوں۔ نیز اراکین کو اس جامع منصوبہ بندی کی واقعی بصیرت اور حقیقی ادراک ہو تاکہ وہ اپنے پروگرام کے ہر جز کی اہمیت سے واقف ہوں اور انقلابِ اسلامی کی جدوجہد میں ایقان کا رنگ رچ بس سکے۔

☆ دعوت کا رخ کسی خاص طبقے کے بجائے ساری انسانیت کی طرف ہو اور خطاب کسی خاص گروہ کے بجائے الناس سے کیا جائے‘ یعنی اسلام کی دعوت کو سوسائٹی کے مکھن کے لیے مخصوص نہ کیا جائے بلکہ دعوت کے نتیجے میں جو لوگ اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے اس راہ میں پیش قدمی پر آمادہ ہوں انہیں ہی مکھن قرار دیا جائے۔

☆ طریقۂ ابلاغ و ترسیل‘ لب و لہجہ اور آہنگ و بیان ہر اعتبار سے عوامی ہو یعنی جو بیک وقت سوسائٹی کے ہر طبقے کے لیے قابل فہم ہو۔ دعوت کی حکمت و اسالیب پر فکر آخرت اور رضائے الٰہی کا داعیہ‘ اسلام کی سیاسی برتری‘ جیسے دوسرے تمام داعیات سے کہیں زیادہ غالب

ہو کہ یہی انبیائی مشن کے حاملین کی دعوت کا لب لباب ہے۔

☆ غیر مسلموں کی طرف رویہ مخالفانہ اور متحاربانہ کے بجائے ہمدردانہ اور خیر خواہانہ ہو۔ انہیں پہلے ہی سے کافر اور مخالفِ اسلام تصور کر لینے کے بجائے محض ایک غافل گروہ سمجھا جائے اور ان تک پیامِ ربانی کی ترسیل میں اسی درد کی کارفرمائی ہو جو ایک سچے مسلمان سے کسی خستہ حال غافل کے لیے مطلوب ہے۔ یعنی اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ کاش یہ غافل انسانیت جہنم کے خوفناک عذاب سے بچ جائے۔

☆ انقلاب اسلامی کا کارواں کسی بھی مرحلے میں غیر مسلموں کے تعاون پر انحصار نہ کرے۔ غیر مسلم قوتوں کے تعاون سے کسی "اسلامی جنگ" اور "اسلامی فتح" جیسی خطرناک اور گمراہ کن خوش خیالی سے بچا جائے۔ گو مخصوص حالات میں معاہدے ہو سکتے ہیں مگر اسلامی قوتوں کو فیصلہ کن سمجھتے اور ان کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے۔

☆ مسلم عوام کی کلی حمایت کے حصول کے لیے علامتوں اور نعروں کا استعمال کیا جاسکتا ہے اور ہر زمانے میں کوئی ایسی علامت دریافت کی جاسکتی ہے جس سے دلوں کے تار بج اٹھیں اور مسلمان پوری قوت سے انقلابِ اسلام کی مہم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں' البتہ اس سے قبل ایک ایسے نظام کی ترتیب و تشکیل ضروری ہے جو اس عوامی قوت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکے۔ ساتھ ہی اس کے اندر برپا کردہ تبدیلی کو سہارنے اور اسے استحکام بخشنے کی پوری قوت بھی موجود ہو۔

☆ انقلابِ اسلامی کے علمبرداروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ دعوے سے اپنے کام کا آغاز کریں کہ یہ طریقہ انبیاء کے لیے مخصوص ہے۔ مصلحین اور مجددین کے لیے اس میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔

☆ امت مسلمہ کے اندر کسی مصنوعی طریقہ سے جماعت سازی یا گروہ بندی سے احتراز کیا جائے کہ یہ عمل اپنے خول میں بند اور اپنی دنیا میں مگن رہنے کا فن سکھاتا ہے۔ البتہ امت واحدہ یعنی الجماعت کے احیاء کی کوشش کی جائے اور اسے ایک انقلابی نظریاتی گروہ کی حیثیت سے متحرک

کردینے کے لیے سرتوڑ جدوجہد کی جائے۔

☆ کارکنان میں شہادت کے لیے بلا کا عشق اور اس کے حصول کے لیے انتہائی درجہ کی بے چینی پیدا کی جائے۔ کاروانِ انقلابِ اسلامی کا یہ اول اور آخر نکتہ ہے۔ یہ دیوانوں کے اس گروہ کی پہلی اور آخری خاصیت ہے اور جب تک یہ خاصیت اس عظیم انبیائی مشن کے حاملین میں پیدا نہیں ہوتی انقلابِ اسلامی کا کارواں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ دورِ جدید میں احیائے اسلام کے بینر تلے کام کرنے والی بے شمار تحریکوں، تنظیموں اور اداروں کی ناکامیابی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

انبیائی مشن کا نیا منصوبہ

انقلابِ اسلامی کی نئی مہم اپنی منصوبہ بندی میں اس طریقۂ کار سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوگی جس کی عملی شکل رسول اکرم ﷺ کی تحریک میں نظر آتی ہے۔ گویا بنیادی اصول وہیں سے اخذ کیے جائیں گے البتہ ان کی تفہیم و تعبیر اور اس کے عملی انطباق میں عہدِ جدید کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ ڈیڑھ ہزار سال کی طویل مدت میں انسان کی معاشرتی، معاشی، تمدنی اور نفسیاتی فضا میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے معاشرے کے قدیم ڈھانچے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے، اس لیے جب تک جدید معاشرے کی حقیقت پسندانہ تفہیم نہ ہو اور اس کی بیماریوں کے محور و مرکز کا پتہ نہ لگایا جاسکے، کسی بھی طریقۂ کار کی اثر انگیزی میں شبہ کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ محض اس لیے لائق اتباع نہیں کہ آپ کی حیثیت الٰہی ہدایت کے آخری اور حتمی اعلامیہ کی ہے۔ بلکہ آپ کی سیرت کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ رہتی دنیا تک کسی بھی علاقے اور کسی بھی زمانے میں تحریکِ اسلامی کے قافلے کو جو مراحل پیش آئیں گے اس سے ملتی جلتی اور بہت حد تک قریب مماثلت رکھتی ہوئی کوئی نہ کوئی کیفیت رسول اکرمؐ کی عظیم الشان انقلابی تحریک میں ضرور نظر آئے گی۔ گویا ایک زبردست آرکی ٹائپ ہمارے پاس موجود ہے، رہتی دنیا تک تحریکِ اسلامی کا قافلہ اپنے عظیم قائد کی تحریک کو مثالی حیثیت سے دیکھے گا اور مشکل سے مشکل ترین مراحل میں اس سے روشنی حاصل کرتا رہے گا۔ ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو اگر راہیں مسدود نظر آتی

ہوں، ترکیبیں سجھائی نہ دیتی ہوں، مایوسی چہار سمت سے اپنا دامن تنگ کیے دے رہی ہو اور سب کچھ کھوتا ہوا معلوم ہوتا ہو تو انہیں بھی اپنے قائدؐ کی نگاہِ دور رس اور الٰہی حکمتِ عملی سے اپنی مشعلیں روشن کر لینی چاہئیے۔ قرآن کریم اور سیرت نبوی ﷺ کے عظیم الشان سرمایہ کی موجودگی ایک ایسی نعمت ہے کہ جس سے کبھی بھی کارکنانِ اسلامی کو کھوئی گئی ترکیب کا احساس تادیر برقرار نہیں رہے گا اور مشکل سے مشکل ترین مراحل میں بھی فکر و عمل کی منزلیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔ لیکن اگر بدقسمتی سے کوئی تحریک یا تنظیم انتشار و زوال کے مرحل میں اپنی توانائیوں کو پھر سے منظم کرنے اور اپنے ڈھانچے میں نئی روح پھونکنے کے لیے اپنے بانی کے ارشادات و تعلیمات کی طرف پلٹ کر دیکھتی ہو اور عقیدت و احترام کے جوش میں اس کی وضع کردہ پالیسیوں اور طریقۂ کار پر سختی سے چمٹے رہنے کو ہی زندگی کی طرف واپسی خیال کرتی ہو تو ایسی کوئی کوشش زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتی، یہ دراصل موت کی تصدیق ہوگی۔ کوئی بھی مصلح، مجدد، امام یا عالم، خواہ کیسی ہی بصیرت کا حامل کیوں نہ ہو، اس کی تشریح و تعبیر اور منصوبہ بندی خاص مدت تک مؤثر ہوتی ہے، اس کی نگاہ ایک محدود عہد کو دیکھتی ہے اور اس کی باتوں میں ایک خاص عہد کو جگانے کا جادو ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اس لیے کہ وہ گہرے غور و فکر کے بعد قائد حقیقی یعنی رسول مقبولؐ کی مثالی تحریک سے چند اصول اخذ کرنے اور اسے حالات پر منطبق کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں اسی لیے ایسے متکلمین اسلام کی ضرورت ہوگی جو انقلابِ اسلامی کے کارواں کو اصولی اور عملی ہر دو اعتبار سے حقیقی تحریکِ اسلامی سے ہم آہنگ کرتے رہیں اور جن کی دوربیں نگاہیں سیرت میں مماثل باب دیکھتی رہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی تنظیم کے کارکنان بانیٔ تنظیم کی حکمتِ عملی کو سب کچھ قرار دے بیٹھیں، اس کے متعین کردہ طریقہ تبلیغ پر سختی سے جم جائیں، اس کی طے شدہ حکمتِ عملی اور لائحۂ عمل سے اس قدر سختی سے چمٹ جائیں کہ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر بنیادی عقائد کا جزو محسوس ہونے لگے تو ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ وہ تنظیم مایوسی اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے بلکہ اس کا رشتہ رسولِ اکرم ﷺ کی تحریک سے یکسر کٹ کر رہ جاتا ہے۔ افسوس کہ یہ حادثہ خود ہمارے عہد میں چند اہم تحریکوں کے ساتھ ہوا ہے۔

ہندوستان میں احیائے اسلام کی مختلف تحریکوں سے استفادے کی کوشش ہم نے اس لیے روا رکھی

ہے کہ ان میں سے ہر تحریک ایک خاص مدت تک بالخصوص اپنے ابتدائی مراحل میں اس کیفیت کا عملی نمونہ رہی ہے جسے رسول اکرمؐ کی عظیم الشان انقلابی تحریک کی توسیع کہا جاسکے اور اس اعتبار سے یہ تجربات یقیناً اس لائق ہیں کہ آج بھی جو شخص احیائے اسلام کی تحریک کو از سرنو برپا کرنا چاہے' ان تجربات سے ضرور استفادہ کرے۔ یہ وہ افراد تھے جنہیں کسی نہ کسی حد تک قائدِ اوّل کی تحریکی بصیرتوں کا ادراک ہوا تھا اور جنہیں اللہ نے ان اصولوں کو عہد بہ عہد انطباق کرنے کا سلیقہ بھی دیا تھا۔ اس لیے جو شخص آج نئے سرے سے الٰہی اصولی تحریک کے انطباق سے اس سرزمین میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہو اس کے لیے ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کی ان توسیعات اور مدارج پر نظر رکھنا یقیناً کامیابی کا ضامن ہوگا۔

بدقسمتی سے پچھلی چند صدیوں میں ہمارے ہاں سیرتِ رسول ﷺ پر غور و فکر کا جو انداز رہا ہے اس میں آپ کی سیرت کو ایک جدید قائد اور عہدِ جدید کے عملی رہنما کی حیثیت سے کم ہی دیکھا گیا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی ایسی آوازیں سنائی دیتی رہی ہیں کہ رسولؐ ہمارا قائد ہے' قرآن ہمارا دستور ہے' لیکن ان کی حیثیت نعروں سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ ان نعروں سے اس ضرورت' خواہش اور کسی حد تک مسئلے سے متعلق ادراک کا پتہ تو ضرور چلتا ہے لیکن جو لوگ یہ نعرے بلند کررہے تھے ان کے ہاں کسی ایسی بصیرت کا فقدان تھا جو اس اہم کام کے لیے درکار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کی تحریکوں پر بہار آنے سے قبل ہی خزاں کا ماحول طاری ہوگیا۔ ہمارے سیرت نگاروں نے قائدِ حقیقیؐ کی برپا کردہ تحریکِ انقلاب اسلامی کو مکی اور مدنی ادوار میں اس طرح تقسیم کردیا کہ وحدت میں اس کی تشریح و تعبیر مشکل ہوگئی۔ ایک مثالی قائد کے برپا کردہ مثالی انقلاب کی حیثیت سے اس کی تفہیم اور اس کے مختلف ادوار و مدارج میں گہری معنویت کی دریافت کی کوشش کم ہی ہوئی ہے۔ خانوں میں بانٹ کر انقلابِ اسلامی کی تفہیم کی کوشش اور سیاہ و سفید کی اصطلاحوں میں اس کے اظہار کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ مسلم حکومت کے زوال کے بعد جب ہندوستان کی شرعی حیثیت کے تعین کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو کسی نے اسے دارالحرب قرار دیا تو کسی نے دارالامن اور کسی نے غیر مسلموں سے جہاد و قتال کو عین اسلامی حکم جانا۔ کسی نے اسے تحریک اسلامی کے مکی دور سے تعبیر کیا اور غیر شعوری طور پر ایسا محسوس ہوا جیسے سیرت پاک سے ہدایت کے لیے اب صرف مکی زندگی پر نگاہ مرکوز رکھنا ہوگی۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ

اس تقسیم کے باوجود خود ان علماء کو جب کبھی اپنی باتوں کی سند لانے کی ضرورت ہوئی تو یہ تقسیم بھلادی گئی۔ مثال کے طور پر کانگریس کے ساتھ جمعیۃ العلماء کے تعاون کے سلسلے میں یہ دلیل لائی گئی کہ مدینہ میں خود رسولؐ نے بیرونی خطرے سے بچاؤ کے لیے یہودیوں سے معاہدہ کیا تھا۔ ان ساری افراط و تفریط کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ صحرائے عرب کی عظیم انقلابی تحریک کی تفہیم بے لوچ اصطلاحوں کی مدد سے کی گئی۔ اس تحریک سے بنیادی اصول اخذ کرنے اور اسے عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق بروئے کار لانے کے بجائے ان حالات کا جوں کا توں پیش آنا متصور کرلیا گیا۔ لیکن بادیٔ النظر میں چوں کہ حالات مختلف تھے اور ان ذہنوں پر مقید اصطلاحوں کا شدید بوجھ تھا اس لیے متکلمین کا یہ گروہ کسی واضح رہنمائی کے بجائے خود ہی کنفیوژن کا شکار ہوگیا۔ اس کے علاوہ اس کج فہمی کے رواج پاجانے کا ایک بڑا سبب یہ رہا کہ قومی اور وطنی تحریکوں سے وابستہ علماء کے ایک گروہ نے سیرت کے اس منقسم طریقہ تفہیم کا نسبتاً بے توجہی اور بے شعوری کے ساتھ استعمال کیا۔ اپنی باتوں کو قوت بخشنے کے لیے سیرت کے کسی نہ کسی دور سے دلیل ڈھونڈھ نکالی گئی، گویا گنگا الٹی بہائی گئی۔ سیرت سے رہنما اصول اخذ کرنے کے بجائے اپنی سوچی سمجھی ترکیبوں کو اس میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے اس طریقۂ فکر سے بے راہ روی کے علاوہ اور کیا حاصل ہوسکتا تھا۔

سخت، بے لوچ اور موٹی موٹی اصطلاحوں میں انقلابِ اسلامی کے باریک نکتوں کی تفہیم کیا کچھ کنفیوژن پیدا کرسکتی ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ بیسویں صدی کے مشہور عالم اور مفسر قرآن، جن کے فہم و ادراک میں شبہ کم ہی کیا جاسکتا ہے، رسولِ اکرم ﷺ کی عظیم انقلابی تحریک پر غور کرتے ہوئے انقلابِ اسلامی کی تحریک کے تین مدارج متعین کرتے ہیں: دعوت، ہجرت اور جہاد۔

لیکن نصف صدی قبل کے ہندوستان کی صورتِ حال کے پیش نظر جب انہیں ہجرت کا مرحلہ ناممکن العمل نظر آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ دعوتِ اسلامی کا کاروان کبھی کبھی ہجرت کے بغیر یعنی دعوت سے براہِ راست جہاد کے عمل میں داخل ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ یہ بات بظاہر کچھ بے جان سی معلوم ہوتی ہے کہ اگر اسلامی تحریک کے یہ تین ارتقائی مدارج واقعی ہیں تو آج کے دور میں درمیان کا عمل کیوں ساقط ہوجائے گا۔ آیا کہ اس کے بعد بھی کوئی تحریک اسی قدر اسلامی ہوگی اور اس کا ارتقاء اسی

قدر انبیائی اصولوں پر مبنی ہو گا۔ اس خلط مبحث کی بنیادی وجہ' جو سیرت کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر کے نتیجے میں میری سمجھ میں آئی ہے' یہ ہے کہ بیشتر متکلمین نے صحرائے عرب کی انقلابی تحریک کو کمیت کے اعتبار سے زیادہ اور کیفیت کے اعتبار سے بہت کم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ابتلا و آزمائش کے مکی دور کا تصور ان کے ذہن میں قرنِ اول میں مسلمانوں کے ستائے جانے والے مناظر: انگاروں پر لٹا ڈالنا' گرم تپتی ریت پر گھسیٹنا' کلیجے پر پتھر رکھ دینا' بیڑیوں میں جکڑ دینا اور زدوکوب کر کے لہولہان کر دینا تو ضرور تازہ کر دیتا ہے لیکن عہد جدید میں ایذا رسانی کے جدید طریقوں بالخصوص ذہنی اور نفسیاتی ایذا کو اس کا مماثل و مقابل ماننے پر کم ہی آمادہ ہوتا ہے۔ سیرت کے مطالعہ کے دوران مجھ پر بار بار اس امر کا انکشاف ہوتا رہا ہے کہ معاملہ خواہ دعوت کا ہو' ہجرت کا یا جہاد کا اِن سارے مراحل میں کمیت یعنی بذاتِ خود ان عوامل کے علاوہ کیفیت' یعنی ان عوامل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فضا اور وہ فضا جس کے نتیجے میں یہ عوامل پیدا ہوتے ہیں' کا سایہ گہرا رہا ہے۔ سیرت کی بہتر تفہیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم واقعات کی روشنی میں اس ماحول کو اپنے تخیل میں زندہ کر سکیں اور اس ماحول یعنی کیفیت کی روشنی اور رہنمائی میں واقعات یعنی کمیت سے اصول اخذ کر سکیں۔ مثال کے طور پر ہجرت ایک عمل ہے جس میں کاروانِ اسلامی کا مکہ سے کوچ کرنا اور اسلام کو ایک نئے مرکز سے منظم کرنے کا پروگرام شامل ہے' لیکن کیفیت کے اعتبار سے غور کیجیے تو ہجرت ایک بڑا انقلابی علامیہ ہے یعنی اس بات کا مطالبہ ہے کہ خدا کی راہ میں گھر چھوڑو' وطن کو خیر باد کہہ دو' عزیز و اقارب کی محبتوں پر لات مارو' اپنا جما جمایا کاروبار چھوڑ دو اور اپنے کیریر میں آگ لگا کر دین حق کی راہ میں نکل کھڑے ہو' سب کچھ تج کے' اپنی کشتیاں جلا کے اللہ کے بھروسے یثرب کا رخ کرو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد ہی اسلامی تحریک قوت و عظمت کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے اور بھلا کیسے نہ ہو' جب سب کچھ لٹا دینے والوں کا ایک گروہ وجود میں آ گیا ہو' جس نے اپنی دنیا تباہ کر کے خود کو صرف اور صرف اللہ کے لیے خالص کر لیا ہو تو بھلا ایسے دیوانوں کے گروہ سے کیا کچھ ممکن نہ ہو گا۔ لہٰذا ہجرت کے پس پشت جو ماحول ہے عظیم قربانیوں کی جو داستان ہے' اس کی ضرورت ہر زمانے میں انقلابِ اسلامی کے علمبرداروں کو ہو گی' کہ جب تک اللہ کے لیے اس حد تک خالص ہونے والے مسلمانوں کا گروہ وجود میں نہیں آتا'

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خیال عبث ہے۔ حالات کی تبدیلی اور دنیا کے تمدنی ڈھانچے میں تغیر کے سبب ہوسکتا ہے کہ عہدِ جدید میں امت مسلمہ کو ہجرت ایک واقعہ کی حیثیت سے پیش نہ آئے لیکن کیفیت کے اعتبار سے یہ مرحلہ تحریک اسلامی کا جزولاینفک ہے۔ واقعاتی اعتبار سے ہجرت کی ظاہری شکل خواہ کتنی ہی کیوں نہ بدل جائے افراد کے اندران داعیات کا پیدا ہونا تحریک اسلامی کا ایک ناگزیر مرحلہ ہوگا۔

ہندوستان میں بھی انقلابِ اسلامی کے علمبرداروں کو 'کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے قائدِ حقیقی کی انقلابی تحریک کا اتباع کرنا ہوگا۔ انقلابی مزاج کو تادیر برقرار رکھنے کے لیے ان ہی کیفیات اور داعیات کی ضرورت ہوگی۔ نبوت کے ابتدائی تیرہ سال پر غور کیجئے جو اس لحاظ سے اہم ہیں کہ یہ دور سخت ابتلاء و آزمائش میں، کسی قسم کی سیاسی سرپرستی اور 'سلطاناً نصیراً' کے بغیر گزرا ہے۔ ذرا تصور کیجئے' ایک طرف دعوتِ حق لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتی جارہی ہے' مسلمانوں کے گروہ میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے' الٰہ حقیقی کے علاوہ سارے الٰہ کے انکار کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے اور دوسری طرف اسی مکے میں اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل کی جارہی ہے' رسولِ خدا کی باتوں کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جارہا ہے' توحید کے گھر کعبہ میں بتوں کی پرستش جاری ہے' کعبہ کا ننگا طواف ہو رہا ہے۔ بھلا ان مناظر سے کس کا دل خون نہ ہوا جاتا ہوگا' تحقیر و تذلیل کے اوچھے ہتھکنڈوں کے یہ تیر بھلا کس کے دل کو زخمی نہ کیے دیتے ہوں گے۔ ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں کی تعداد ڈھائی سو سے تجاوز کرچکی تھی جو مکہ کی قدیم آبادی کے لحاظ سے ایک قابل ذکر تناسب تھا۔ لہٰذا یہ عین ممکن تھا کہ جو قوم مصالحت کے لیے تاج و تخت پیش کر رہی تھی اس سے ایک نئی انفرادیت کے ساتھ 'ایک نئے ضابطۂ حیات کے مطابق جینے کا حق تسلیم کرالیا جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ نئی امت کعبہ میں اپنے مخصوص طریقۂ عبادت کے لیے اپنا حق تسلیم کرالیتی' اپنے اوقات مخصوص کرالیتی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ جو تھوڑی بہت قوت جمع ہوئی تھی اسے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

کہہ کر باطل سے ٹکرا دیا جاتا یا بیت اللہ میں حامیانِ اسلام کی ریلی ہوتی' مظاہرے کیے جاتے' نعرے بلند ہوتے اور اس طرح حق پرستوں کے بھی کچھ مطالبات تسلیم کرالیے جاتے' لیکن یہ سب کچھ

نہیں ہوا۔ وقت کا رسولؐ جانتا تھا کہ ان مسائل میں الجھنا اپنی قوت کا زیاں ہے۔ اس کی نگاہِ دوررس دیکھ رہی تھی کہ اس کے پاس جو انقلابی پیغام ہے اس کا زور قریش کی حربی قوت نہیں توڑ سکتی۔ آج اگر کعبہ میں بت رکھے ہیں تو کل ضرور اللہ کا گھر بتوں سے پاک ہوگا۔ کفارِ مکہ اگر قوتوں میں بظاہر مضبوط نظر آتے ہیں تو خدا پرستوں کے پاس متحرک نظریے کی ایسی عملی قوت موجود ہے جو بڑے سے بڑے لشکر کو بہالے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دشمن اگر افرادی قوت کے محاذ پر مضبوط ہے تو جنگ اس محاذ پر لڑی جانی چاہئے جہاں اس کی تہی دامنی اور بے بسی واضح ہے۔ اور دنیا نے دیکھا کہ اس حکیمانہ جنگ (strategic war) نے بڑی آسانی سے نہ صرف عرب کو فتح کر لیا بلکہ نہایت ہی مختصر مدت میں وقت کی دونوں عظیم طاقتیں ایران اور روما اس کے زیر نگیں ہو گئیں۔

قائدِ حقیقی ﷺ کی حکمتِ عملی پر غور کرنے سے جو باتیں سمجھ میں آتی ہیں ان میں یہ حقیقت بہت واضح ہے کہ مختلف وقتی مسائل سے دامن بچاتے اور چھوٹے چھوٹے ہنگاموں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے مکہ میں تحریکِ اسلامی کا کارواں تیزی سے کامیابی کی طرف گامزن رہا۔ کعبہ میں بتوں کی پرستش اور اسلام اور مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل ایسے مسائل ضرور تھے جن کی کسک ہر دل محسوس کر رہا تھا لیکن ان مسائل میں الجھنا منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی کے خلاف تھا۔ یہاں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جوشِ جذبات میں مسلمانوں کا گروہ کعبہ کی حرمت کے نعرے پر نکل کھڑا ہوا ہو اور دو چار سر کٹے ہوں اور لوگ ٹھنڈے بیٹھ گئے ہوں۔ یا دو چار لوگوں کو خیال آیا ہو اور وہ تبلیغ کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے ہوں' یا کسی کے دل میں اسلام پر کیے جانے والے رکیک حملوں سے ٹھیس لگی ہو اور وہ اس کے جوابات لکھنے بیٹھ گیا ہو بلکہ سارے فیصلے اور ان کی عملی تعبیر ایک گہرے دور بین منصوبہ بندی کے جز تھے۔ باطل کے در پر ملتجیانہ اور فدویانہ درخواست کے بجائے اس کی جڑوں پر حملہ کیا گیا اور اسے ہلا پھینکا گیا۔ پس آج بھی اگر کسی کو ہندوستان میں اس عمل کو تازہ کرنا مقصود ہو تو اسے چاہیے کہ جدید ہندوستان میں باطل کی جڑوں کا سراغ لگائے اور اس کے کمزور مظاہر سے الجھنے اور اس میں اپنی قوت ضائع کرنے کے بجائے اس کے مراکز و مآخذ کو کامیاب اور منظم حملے کے ذریعہ نیست و نابود کر دے۔

جدید ہندوستان میں باطل کے مراکز وماخذ

سیاسی اقتدار:

یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر باطل کی گرفت خاصی مضبوط ہے' بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاسی اقتدار کی ساری قوت باطل کے استحکام بخشنے اور اس کی تشہیر و تبلیغ میں مصروف ہے۔ انسانوں کو انسانوں کے استحصال سے نکالنے اور اس سر زمین سے نا انصافی اور ظلم کو ختم کرنے کی صلاحیت نہ ہی اس لادینی نظام میں موجود ہے اور نہ ہی کسی ایسے منشور کا واقعی احساس اس نظام کے کارکنان کو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان ترقی یافتہ دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے نئے نام سے آیا ہے' نئی اصطلاحوں میں پرانا ابلیسی عمل جاری ہے۔ جہاں کمزور گروہوں سے اس کے بنیادی حقوق بھی چھین لیے گئے ہوں' جہاں اقلیات کو جینے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو' جہاں عدالتیں ظالم کو بری کرتی اور مظلوم کو سزا سناتی ہوں۔ جہاں انصاف' تحفظ اور بنیادی حقوق محض دستور کی زینت بنے ہوں بھلا باطل کے لیے ایسے نظام سے مؤثر اور مفید اور کون سا نظام ہو سکتا ہے۔ قدیم شاہی یا قبائلی نظمِ حکومت میں ابلیسی کاروبار کی باگ ڈور چند مخصوص ہاتھوں میں ہوا کرتی تھی' اس لیے عملی طور پر دعوت کے ذریعہ اس طبقے کی حمایت حاصل کرنے یا جہاد کے ذریعہ اس کا زور توڑنے سے معاشرے میں بآسانی تبدیلی لائی جاسکتی تھی۔ لیکن آج اقتدار کی باگ ڈور صرف اونچے طبقے میں مرکوز نہیں ہے' عامۃ الناس بھی اس میں کسی حد تک شریک دار ہے' وہ بھی اسے استحکام بخشنے یا اکھاڑ پھینکنے کے لیے مؤثر ہے۔ اس معاشرتی تبدیلی کی وجہ سے دعوت کی تکنیک اور اس کے لائحہ عمل میں بھی بڑی تبدیلی آئے گی جس پر ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ حق جب اپنی اصل شکل میں آئے گا' جب ظلم و نا انصافی کے خاتمے کی تحریک چلے گی' جب ظالموں کو تاراج کرنے اور مظلومین کی حمایت کا کھلے عام

اعلان ہوگا اور جب توحید کے نغمے برسرِعام گائے جائیں گے تو یہ نظامِ باطل جو مستحکم ہے، منظم ہے، بااقتدار ہے، اللہ والوں کی اس تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں ہرگز برداشت نہ کرے گا۔ مخالفت ہوگی، مخاصمت ہوگی، ابتلاء و آزمائش کے تیر سہنے ہوں گے، مصائب و آلام کی شدت سے کانپ اٹھنے کے دن بھی آئیں گے اور یہ سب کچھ کسی خاص طبقے کی طرف سے نہ ہوگا، عوام الناس بھی اس عمل میں شریک ہوں گے اس لیے کہ اس نظام سے ایک طویل تعلق کی وجہ سے وہ بھی شعوری طور پر اس کے حمایتی بن چکے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح دعوت اگر لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے گی تو اسے کسی مخصوص طبقے یا بااثر لوگوں پر ہی اپنی توجہ مرکوز نہیں کرنی ہوگی بلکہ سیاسی نظام کی تبدیلی کے لیے عامۃ الناس کو بھی اسی قدر اہمیت دینی ہوگی اس لیے کہ اب اقتدار کا Polarization بڑی حد تک تقسیم و تحلیل ہو چکا ہے۔

دانش گاہیں:

ہندوستان میں بے شمار دانش گاہیں اور علوم کے مختلف ادارے نظامِ باطل کی سرپرستی میں علوم کی ترویج و اشاعت میں دن رات مصروف ہیں۔ علم کی یہ عظیم قوت بھی نظامِ باطل کے ہاتھوں مظلوم ہے، ان قاہر و جابر پنجوں سے اسے آزاد کرانا بھی نظامِ اسلامی کے علمبرداروں کا کام ہے۔ جدید نظامِ تعلیم کی ساری قوت نظامِ باطل کو کل پرزے فراہم کرنے اور اس کے مسائل حل کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ پاسدارانِ علوم کی یہ کوشش ہے کہ کسی نہ کسی طرح باطل کو صحت مند نہ سہی ایک طویل زندگی بخشنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ پچھلی چند صدیوں میں علم کا ارتقاء چوں کہ باطل ہاتھوں میں ہوا ہے، خدا سے انحراف اور الٰہی پیغام سے بیزاری اس کی گھٹی میں رچ بس گئی ہے اس لیے باطل کی خدمت کے لیے اس کا ڈھانچہ فطری طور پر مانوس ہے، خدا پرستوں کو جدید علوم کے نام سے ہی وحشت ہوتی ہے۔

ذرائع ابلاغ:

کسی بھی نظام کو استحکام بخشنے میں اس کے بنیادی منشور کی اشاعت و تبلیغ ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ نظامِ باطل کو ایسے جدید آلاتِ نشر و اشاعت کی سہولت حاصل ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ

جمہور کے ذہنی رجحان کو کنٹرول کرسکتی ہے بلکہ کسی بھی مخالف رجحان اور نظریے کو پروپیگنڈے کی قوت سے لمحوں میں کچل سکتی ہے۔ ریڈیو' ٹی وی' ویڈیو' فلموں اور سنیما ہالوں سے باطل کی جس طرح دن رات اشاعت ہو رہی ہے اس کا مقابلہ اس وقت تک مؤثر انداز سے نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ حامیانِ حق میں بھی ان جدید آلات کو استعمال کرنے کا رجحان اور شعور نہ ہو ورنہ عملاً ہوگا یہ کہ آپ کی تمام تر سرگرمیاں گھر گھر جا کر دعوت پہنچانے کا قدیم طریقۂ تبلیغ' جدید وسائل کے سامنے ایک لمحے کے لیے نہ ٹک سکے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ آپ کے قدامت پسند گروہ کو بھی ابلاغ کا یہ سیلاب بہالے جائے۔ بھلا یہ کیسا مقابلہ ہے کہ باطل تو اپنی فکر کی تبلیغ کے لیے جدید ترین آلات کا استعمال کرے' سوسائٹی میں مخرب اخلاق صفات کی پرورش کے لیے ہر ممکن سہولتیں فراہم کرے' ذرائع ابلاغ کے بل بوتے پر اور جھوٹے پروپیگنڈے کے سہارے لوگوں کی فکر کو جس طرف چاہے موڑ دے' انسانوں کے غول کو اندھی بھیڑوں کی طرح جس طرف چاہے ہنکالے جائے اور حق کے پرستار اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے دروازوں کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے پھریں۔

اسلام مخالف تحریکیں:

منقسم ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھنے والی تحریک بنیادی طور پر ہندوازم کے احیاء کی تحریک ہے۔ ہندو احیاء پرست واقعی کیا چاہتے ہیں؟ اس مسئلے کو سمجھنے میں ہمارے بیشتر دانشور غلط فہمیوں کا شکار رہے ہیں۔ ہندو احیاء پرستی دراصل ملک کی سب سے بڑی اکثریت کی مایوسی' شکست خوردگی اور قنوطیت کی شدید اور ہلا مارنے والی کیفیات کا اظہار ہے۔ مسلمانوں نے مسلم قومیت کے نام پر ایک علیحدہ خطہ حاصل کر لیا اور وہاں اسلام کے نام پر اپنی مرضی کے مطابق جو جی میں آیا کرتے رہے۔ لیکن اس حصے بخرے کے باوجود منقسم ہندوستان عملی طور پر اکھنڈ بھارت میں تبدیل نہ ہو سکا۔ نظریاتی اعتبار سے تہی دامنی بھی ہندو راج کے قیام میں مانع رہی۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے حقوق کی طلبی کے لیے جس کے لیے انہوں نے الگ خطہ حاصل کر لیا ہے' اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ ہندو احیاء پرستوں کا کوئی براہ راست ٹکراؤ اب تک اسلام کی نظریاتی قوت

سے نہیں ہوا ہے بلکہ ایک ایسی قوم سے ہو تا رہا ہے جو خود کو مسلمان کہتی ہے اور جو اقلیتی فرقے کی حیثیت سے ہر قسم کی مراعات کی طالب ہے۔ البتہ پچھلے چند برسوں سے نظریاتی سطح پر بھی ایک منظّم جنگ کے آغاز کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسلام کے خلاف گمراہ کن علمی اور عوامی پروپیگنڈے کے لیے احیاء پرست تحریکوں کے مراکز اور ان کے اشاعتی ادارے حرکت میں آگئے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلسل ایسے شگوفے چھوڑے جا رہے ہیں اور دن رات ایسے فتنے جگائے جا رہے ہیں جس سے حامیانِ اسلام میں شدید بے بضاعتی اور احساس عدمِ تحفظ پیدا کرنا مقصود ہے تاکہ ان کی ساری توانائی تحفظ کے عمل میں صرف ہو کر رہ جائے' اقدامی عمل کی طرف ان کا خیال بھی نہ جائے۔ احیاء پرستوں نے یہ جال ایک گہری سازش کے تحت دوسری ابلیسی قوتوں کے تعاون سے بچھایا ہے' وہ جن افرادی اور حربی قوتوں کے ساتھ میدان میں آئے ہیں اس کا مقابلہ مشکل بھی ہے اور حکمت اور منصوبہ بندی کے خلاف بھی۔ اگر مسلمان ان شگوفہ طرازیوں کا اسی انداز میں جواب دیتے رہے تو نہ صرف یہ کہ غیر ضروری عمل میں اپنی قوت کو ضائع کرتے رہیں گے بلکہ اقدامی عمل کی صلاحیت سے بھی یکسر محروم ہو جائیں گے۔ البتہ نظریاتی محاذ پر دشمن نہ صرف یہ کہ کمزور ہے بلکہ اسلام کی انقلابی نظریاتی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی جھولی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خود ہندو معاشرہ نظریاتی سطح پر جس افراط و تفریط کا شکار ہے۔ کمزور طبقات کو ہندوازم سے جو مایوسی پیدا ہو چلی ہے ایسی صورت میں اسلام کے انقلابی اور انسانی پیغام کو اپنی جگہ بناتے ہوئے کچھ دیر نہیں لگے گی اور یہ یقیناً ایک ایسا محاذ ہے جہاں سے گھس کر دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا کیا جا سکتا ہے۔

باطل کے حمایتی:

جدید دنیا کی قیادت چوں کہ باطل کو حاصل ہے اس لیے منطقی طور پر باطل کی تحریک قیادت کی برکتوں سے بھی فیضیاب ہو رہی ہے۔ مختلف سطحوں پر باطل کی تنظیم اتنی منظّم ہے کہ احیائے اسلام کی تحریک کسی ملک میں کونپل نکالتی ہے تو اپنے سارے داخلی انتشار و اختلاف کے باوجود دونوں بڑی طاقتیں اس نئی نظریاتی قوت کا قلع قمع کرنے کے لیے باہم متحد ہو جاتی ہیں۔ ابھی مضراب باطل کے

چند تار بھی نہیں ٹوٹتے کہ بیرونی حمایتی مختلف شکلوں میں مدد کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی احیائے اسلام کا کام محض ملکی باطل سے ٹکر لینے تک محدود نہ ہوگا بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ بڑی طاقتوں کی دشمنی بھی مول لینی ہوگی۔ اب اگر کوئی شخص اپنے اندر اتنی جرأت پاتا ہے اور اتنے سارے خطرات کو محض اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر مول لینے کا حوصلہ رکھتا ہے تو وہ آئے' اس عظیم اور مقدس ذمہ داری کو قبول کرے اور اللہ کے منتخب اور مقرب بندوں میں اپنا شمار کروالے اور جسے سکون کی زندگی کا یارا ہو' دنیا کی محبتیں کھینچتی ہوں' گھربار اور عزیز واقارب کی یاد ہلا مارتی ہو' زندگی خوشنما اور پرفریب نظر آتی ہو تو اس کے لیے بہتر ہے کہ اس خطرناک وادی میں قدم رکھنے کے بجائے اپنے لیے کوئی اور راستہ منتخب کرلے۔

باطل کے مراکز کے تعین اور اس کی قوت کے اس تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ باطل کتنا منظم، مستحکم اور مسلح ہے۔ اس کے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اسی درجے کی تیاری کی ضرورت ہوگی' ہلکے اور ثانوی انداز میں کام کرنے سے بات ہرگز نہ بنے گی۔ نہ گرما گرم تقاریر اور پرجوش نعروں سے کچھ بات بنے گی اور نہ ہی محض اجتماعات اور چلّوں سے باطل پاش پاش ہوگا یا خانقاہی کشف وکرامات سے تڑپ تڑپ کر جان دے دے گا۔ اب آیئے ذرا ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ قوت کا بھی میزانیہ لگایا جائے۔

جدید ہندوستان میں قوتِ اسلامی کے مراکز

مساجد :

انقلاب اسلامی کے مرکز کے لیے اللہ کے گھر سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں مساجد کے رول کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے آخر فکر و نظر میں اس قدر زوال کیونکر در آیا۔ موجودہ ہندوستان میں مساجد کا نظام جس طرح تہہ و بالا ہے' باطل کو اس سے بڑی کامیابی اور کسی محاذ پر مشکل ہی سے ملی ہو گی۔ ایک طرف قرونِ اولیٰ کی مساجد کا تصور کیجئے: باطل کو نیست و نابود کرنے کے سارے منصوبہ وہیں بنائے جاتے ہیں' انقلابِ اسلامی کے سارے فیصلے وہیں طے پاتے ہیں' مسلمانوں کے خارجی اور داخلی معاملات پر نرم و گرم بحثوں کی آماجگاہ بھی وہی ہوتی ہے' سفارتیں بھی وہیں طے پاتی ہیں اور باطل قوتوں کے پاش پاش ہو جانے کی خوش خبری بھی وہیں سنائی جاتی ہے۔ دوسری طرف ذرا ہماری مساجد کو دیکھئے' سکون اور تنہائی کی جگہ ہے' دنیا کے بکھیڑوں اور جھنجھٹوں سے فرار اختیار کرنے والوں کی جائے پناہ ہے' مراقبے اور استغراق کی جائے امان ہے' انقلابیت اور انقلابی پیغام کے نقیب ہونے کا تو جیسے سرے سے شعور ہی کھویا گیا ہے۔ ایک طرف تو باطل کے اداروں کی سربراہی ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو زبردست ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں دوسری طرف اہلِ حق کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جنھیں تدبر اور تفکر کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اور نہ ہی ان۔ بے چاروں کو یہ معلوم ہے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ گویا جو ہر اعتبار سے تہی دامن تھا' معذور و بے بس تھا' جو کہیں اور اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہا اس نے امامت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ملک کی بیشتر مساجد اسی زوالِ فکر و نظر کا نوحہ ہیں۔

دینی مدارس:

علوم کی تسخیر اور اسے اپنے مقاصد کے لیے بروئے کار لانا کسی تحریک کی رفتار کو کتنا تیز کر دیتا ہے اور باطل نے تسخیر علم کے ذریعہ کس کس طرح اپنے استحکام اور ارتقاء کا بازار گرم کر رکھا ہے اس بارے میں ہم اوپر اشارات کر چکے ہیں۔ ایک طرف تو علوم کے جدید شیطانی مراکز ہیں جہاں ہر لحہ باطل کی عالمگیر تحریک کو پیش آمدہ خطرات پر غور و فکر جاری ہے، حکیمانہ اور کامیاب جنگ کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، حربی اور علمی قوتوں سے اس تحریک کو مزین اور مسلح کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے علمی مراکز ہیں جہاں علومِ اسلامی کے نام پر از کار رفتہ نصاب پر زور ہے، صدیوں قدیم انسانی تشریح و تعبیر کے نمونے اسی تندہی اور ایقان سے پڑھے اور پڑھائے جا رہے ہیں۔ انتہائی بے بصیرتی اور بے شعوری کے عالم میں فقہی مسائل، جن پر صدیوں کی گرد جم چکی ہے کا ورد جاری ہے۔ قدیم فلسفہ و منطق کو معراج و منتہیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔ بعد کی صدیوں میں ان علوم پر یوروپ اور امریکہ میں جو زبردست اضافے ہوئے ہیں ان سے یک گونہ بے خبری ہے۔ قرآن و حدیث کو بے شعوری طور پر داخلِ نصاب تو ضرور کیا گیا ہے لیکن اس کی تفہیم و تعبیر میں بھی قدامت کا رنگ بری طرح غالب ہے۔ جدید دنیا کے جدید مطالبات کی روشنی میں ان کی تفہیم کی کوشش ہے اور نہ ہی عہدِ جدید کے لیے ان الٰہی اور انبیائی مآخذ سے ہدایت کے حصول کی کوئی واقعی تڑپ ہے۔ ساری علمی معرکہ آرائیاں فروعی اور اختلافی مسائل تک محدود ہیں۔ ان بے چاروں کو اس بات کا شعور کم ہی ہے کہ امت کے اہم مسائل کچھ اور ہیں اور یہ کہ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال کا اگر منظّم اور منصوبہ بند طریقے سے مقابلہ نہ کیا گیا اور ملت میں افتراق کی یہ کوششیں بند نہ کی گئیں تو اسلام کے نام لیوا ہی صفحہ ہستی سے ختم ہو جائیں گے پھر ان فروعی مسائل اور پست خوردہ علمی معرکہ آرائیوں کا کچھ بھی نہ بنے گا۔ ساری دوڑ دھوپ کا ماحصل یہ ہے کہ کتاب و سنت کے علم کو فن کی حیثیت سے حاصل کیا جائے اور پیشے کی حیثیت سے برتا جائے۔ قال اللہ قال الرسول کہنے والی زبانیں تو یقیناً موجود ہیں لیکن کسی قرآنی اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا کوئی شعور نہیں۔ الٰہی پیغام کی نشر و اشاعت کی کوئی بصیرت ہے اور نہ ہی الٰہی ہدایت کے غلبہ و نفاذ کی کوئی عملی یا فکری تیاری۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ دینی مدارس اسلام کے قلعے ہیں لیکن ان مدارس میں

بے حسی کا جو ماحول طاری ہے، اسلام کے انقلابی مزاج سے ناواقفیت کی جو فضا عام ہے، غلبۂ اسلام کی مہم سے جو بے تعلقی پائی جاتی ہے، تنگ نظری، تعصب، گروہی اور مسلکی عصبیت کا جس قدر رواج ہے، ان امور کے پیش نظر تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کم ازکم اس اسلام کے قلعے نہیں ہیں جس کی انقلابی قوت نے نصف صدی کے اندر باطل کی بڑی بڑی ہمالیائی قوتوں کو تاراج کر دیا تھا اور جس کے ماننے والوں کی اخلاقی قوت سے منظم اور مسلح دشمن بھی کانپ اٹھتے تھے۔ آخر یہ کیسے اسلامی قلعے ہیں جنہیں باطل بڑے سکون و آرام سے برداشت کر رہا ہے؟ معدودے چند کے علاوہ بیشتر مدارس کا یہی حال ہے۔ ایسی صورت میں اس بات کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ غلبۂ اسلام کی مہم کو یہاں سے کچھ زیادہ تعاون مل سکے گا بلکہ عین ممکن ہے کہ انقلابی روح کا فقدان انہیں انقلابِ اسلامی کی مخالفت پر آمادہ کر دے۔

مسلم تنظیمیں:

امتِ اسلامیہ ہند میں زندگی کی جو تھوڑی بہت رمق باقی ہے اور ایمان و عمل کے کچھ مظاہر اگر کبھی کبھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں تو ان میں ایک قابلِ ذکر حصہ ان تنظیموں اور تحریکوں کا ہے جو صدی کے نصف اوّل میں وجود میں آئی تھیں، جن کے باقیات الصالحات آج بھی اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ فکرِ اسلامی کی ترویج و تبلیغ اور دعوتِ اسلامی پر غور و فکر کا جو تھوڑا بہت رجحان پایا جاتا ہے اس کا سہرا ان ہی تنظیموں اور انجمنوں کے سر ہے۔ البتہ باطل کے مقابلے کے لیے جدید تر اور مؤثر لائحہ عمل کے سلسلے میں یہ بھی تہی دامنی کے شکار ہیں۔ باطل کی حیرت انگیز رفتار نے ان کی عقل و فہم اور قوتِ ادراک پر ہیبت طاری کر دی ہے، پرانی ترکیبوں کی اثر انگیزی میں انہیں شبہ ہے، نئی ترکیبیں دریافت کرنے کا انہیں ہنر نہیں آتا۔ کوشش تو یہ اپنی سی ضرور جاری رکھے ہوئے ہیں، انقلابِ اسلامی کے نعروں سے اکثر خود کو تسلی بھی دیتے رہتے ہیں، کبھی کبھی باطل کو مار گرانے کا دبی زبان سے شرمائے لجائے انداز میں اظہار بھی کرتے ہیں لیکن کیا ان کے طریقۂ عمل میں باطل کو تباہ کر دینے کی واقعی قوت موجود ہے؟ اس بارے میں ایقان کی کیفیت سے بڑی حد تک ان کا دامن خالی ہے۔ انقلابِ

اسلامی کی نئی مہم کو قوت کی فراہمی کے لیے یہ مراکز پر امید ضرور ہیں البتہ کس نوعیت اور کس درجے کا تعاون یہاں سے مل سکے گا اس بارے میں بہت کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا اس لیے کہ موجودہ ہندوستان کی مسلم تنظیمیں، کوئی کم کوئی زیادہ، بدقسمتی سے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہیں جہاں اصل مقصد پس پشت چلا جاتا ہے، تنظیم خود ایک دوکان بن جاتی ہے جس کا چلتے رہنا ضروری قرار پاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس تنظیمی ڈھانچہ کو لوگ مدت سے گلے لگائے رہے ہیں، جس سے فطری طور پر یک گونہ محبت بھی پیدا ہو گئی ہے، ان حصار بندیوں سے کتنے لوگ خود کو آزاد کرنے کا یارا رکھتے ہیں، کتنے لوگوں میں اس مقصدِ عظیم کے لیے گروہی عصبیت کو خیر باد کہنے کا حوصلہ موجود ہے اور کتنے لوگ تنظیم کی محبت کو اللہ کی محبت پر واقعتاً قربان کر ڈالتے ہیں۔

مسلم قیادت:

موجودہ ہندوستان میں کسی واقعی دینی قیادت کا وجود موہوم ہے۔ نہ کوئی ایسا ادارہ ہے جو اس ذمہ داری کو سنبھالے اور نہ ہی کوئی ایسی شخصیت ہے جسے مسلمانانِ ہند کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ معدودے چند لوگوں کو اگر کسی حد تک احترام کی نگاہ سے دیکھا بھی جاتا ہے تو اس کی وجہ ان کی فہم و فراست اور تفقہ فی الدین نہیں بلکہ مصلحت کوشی اور بزدلی ہے۔ یہ کسی ایسے مسئلے میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتے جس سے کسی بھی طرح ان کی شخصیت کے متنازع بننے یا ان کی مقبولیت میں کمی آنے کا اندیشہ ہو۔ قیادت کی ایک دوسری قسم چھوٹے چھوٹے دائروں کی شکل میں مختلف انجمنوں اور تنظیموں کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مختصر دائروں کے اندر ہی پوری کی پوری خلافتیں چل رہی ہیں، امارتیں ہیں، شوریٰ ہیں، فیصلے ہیں اور ان کا انطباق ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلامی نظام کے تحت جینے کا احساس ہے، سکون کی نیند سونے کا سارا سامان یہاں بھی موجود ہے۔ باطل کے چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے ان قائدین کی تمام تر توجہ اس امر پر مرکوز ہے کہ اس مصنوعی خول کو استحکام اور توسیع ملتی رہے جو نظامِ باطل کے تحت اسلامی زندگی جینے کا فن سکھاتا ہے۔ اب رہی ملی اور قومی قیادت تو اس پر رفتہ رفتہ از کار رفتہ سرکاری نوکروں کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے، سرکاری نوکر ہونا بذاتِ خود کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر ضرور

ہی اعتراض کیا جائے لیکن زندگی بھر نظامِ باطل کی خدمت کرنے اور ان خدمات کے سلسلے میں ترقی و مناصب کی تفویض کے داعیات موجود ہونے سے شخصیت میں جتنی ٹیڑھ میڑھ پیدا ہوجاتی ہے اس کے بعد اچانک اس ڈھلے بنے دماغ سے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا کام لینا ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے' کجا کہ غلبہ اسلام جیسی اہم مہم کے لیے ان سے کوئی بڑی توقع وابستہ کی جائے۔

اسلام کے حمایتی:

اندرونِ ملک کے حامیانِ اسلام کا حال آپ نے ملاحظہ فرمایا' اب اسلام کے بیرونی حامیانِ اسلام کی کارگزاری کا بھی جائزہ لیجیے۔ فی الوقت بین الاقوامی سطح پر مسلم دنیا دو واضح بلاک میں منقسم ہے' ایک امریکہ کا زبردست حامی اور آلۂ کار ہے تو دوسرا اس کا شدید مخالف' ایک عجمی اسلام کا نمائندہ ہے تو دوسرا عربی قومیت کے بل بوتے پر عجمی اسلام کے خاتمے کے لیے سرگرداں ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کو اگر کسی قسم کی کوئی مدد ملتی رہی ہے تو انہیں دو باہم متحارب اور مخالف بلاک سے اور اب بھی اسلامی تحریکیں معاونت و سرپرستی کے لیے "سلطاناً نصیراً" کی دعائیں مانگتی ہیں تو ان کے ذہن میں ان ہی ممالک کا خیال آتا ہے۔ تحریک اسلامی کی نصرت و حمایت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں ہی ممالک کی مالی مدد کسی انقلابی عمل کے لیے سخت مضرت رساں ہے۔ دونوں گروہوں کے جذبہ معاونت کے پیچھے اپنی لابی وسیع اور منظم کرنے کا داعیہ موجود ہے۔ ثانی الذکر غلط اور صحیح ہر قسم کے فیصلوں پر اپنی حمایت کا طلب گار ہے اور اول الذکر منافقت میں اس حد تک آگے جاچکا ہے کہ ایک طرف تو باطل کے ہاتھوں آلۂ کار ہے اور دوسری طرف سرزمین اسلام پر اپنی شہنشاہیت کے استحکام کے لیے خود کو اسلام کے حامی و مددگار کی حیثیت سے پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ ان کی حمایتوں کے قبول کرلینے کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نام پر ظلم و جبر کی شخصی حکومت کے استحکام کے لیے حوارین میں اپنا نام لکھوالیں۔[1] جن تحریکوں نے مشروط امداد قبول کی ان کی صورت شکل اتنی مسخ ہوچکی ہے کہ وہ اب شہنشاہیت کے خوشہ چین کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ اسلام کی انقلابی روح کب کی رخصت ہوچکی ہے۔

یہ ایک مختصر گوشوارہ ہے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی قوت کا۔ اب بھلا کوئی شخص اس بدحالی میں اسلام کی فتح کی بات سوچتا ہے اور ازکار رفتہ طریقہ ہائے عمل کے بل بوتے پر مستقبل قریب میں اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا خواب دیکھتا ہے تو یہ محض اس کی خوش فہمی ہے۔ قوتِ اسلامی کی اس تباہ حالی کے باوجود بھی اگر کوئی شخص انقلابِ اسلامی کا منتظر ہے تو اس کا یہ انتظار بھی' انتظارِ مہدی کی طرح ایک لایعنی انتظار ہے' اسے چاہئے کہ اس انتظارِ مقدس میں اپنا وقت گنوانے کے بجائے سلیقے کا کوئی اور کام کرلے۔

باطل کو کیسے اکھاڑ پھینکا جائے

تاریخ کے ہر دور میں باطل اپنے مراکز و مآخذ بدلتا رہا ہے' کچھ تو معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے اور کچھ باطل کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ نئے طریقے اور نئے انداز سے سامنے آتا ہے' ان جگہوں پر اپنی قوتیں جمع کرتا ہے جہاں حاملینِ حق کی نگاہیں مشکل سے پہنچ سکیں۔ اس لیے ہر زمانے میں حق پرستوں کی یہ اولین ذمہ داری ہوگی اور ان کی کامیابی کا بہت کچھ دارومدار اس امر پر ہوگا کہ وہ کس حد تک ان مراکز کے تعین میں کامیاب ہوتے ہیں۔ سطورِ بالا میں باطل کے جن مراکز کی طرف میں نے اجمالاً اشارہ کیا ہے ان کی حیثیت واقعاتی کے علاوہ علامتی کی بھی ہے۔ ایک ایسے نظام میں جہاں ہر طرف باطل کا دور دورہ ہو' جہاں انتہائی کوششوں کے باوجود حق پر چلنا اور اس پر قائم رہنا ناممکن بنادیا گیا ہو اور جہاں حق کو ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ قلعوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہو' باطل کو محض ان چند مراکز تک محدود سمجھنا سادہ لوحی ہوگی۔ ان علامتی قوتوں کی حیثیت ان فوجی دستوں کی ہے جو دشمن کو فاتح تصور کرلینے کے بعد بھی اپنی کوششوں سے باز نہیں آتے اور آخری لمحے تک اپنی سازشیں جاری رکھتے ہیں۔ انقلابی دعوت کے نتیجے میں جو تبدیلی آئے گی اس سے باطل کے کمزور مظاہر تو یقیناً خود بخود ختم ہوجائیں گے البتہ ان مراکز پر منظم طاقت ور حملوں کی ضرورت

ا کسی بھی نظریے کے مبلغین کے لئے یہ ایک انتہائی فطری امر ہے کہ وہ اپنی دعوت کی ترسیل کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ہو گی۔ اس وقت تک انقلاب اسلامی کا عمل پورا نہیں ہو گا جب تک کہ ان قلعوں کو پوری طرح مسمار نہ کر دیا جائے۔ اگر ان مراکز کی صحیح قوت کا اندازہ نہ لگایا گیا' ان کے سدباب کی کوشش نہ کی گئی تو عین ممکن ہے کہ انقلابِ اسلامی کا محل جلد ہی زمین پر آ رہے۔ باطل کے کمزور مظاہر کی غیوبت اور حق کے لیے سازگار فضا کا پیدا ہونا دراصل سطح بالا کی تبدیلی ہے۔ اس سطحی تبدیلی کو حقیقی قرار دینا اور باطل کے زندہ اور مضبوط مراکز سے صرف نظری مستحکم انقلاب کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ سید احمد شہید کی اسلامی حکومت کا فوراً روبہ زوال ہونا اس سلسلے کی اہم مثال ہے جہاں سطح بالا کی تبدیلی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے' باطل کے باقی ماندہ مراکز سے کوئی تعرض کیا گیا اور نہ ہی ان کے سلسلے میں کوئی حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ اس قبیل کی ایک دوسری دلچسپ مثال جماعتِ اسلامی پاکستان ہے۔ اس

لئے بہتر سے بہتر وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے فکر مند ہوں۔ حاملین حق میں بھی یہ بے چینی یقیناً ہو گی کہ انھیں بھی وہ تمام وسائل میسر ہوں جو باطل کے استحکام میں معاون ہیں اور اسکے لئے زمینی قوت کے با اثر طبقوں کی حمایت کا خیال آنا بھی عین فطری ہے۔ اس میں کچھ حرج نہیں کہ اسلام کا علمبردار کسی صاحب اقتدار اور صاحب مال و دولت کو دیکھ کر یہ خیال دل میں لائے کہ کاش یہ سب کچھ حق کی اشاعت میں استعمال ہو، کاش دنیا کے خزانے اس مقصد کے لئے اسے ہاتھ آ جائیں کہ خود رسول ﷺ نے سلطانا نصیراً (۱۷/۸۰) کی دعائیں مانگی ہیں۔ لہٰذا ہمارے عہد میں بھی اگر کسی کی نظر مسلم سلاطین اور امراء کی طرف اٹھتی ہے تو فی نفسہٖ یہ کوئی غیر اسلامی فعل نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک انتہائی نازک مرحلہ ہے اور اس میں ذرا سی بے احتیاطی پوری تحریک کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ حادثہ ہمارے عہد میں مختلف تحریکوں کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ حمایت کے حصول یا وسائل کی فراہمی کے سلسلے میں اس باریک نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئیے کہ کسی بھی قسم کی مشروط امداد اسلامی تحریکوں کے لئے سم قاتل ہے خواہ یہ شرائط کتنی ہی ہلکی پھلکی، بھولی بھالی اور اسلامی قسم کی ہی کیوں نہ ہوں، ان کا انجامِ کار مقصد حیات کے زیاں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ لہٰذا دعوتِ حق کے علمبرداروں کو اس عمل میں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئیے: اولاً' وسائل کے حصول میں دعوت کی تذلیل نہ ہو- اما من استغنیٰ o فانت له تصدّیٰ o (عبس:۵،۶)-داعی اور بھکاری میں یقیناً فرق ہونا چاہئیے۔ ثانیاً کسی بھی مرحلے میں داعی کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ انقلابِ اسلامی کی تحریک کسی شیخ، سلطان یا شاہ کے تعاون کی محتاج ہے، اور یہ کہ کسی ایسے تعاون سے محرومی اس کی دعوت کو ذرہ برابر گزند پہنچا سکتی ہے۔ اگر کسی مرحلے میں داعی کو ایسا گذرے تو اسے اپنی موت کا تصدیق نامہ سمجھنا چاہئیے۔

حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو باطل کے مراکز میں سے چند ایک کا ادراک ضرور حاصل ہوا تھا اور وہ وقت کے کافرانہ نظام میں ان مراکز کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اپنی تحریروں میں ان مراکز کو نیست و نابود کرنے کے ارادے کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ لیکن اس ژرف نگاہی کے باوجود جو قدرت کم لوگوں کو عطا کرتی ہے' وہ کوئی بڑی تبدیلی برپا کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ کچھ تو مولانا موصوف کا وہ غیر معمولی اصرار تھا جو شروع سے ہی انقلابِ اسلامی کی مہم میں سیاسی نظام کے قیام کو حاصل تھا' جس پر رفتہ رفتہ زور اتنا بڑھتا گیا کہ دوسرے مراکزِ کفر سے توجہ تقریباً ہٹتی چلی گئی اور کچھ وہ طریقۂ کار تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے واحد ہدف یعنی باطل کی سیاسی قوت کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے۔ حالاں کہ اسی پاکستان میں باطل کے دوسرے مراکز مثلاً تعلیمی' ثقافتی اور معاشی ادارے نہ صرف زندہ تھے بلکہ ہر لحہ باطل کے سیاسی نظام کو غذا بہم پہنچا رہے تھے۔ سیاسی اقتدار کے ان معاون اداروں پر بھی اگر اسی طرح حملے کیے جاتے تو عین ممکن تھا کہ سیاسی اقتدار بھی کچھ زیادہ دنوں تک ان حملوں کو سہار نہ پاتا۔ لیکن افسوس کہ بادیٔ النظر میں ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ساری قوت باطل کے صرف ایک مرکز کو تاراج کرنے اور اس سے نمٹنے میں صرف ہو گئی اور وہ بھی اس طرح کہ اس نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کے قیام کے بجائے کوشش کی گئی کہ اسی جسد کافری میں روحِ اسلامی پھونک دی جائے۔ لہٰذا سیاست کا سارا کاروبار اسی ڈگر پر چلتا رہا جو باطل نے متعین کی تھی' ساری مشنری اسی انداز سے حرکت میں رہی اور وہی کل پرزے روبہ عمل رہے فرق صرف اتنا ہوا کہ ان غیر منصوبہ بند کوششوں سے ایک ایسی نظریاتی مملکت وجود میں آگئی جو علی الاعلان کلمہ گو کافر ہے' جس میں کفر کی عشوہ و ادا بھی ہے اور سادہ لوح اللہ والوں کی تسلی کا سامان بھی۔

باطل کو اسلامیانے کی کچھ ایسی ہی کوشش ہمارے زمانے میں Islamization کی مہم کے نام سے جاری ہے۔ مسلم دنیا میں پچھلی نصف صدی میں جو تھوڑی بہت بیداری آئی ہے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہیں اپنے سرمایوں کی گمشدگی کا احساس پیدا ہوتا اور عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے بہت کچھ کرنے کا عزم بھی۔ نئی بیداری اپنے ساتھ وافر سرمایہ بھی لائی تھی۔ صحرائے عرب کے مسلمان جو کبھی وسائل کا رونا روتے تھے' جن کے دلوں میں اس بات کی شدید خواہش موجود تھی کہ کاش انہیں وسائل مہیا ہوتے

تو اسلام کی اشاعت میں لگا دیتے اور اسلام کی عظمت و شوکت دوبارہ دنیا میں قائم کر ڈالتے۔ اب اللہ نے یہ سب کچھ کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ مخلصین کا ایک قابل ذکر گروہ اس کام میں تندہی سے لگ گیا، یوروپ اور امریکہ کے قابل ذکر شہروں میں اسلامی ادارے قائم ہوئے، مساجد تعمیر کی گئیں، اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جس کسی نے بھی جو کچھ کام کرنا چاہا اس کی کھلے دل سے مدد کی گئی۔ یہ سب کچھ بلاشبہ نہایت خلوص سے ہوا لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسائل کی اس فراوانی اور بے شمار اسلامی اداروں کے قیام کے باوجود غلبۂ اسلام کا تصور ایک مقدس خواب رہا، کوئی قابل ذکر عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس افراتفری کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ جس کسی کو باطل کے جس مرکز کا سراغ لگا اس نے اپنی توجہ اسی طرف مرکوز کر دی، اسی طریقۂ عمل کے ساتھ جو باطل کو یکسر نیست و نابود کرنے اور اس کی جگہ حق قائم کرنے کے بجائے باطل کو کلمہ پڑھانے پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا علم کو اسلامیانے کی مہم چلی، مسلم ثقافت پر کچھ علمی سرمایہ تیار ہوا اور بظاہر کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے دور حاضر کی چند بڑی علمی قوتیں پھر سے مشرف بہ اسلام ہو گئی ہیں۔ اس خلط مبحث اور پراگندگی فکر سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلام ایک الٰہی پیغام کے بجائے مسلم قوم کے مذہب کی حیثیت سے سامنے آیا، ایک ایسا اسلام جو مسلم قوم کے سرمائے کا محافظ تھا، جو مسلمانوں کے عروج کی بات کرتا تھا اور جس نے مغرب کو ہر اعتبار سے اپنا دشمن تصور کر لیا تھا۔ ایک ایسے اسلام میں باشندگان مغرب کے دلوں کی تسخیر کا کچھ بھی سامان نہ تھا، یہ دلوں کے دروازے کھولتا نہیں بند کرتا تھا۔ مغرب کا انسان الٰہی نظام سے جس شدید انحراف کی راہ پر گامزن تھا اور الٰہی پیغام سے جس زبردست محرومی کا شکار تھا، اس صورتِ حال کا عین تقاضا تھا کہ حاملین حق اسلام کی اشاعت میں سرگرم ہو جاتے اور ساری توجہ گمراہ انسانیت کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر میں صرف کر ڈالتے کہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قلیل مدت میں مغرب کے صنم خانوں سے کعبہ کے پاسبانوں کی ایک بڑی تعداد کا فراہم ہونا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ لیکن ان اداروں نے اصل فریضے سے صرف نظری کی اور اپنی قوت کا خاصا بڑا حصہ Academic Islam کی خدمت میں صرف کر دیا۔ اس قسم کی علمی معرکہ آرائیوں کی یقیناً بہت کچھ اہمیت ہے لیکن ان ممالک میں جہاں الٰہی پیغام سے انسانوں کی قابل ذکر آبادی اب بھی ناآشنا ہے، یہ طریقہ اصل کام سے توجہ ہٹاتا اور ٹھنڈے اسلام کی

خدمت کا ہنر سکھاتا ہے۔ حالاں کہ دعوتِ اسلامی ایک ایسا ہمہ گیر انقلابی عمل ہے جو بڑی سے بڑی قوت کی لمحوں میں تسخیر کر لیتی ہے، انتہائی کار آمد ذہن اس انقلابی پیغام کے لیے لمحوں میں اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں۔ یہ حمزہؓ جیسا شجاع ساتھ لاتی ہے اور عمرؓ کا جاہ و جلال بھی اس کے کام آتا ہے۔ سیاہ فام مجاہدین کی عسکری قوت بھی اسے حاصل ہوتی ہے اور تاتاریوں کی خون آشام تلواریں جو اس کے خاتمہ کے لیے نکلی تھیں اسی دعوت کے ذریعہ اس کی محافظ بن جاتی ہیں۔ لہٰذا مسلم اقلیت کے ممالک میں دعوتِ اسلامی کے کام سے صرفِ نظر کرنا اور مسلمانوں کے قومی یا فقہی اسلام کی حفاظت کے لیے چھوٹے چھوٹے قلعے بنانا نہ صرف یہ کہ غیر دانشمندانہ فعل ہے بلکہ اسلام کی عظیم الشان نظریاتی قوت اور اس کی قوتِ تسخیر کا انکار بھی۔

ہندوستان میں حقیقی اسلامی معاشرہ کا قیام ملک کی قابل ذکر اکثریت کے قلوب کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ اگرچہ اسلامی معاشرہ کا قیام اقلیت یا اکثریت کی اصطلاحوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسلامی نظام کے تحت زندگی جینے کی مبارک خواہش کو کسی ایسی مصنوعی شرط کے تابع نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی حق پرست اس بات کے مکلف ہیں کہ زور زبردستی یا اس جیسے کسی اور مصنوعی طریقے سے ضرور ہی اہل ملک کو کلمہ گویوں کی صف میں لا کھڑا کریں۔ لیکن جب تک الٰہی پیغام کی ترسیل کا حق ادا نہیں ہوتا اور جب تک حجت تمام نہیں ہوتی، غافل انسان کو مشرک اور کافر تصور کر لینا یا قومی سرمایہ کی حیثیت سے اسلام کی حفاظت کرنا دراصل اپنے خول میں بند ہونے کے مترادف ہے انبیائی مشن سے اس حکمت عملی کو دور دور کا کوئی علاقہ نہیں۔

ہندوستان کے سیاسی جغرافیے پر ایک نظر ڈالیے۔ شمالی ہند کے مخصوص علاقوں اور جنوبی ہند کی چند ساحلی ریاستوں کے علاوہ اللہ والوں کا نام و نشان خال خال ہی ملتا ہے۔ گویا ملک کا ایک بہت بڑا حصہ بالخصوص مرکزی ہندوستان اللہ کے پیغام سے مکمل غفلت میں زندگی گزار رہا ہے۔ حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے اہم علاقوں میں اللہ والوں کی موجودگی کے باوجود اب تک ملک کی بڑی آبادی پر غفلت کا ماحول کیوں طاری ہے۔ شمالی ہند شروع سے ہی فاتحین اور حملہ آوروں کی گذرگاہ رہا ہے، یہاں مسلم حکمرانوں اور سلاطین کی براہِ راست کشمکش مقامی اقتدار سے ہوتی رہی ہے اس لیے فطری طور پر

یہ علاقہ خاصا نازک ہے' یہاں اس بات کے زیادہ مواقع ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فضا مسموم کر دی جائے اور حاملین حق کا راستہ حربی اور افرادی قوتوں سے روک دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس جنوب میں آج بھی دعوتِ اسلامی کے منظم کام کے لیے ماحول خاصا پرسکون اور امید افزا ہے۔ انتہائی قلیل آبادی کی وجہ سے چوں کہ مسلمانوں کو اس کا موقع کم ہی ملا ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آوازیں بلند کریں' یا خود کو ایک مقابل فریق کی حیثیت سے غیر مسلموں کے سامنے پیش کریں' اس لیے جنوب کی غیر مسلم اکثریت (استثناء چند مسلم مراکز کے) اسلام کے اس ایڈیشن سے واقف نہیں ہے جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے قومی تعصب کے استحکام کا سامان کرتا ہے۔ اسلام سے متعلق یہاں غلط فہمیاں بھی کم ہیں اور اس دعوت کو سننے کے لیے ان کے دل بھی نسبتاً زیادہ کھلے ہیں۔ شمالی ہند میں بھی دعوتِ اسلامی کے مواقع کچھ کم نہیں البتہ یہاں ایک بالکل ہی مختلف طریقۂ عمل کی ضرورت ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کا کام کسی بھی زمانے میں منظم اور منصوبہ بند طریقہ سے نہیں ہوا ہے خواہ وہ مسلم حکمرانی کا عہد ہو یا اقتدار سے محرومی کے بعد کا زمانہ۔ جس کسی فرد' جماعت' تحریک یا سلطان کو توفیق ہوئی اس نے اپنے طور پر اپنی وسعت اور فہم و بصیرت کے مطابق تبلیغ کا کام کیا۔ اسلام کی نظریاتی قوت کا یہ بھی ایک عجیب و غریب معجزہ ہے کہ ان انفرادی اور غیر منظم کاوشوں کے نتیجے میں برصغیر میں اسلام کا نام لینے والی دو مسلم ریاستیں پاکستان اور بنگلہ دیش موجود ہیں اور خود ہندوستان میں دوسری بڑی اکثریت اسلام کا دم بھرتی ہے۔ اگر ان غیر منظم کوششوں کے نتیجے میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے تو بھلا ایک منظم اور منصوبہ بند طریقۂ تبلیغ سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص ایک ایسے وقت میں جب خود ہندوؤں کی سب سے بڑی اکثریت ذات پات کے غیر انسانی حصار سے آزاد ہونے کے لیے بے چین ہے اور جب ملک اپنے اخلاقی دیوالیہ پن کی وجہ سے ہمہ گیر روحانی نظام کا شدت سے طالب ہے۔ لیکن افسوس کہ اس وقت الٰہی پیغام کے حاملین کا کوئی ایسا گروہ اس سرزمین پر موجود نہیں ہے جس پر غافل انسانیت کو جہنم سے بچانے کی فکر سب سے مقدم ہوتی اور جو اس سرزمین سے محبت میں اتنا آگے ہوتا کہ اس کے کارواں کا رخ الٰہی اصولوں کی طرف موڑ دیتا جو باشندگانِ ملک کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت دے سکتا۔

بعض لوگ غلبۂ اسلام اور تبدیلیٔ مذہب جیسی اصطلاحوں سے خوف کھاتے ہیں' شش! آہستہ بولو'کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا' ان بے چاروں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے' مارے دہشت کے عقل گم' نگاہ حیران۔ تم اتنی خطرناک باتیں کیوں کرتے ہو؟ کیا تمہیں ہندوستان کی صورتِ حال کا کچھ بھی اندازہ نہیں؟ کیا تم ہمیں زندہ رہنے دینا نہیں چاہتے؟ آخر کیوں اس دکھ بھری آہ و کراہ کی زندگی کو بھی مزید مشکل بنائے دے رہے ہو۔ تبدیلیٔ مذہب اور غلبۂ اسلام کے الفاظ کچھ اسی قسم کی کیفیات پیدا کرتے ہیں حتیٰ کہ ان لوگوں پر جو علی الاعلان کلمہ گو ہیں اور جو اسلام سے اپنی وابستگی کا دم بھرتے نہیں تھکتے۔ میرے خیال میں ایسے تمام لوگ جو غلبۂ اسلام کے نام سے دہشت زدہ ہیں' جو اس مہم میں اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ نہیں ہیں اور جو ملک کی غافل اکثریت تک صرف اس لیے اسلام کی دعوت پہنچانا نہیں چاہتے مبادا یہ ان کی اپنی مصیبتوں میں اضافے کا باعث ہو اور جو ٹھنڈے ٹھنڈے اسلام کے خادم کہلانے اور سکون کی نیند سونے کے عادی ہیں' دراصل یہ تمام حضرات بدترین قسم کے نفاق کا شکار ہیں۔ اگر ہمارا واقعی یہ ایمان ہے کہ اسلام دنیا و آخرت میں کامیابی کا واحد طریقۂ عمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے غافل بھائیوں کے لیے یہ بے چینی ہمارے دلوں میں پیدا نہ ہو کہ کاش یہ کسی طرح اس خسارے سے بچ سکیں جو غفلت کی زندگی کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ خواہ ایسا کرنے میں ہمارا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو اور خواہ ایسا کرنا ہماری گردنوں کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔

پیامِ ربانی اسی وقت اپنی تمام ترسحر انگیزیوں کے ساتھ سامنے آئے گا اور غیر مسلموں کے لیے اس میں اسی وقت دلچسپی پیدا ہوگی جب اس کے ماننے والے اپنی تمام تر گروہی اور جماعتی عصبیتوں سے اوپر اٹھ کر اسے خالص اللہ کے لیے قبول کر سکیں' جب وہ اپنی تمام تر منفعتوں سے بے پروا ہو کر اسلام کی خاطر اپنا ذاتی اور گروہی نقصان بھی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مثل اس آیت کے "اے ایمان والو! اللہ کے لیے حق کی شہادت دینے والے بنو اور کسی قوم کی مخالفت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔" اس امر کو ہر حال میں مقدم رکھتے ہوئے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے ایمان والو! حق کے برپا کرنے والے بنو' اللہ کے لیے گواہی دیتے رہو' اگرچہ یہ تمہارے اور تمہارے والدین اور اقرباء کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔"

دوسروں کے لیے مرنا اور اپنے لیے کچھ طلب نہ کرنا' زندگی کی ساری دوڑ دھوپ کا مقصد دوسروں کی دنیاو آخرت کی فکر قرار دینا' ہر لمحہ انسانیت کو تباہی کے عذاب سے بچانے کے لیے سرگرداں رہنا' اپنی زندگی کی قیمت پر دوسروں کی زندگی کا سامان کرنا ایسا زبردست انقلابی عمل ہے جس کی قوتِ تاثیر اور سحر انگیزی کا بیان ممکن نہیں۔ بھلا ایک ایسے گروہ کے زورِ بازو سے کون انکار کرسکتا ہے جس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کی فلاح و بہبود ہو' جو دوسروں کے لیے سب کچھ اور اپنے لیے کچھ بھی طلب نہ کرتا ہو۔ بھلا کس توپ و تفنگ میں یہ قوت ہے کہ اس زبردست اخلاقی اور روحانی قوت کا زور توڑ سکے۔ اس نظریاتی حیثیت کی بحالی سے امت کے بے شمار قومی اور گروہی مسائل اپنی اہمیت کھودیں گے یا خود بخود حل ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ رویے کی یہ تبدیلی اسباب و علل کی دنیا میں بھی حالات کو متاثر کیے ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی: ”اے رسول! تم پر تمہارے رب کی طرف سے جو اتارا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو' اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرضِ رسالت کو ادا نہ کیا' اللہ لوگوں کے شر سے تمہاری حفاظت کرے گا۔“ (مائدہ:٦٧)

بد قسمتی سے پچھلی چند دہائیوں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ بڑی حد تک مسلم قومی افتخار اور اقلیتی گروہی عصبیت کی پروردہ ہے۔ یہ ایک قوتِ ارتکاز unifying force تو ضرور ہے لیکن مسلمانوں کے گروہی مفادات کی حفاظت کے واسطے۔ یہ کچھ اسی کج روی کا اثر تھا کہ مختلف اشاعتی ادارے اور جماعتیں بھی اسلام کو مسلمانوں کے ایک اہم تہذیبی ورثے کی حیثیت سے آگے بڑھ کر پیش نہ کرسکیں۔ قومی افتخار کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ عباسی بغداد اور مسلم اسپین کو اسلام کی برتری کا زریں دور تسلیم کرلیا گیا اور ظالم و جابر مسلم حکمرانوں کو بھی اسلام کا نمائندہ تصور کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی گئی' ان کی ساری پراگندگیٔ فکر و عمل کو اسلامی تہذیب کا درخشاں باب تسلیم کرلیا گیا۔ بھلا ایک ایسے گروہی اسلام میں غیر مسلموں کے لیے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کی اقلیتی حیثیت مزید واضح ہوگئی تھی اس بات کا امکان تھا کہ شاید اب مسلمان سابقہ قومی روش سے باز آئیں اور ایک نئی نظریاتی زندگی کا آغاز کریں۔ یہ بات اب ہر کسی کی سمجھ میں بآسانی آرہی تھی کہ محض ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے جینے کا حق مانگنا نہ صرف

آخرت میں خسارے کا سودا ہے بلکہ دنیا میں بھی یہ طریقہ آہوں اور کراہوں کے علاوہ کچھ نہیں دلا سکتا۔ کمزور کو روٹی کا جو ٹکڑا ملے گا وہ اس کی تسلیم شدہ حیثیت سے بھی کہیں کم تر ہوگا۔ فکری طور پر مسلمان اس کمتر حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ ہی نظریاتی سطح پر انہوں نے کبھی ایسا کیا البتہ عملی طور پر لڑائی روٹی کے اسی حقیر ٹکڑے پر ہوتی رہی۔ چند انجمنوں اور تنظیموں نے دعوتی گروہ کی حیثیت پر اصرار کیا بھی تو ان بے چاروں کے ہاں اسلام کے اس انقلابی لب و لہجہ کا فقدان تھا جس کا غیر مسلموں میں دعوتِ اسلامی کا کام شدت سے طالب تھا۔ چوں کہ دعوت کی ترسیل میں مخاطب گروہ کے نظریات و تعصبات اور اس کی نفسیاتی دشواریوں کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اس لیے نتیجہ بہت امید افزا نہ رہا۔ دوسری طرف گروہی اور قومی تعصبات کی بے دلانہ نفی کے نتیجے میں مسلمانوں کی ناراضگی بھی ان انجمنوں کے حصے میں آئی۔ ایک طرف مطلوبہ نتیجے کا فقدان اور دوسری طرف اپنی قوم سے علیحدگی کا خوف' یہ ایسے عوامل تھے جس نے جلد ہی ان گروہوں پر مایوسی کا ماحول طاری کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان انجمنوں نے بھی گروہی تعصب کے مقدس محل میں عافیت کا بپتسمہ قبول کر لیا۔

امتِ مسلمہ ہند کے فکری انحطاط اور نظریاتی دیوالیہ پن کے باوجود الحمد للہ پچھلی دو تین دہائیوں میں ملک کی مختلف علاقائی زبانوں میں اسلام پر خاصا مواد منتقل ہو چکا ہے' قرآن مجید کے تراجم' احادیث کے مختصر مجموعوں کی اشاعت اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر قابل ذکر سرمایہ مختلف زبانوں میں دستیاب ہے۔ یقیناً یہ ایک گراں قدر کارنامہ ہے۔ قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ نے اس کام کی سعادت بخشی۔ گویا چند علاقائی زبان کی حد تک تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس کسی کا دل حق کی طرف آمادہ ہو اس کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان ان زبانوں میں موجود ہے۔ لیکن اگر "ادع الیٰ سبیل ربك بالحكمة" کا قرآنی کلیہ بھی ہمارے پیش نظر ہو تو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ جدید متکلمین اسلام کا تیار کردہ یہ سارا سرمایہ حکمتِ تبلیغ کے اس اہم قرآنی کلیے سے بڑی حد تک خالی ہے۔ چوں کہ بنیادی طور پر یہ تحریریں اردو یا دوسری زبانوں سے ترجمے ہیں جو مسلم ذہن کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں اس لیے فطری طور پر ان میں غیر مسلم ذہن کو اپیل کرنے اور ان کے دلوں کی دنیا ڈانوا ڈول کر دینے کا خصوصی ملکہ نہیں ہے' نہ تو ان میں غیر مسلموں کی نفسیاتی دشواریوں کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ

ہی ان اوہام و تصورات پر ضرب لگائی گئی ہے جس کا ہندوستانی مذاہب کے حاملین میں پایا جانا عین فطری ہے۔ اثر انگیزی کی وہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے جسے سحر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انقلابی پیغام کو انقلابی الفاظ میں منتقل کرنے کے لیے اس بات کی اولین ضرورت ہے کہ مصنف مخاطب کے ذہن اور اس کے تہذیبی اور معاشرتی سرمائے سے بھی بخوبی واقف ہو تاکہ مخاطب کی نفسیاتی اور روحانی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکمت کے ساتھ دین کی تبلیغ کر سکے۔

گویا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو غیر مسلم اکثریت کی مختلف علاقائی زبانوں میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر علمی اور اشاعتی سرمایہ تیار کیا جائے جن میں اوپر بتائے گئے اصولوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہو۔ یہ جدید اشاعتی سرمایہ اسلام کو ہندومت کا متحارب تصور کرنے کے بجائے اسے عالمی مذاہب کے ایک جز کی حیثیت سے دیکھے اور اس کے ہمدردانہ مطالعہ کے نتیجے میں اسلام کو ایک حتمی اور آخری الٰہی پیغام کی حیثیت سے متعارف کرائے۔ خطاب اس زبان اور اس لب و لہجہ میں کیا جائے جس سے مخاطب بخوبی واقف ہو اور جس کے درمیان داعی حق کی خدمت کے لیے مامور ہوا ہو: "اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ ان پر اچھی طرح حق واضح کر سکے۔" داعی رائج زبان میں کلام کرے اور اسے اپنی شان کے خلاف ہرگز نہ سمجھے کہ اس کے پیش نظر غافل انسانیت کو راہِ راست پر لانا ہے' اس تک خدا کا پیغام ممکنہ حد تک واضح طور پر پیش کرنا ہے۔ نہ اپنی زبان دانی کا دھونس جمانا مقصود ہے اور نہ ہی لسانی اور گروہی افتخار کا سامان بہم پہنچانا مطلوب ہے۔ یہ حقیقت خواہ کسی کو کتنی ہی تلخ کیوں نہ لگے' ہے یہ بہر حال حقیقت کہ ہندی شمالی ہند میں بڑی حد تک اکثریت کی زبان بن چکی ہے۔ سمعی اور بصری ذرائع ابلاغ نے اسے موجودہ ہندوستان کی سب سے مؤثر اور متحرک زبان بنا دیا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے داعیانِ اسلام کو چاہیے کہ اس زبان کو دعوتِ اسلامی کے لیے سازگار کریں اور پوری قوت سے اس زبان اور اس کے بظاہر غیر اسلامی اسالیب و آہنگ کو اسلام کی خدمت کے لیے بروئے کار لائیں۔ اردو کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے' لیکن اردو کی محبت میں ہندی سے نفرت کو جزو ایمان جاننا مسلم گروہ کو ایک فریق کی حیثیت سے تو پیش کر سکتا ہے' غافل انسانیت کے غم گسار و دردمند کی حیثیت سے نہیں۔

ملک کی ۸۳٪ آبادی کے لیے مطبوعہ صفحات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس لیے محض اسلام پر تحریری اشاعتی سرمایہ تیار کر دینا اکثریت کے فکر و نظر میں کسی بڑی تبدیلی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس عظیم اکثریت تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے ان تمام وسائل ابلاغ کا استعمال کرنا ہوگا جو باطل کی اشاعت کے لیے رائج ہے' وسائل ابلاغ کے تعین میں داعی کا طرز فکر کس قدر جدید ہونا چاہئے اس کا اندازہ رسولِ مقبول ﷺ کے طریقۂ تبلیغ سے ہوتا ہے۔ قدیم عرب میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب کسی کو کوئی اہم اطلاع دینی ہوتی تو وہ صفا کی چوٹی پر برہنا آتا' آوازیں لگاتا اور اہل مکہ اس کی بات سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ آپؐ نے بھی اس مروجہ طریقۂ ترسیل سے فائدہ اٹھایا فرق صرف اتنا ہوا کہ آپ نے برہنگی کی روایت کو قبول نہ کیا۔ گویا موجودہ نظامِ تبلیغ کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اسلام کی اشاعت میں اس کا استعمال کرنا عین سنت نبویؐ ہے۔ سردارانِ قریش کی دعوت اور اس موقع پر اسلام کا تعارف' حج کے موسم میں قبائلی سرداروں سے ملاقاتیں' عرب کے بازاروں اور میلوں میں جہاں شعر و ادب کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں' اسلام کی دعوت مختلف سربراہانِ مملکت کے نام رسولِ مقبول کے خطوط دراصل اسلام کی اشاعت کے لیے مروّجہ ذرائع ابلاغ کے استعمال پر دلالت کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ کے جو جدید ذرائع حاصل ہیں بالخصوص سمعی اور بصری طریقۂ ترسیل' ان کو جب تک بروئے کار نہ لایا جائے نہ تو اسلام کی اشاعت کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ ہی منظم باطل کا زور توڑا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ملک میں کم از کم ایک ایسا مرکزی ادارہ ضرور ہو جو ملک کی مختلف زبانوں میں اسلام کا تعارف بذریعہ مطبوعہ صفحات اور سمعی و بصری تکنیک اہل ملک تک مفت پہنچانے کا انتظام کر سکے۔ جو ایک زبردست منصوبہ بندی کے تحت اسلام کی خالص انقلابی دعوت کی' جدید ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لاتے ہوئے' اہل ملک پر بارش کر سکے۔ جو اس طریقۂ کار کے اثرات و عواقب سے باخبر بھی ہو تا کہ ان تجربات کی روشنی میں مستقبل میں اس پروگرام کو مزید اثرانگیز بنایا جانا ممکن ہو۔

ملک میں مختلف تنظیمیں' تحریکیں اور ادارے غیر اسلامی اور اسلام مخالف انقلاب کے لیے سرگرمِ

عمل ہیں۔ ضرورت ہے کہ انبیائی مشن کے نئے منصوبے کے حاملین ان سرگرمیوں سے نہ صرف پوری طرح باخبر رہیں بلکہ مختلف علاقوں میں پروگرام کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ ان مخصوص علاقوں میں اسلام کے بارے میں لوگوں کا ذہن کس طرح اور کس حد تک مسموم کیا جاچکا ہے اور یہ کہ ان مخصوص علاقوں میں دعوتِ اسلامی کس طریقۂ کار کی طالب ہے۔ اس بات کا علم کہ باطل کہاں، کس طرح اور کس حد تک متحرک ہے نہ صرف بہتر منصوبہ بندی کے لیے مفید ہے بلکہ حقیقت پسندانہ خود احتسابی کے لیے بھی معاون ہے۔

اگر ہم ملک کی صورتِ حال میں واقعی کوئی بڑی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو دعوتِ اسلامی کے عمل میں اسی درجے کی شدت اور اس عمل میں اسی انقلابی روح کی ضرورت ہوگی جس کا مظاہرہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے کیا تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ زندگی کے سارے کام معمول کے مطابق جاری رہیں، حصولِ دنیا کی دوڑ دھوپ میں دیوانگی کا یہی عالم ہو، دنیا کی آسائشوں سے بھی متمتع ہو رہے ہوں اور دوسری طرف احساسِ مسلمانی کے تحت کچھ دین کا کام بھی جاری رہے۔ اوراد و وظائف کا سلسلہ ہو، اجتماعات اور نشستوں میں شرکت ہو، درس قرآن اور درسِ حدیث کا غلغلہ سنائی دے، بے روح تنظیمی اور جماعتی رسوم میں شرکت کا ذوق و شوق ہو۔ گویا صرف اپنی روزی روٹی سے غرض رکھنے والوں کو کوٹھی بنگلوں کی دوڑ دھوپ سے اگر کچھ وقت بچ رہے تو اسے انقلابِ اسلامی کی بے روح سرگرمیوں میں گزار دیں۔ اس بے روح طریقۂ عمل سے ماضی میں کوئی انقلاب برپا ہوا ہے اور نہ ہی مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے۔ نئے منصوبے کے حاملین پر یہ لازم ہے کہ اسلامی دنیاداری کی اس پٹی ڈگر پر چلنے کے بجائے انقلابی انبیائی اصولوں پر ترتیب زندگی کو پھر سے منظّم کریں۔ ایک ایسی زندگی جینے کا عزم جو انقلابی مہم میں شرکت کو اپنا مقصود گردانتی ہو، جو دعوت اسلامی کو بنیادی انسانی ضروریات کی فکر پر بھی مقدم جانتی ہو۔ جہاں فکر و عمل کا محور و مرکز انقلابی منصوبہ قرار پاتا ہو۔ دنیا کمانے اور دنیا جینے کا کام فکری اور عملی ہر دو اعتبار سے ثانوی حیثیت اختیار کر گیا ہو۔ یہ لازمی شرط ہے ان حاملین حق کے لیے جن کے دل غلبۂ اسلام کی شدید خواہش سے مچلے جاتے ہوں اور جو اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان داعیانِ حق کو ایسی ضروری تربیت فراہم کی جائے

جو اس اہم کام میں ان کی معاون ہو سکے اور جو باطل کو مار گرانے کی وہ انقلابی بصیرت پیدا کر سکے جو انبیائی تحریکوں کا امتیازی وصف ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اہتمام ہو کہ ایک مرکزی نظم کے تحت مختلف علاقوں میں ان کی مساعی کو بروئے کار لایا جائے تاکہ یہ انفرادی عمل بننے کے بجائے ہمہ گیر منصوبے کا جز بن سکے۔

خلاصۂ بحث

پچھلی گفتگو سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہوگئی کہ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال میں ایک خوشگوار تبدیلی نہ صرف عین ممکن ہے بلکہ انقلابی الٰہی پیغام اور پیغمبرانہ طریقۂ کار کی موجودگی نہایت ہی قلیل مدت میں ایسا حیرت انگیز انقلاب برپا کر سکتی ہے جس کے حیرت واستعجاب کا بیان ممکن نہیں۔ وارثین حق کی یہ خوش بختی بھی ہے اور ذمہ داری بھی کہ وہ پیمبرانہ طریقۂ انقلاب کو بروئے کار لائیں اور حق کی خیر و برکت میں دوسری قوموں کو بھی شامل کرلیں۔ کام یقیناً بہت بڑا ہے اور ذمہ داری یقیناً بہت اہم ہے لیکن اس کام کے لیے آسمان سے کوئی مخلوق نہیں آئے گی' ان ہی خاک کے پتلوں میں سے چند نفوس اٹھیں گے جو اس مبارک کام کو انجام دیں گے' دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوش بختی کس کے حصے میں آتی ہے۔ حالات موافق ہیں' ملک شدت سے ایک ایسے پیغام کا طالب ہے' حاملین حق کے دلوں میں اس عظیم ذمہ داری کا احساس بھی ہو چلا ہے' خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس عہد میں جی رہے ہیں جن سے ہندوستان میں حق کی اقامت کا بہت بڑا کام لیا جانے والا ہے' وہ کام جو اللہ تعالیٰ انبیاء کرام سے لیتا رہا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال اس بات کی پیش گوئی کر رہی ہے کہ بہت جلد وارثین حق کو ایک ایسا مبارک موقع ملنے والا ہے کہ وہ غلبۂ اسلام کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر کے اللہ کے مقربین میں شامل ہو سکیں گے۔ یہ مبارک عمل ملک کی دہلیز پر دستک دے رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فیصلے کی آزمائش میں پہل کدھر سے ہوتی ہے اور کون خود کو اس انقلابی زندگی جینے کے لیے کتنا جلد آمادہ کرپاتا ہے۔ کون اللہ کے منتخب بندوں میں اپنا شمار کروانے کا یارا رکھتا ہے اور کون

محمد ﷺ کی تفویض کردہ ذمہ داری یعنی "فلیبلغ الشاھد الغائب" کا پورا پورا پاس رکھتا ہے۔ کون لذات دنیا پر آخرت کو واقعی ترجیح دیتا ہے اور کون ہیں وہ لوگ جن کو خدا کی مددگاری کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔

اے غلبۂ اسلام کے آرزومندو! تمہاری خوش بختی پر رشک آتا ہے کہ تم سے عنقریب ایک کارِ عظیم لیا جانے والا ہے۔ واللہ کتنے خوش قسمت ہو تم لوگ۔ کاش! کہ تمہیں اپنی خوش بختی کا پورا پورا شعور ہو، تم سے اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع چوک نہ جائے اور کاش کہ تم اس بارے میں پہل کرنے والے بن سکو۔ اللہ تمہارے دلوں کو اس حقیقت کے لیے کھول دے۔

تمہاری موجودہ رَوِش سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر تمہارے جاہ و مال، عزیز و اقارب اور دنیا کی محبت غالب آجائے اور تم اللہ کی مدد سے منہ موڑو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈے ٹھنڈے زندگی جینے کی عادت تمہیں اس انقلابی مہم میں شرکت سے روک دے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مقدس موقع کو کھو کر تم اللہ کے مغضوبین میں اپنا شمار کروالو۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں تمہاری پست ہمتی اور شکست خوردگی انبیائی مشن کے نئے منصوبے کی ناکامی کا باعث نہ بن جائے۔ لاقدر اللہ۔

یہ اندیشے اس لیے بجا ہیں کہ تمہاری اخلاقی اور روحانی زندگی زبوں حالی کی وحشت ناک داستان بن چکی ہے، تمہاری ایمانی زندگی پر مدتوں سے موسم بہار نے کرم فرمائی نہیں کی۔ روح کی دنیا ویران ہے، قافلہ رخصت ہو گیا البتہ صدائے جرس اب بھی سنائی دے رہی ہے، مدت ہوئی مرکر جینے کی لذت سے تمہارے حواس ناآشنا ہیں۔ تمہاری زندگی کے آبشار میں سکون ہے، تعفن ہے، آوازیں تو اب بھی سنائی دیتی ہیں مگر یہ آبِ روانِ زندگی کی نہیں تمہارے آہوں کراہوں کی مکروہ آوازیں ہیں۔ یہ کسی بدروح کا سایہ نہیں مثل موت جینے کی تمہاری اپنی خواہش کا فطری نتیجہ ہے۔ کاش کہ تمہیں اب بھی ان غلطیوں کا احساس ہو سکے اور کاش کہ تم ان لوگوں میں شامل ہو سکو جو کہتے ہیں :

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ٥

تمہاری مثل اس گلّے کی ہے جس کا چرواہا کھو یا گیا ہو، جو کسی نگراں اور محافظ سے محروم انتشارِ عمل اور انتشارِ راہ کا شکار ہو۔ قیادت، امارت اور اجتماعیت کی زندگی تم نے بالکل ہی بھلادی، اپنے خول میں

جی جی کر مرتے اور خوش رہتے ہو۔ شترگر بگی تمہارا قومی شعار بن چکا ہے۔ تمہارے علماء زبردست ذہنی اور علمی افلاس میں مبتلا ہیں' نئے زمانے کی نئی باتیں ان کی فہم سے بالا بالا گزر جاتی ہیں' استعماری قوتوں کے نئے ہتھکنڈے' نئی سازشیں' نئے منصوبے ان کی دسترس سے باہر ہیں' ساری اسلامی فتوحات اور علمی معرکے مدارس کی چہار دیواروں تک محدود ہیں جہاں اب بھی عہدِ وسطیٰ کا ماحول طاری ہے۔

تمہارے سرمایہ دار دنیا کی دوڑ دھوپ میں اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ ان کا تعلق کسی نظریاتی گروہ سے ہے اور وارثینِ حق کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ غلبہٗ حق کے لیے اپنی سرمایہ کاری کو ایک منصوبہ بند طریقے سے استعمال میں لانے اور اس راہ میں وقتاً فوقتاً بڑی بڑی قربانیوں کے مظاہر یہاں بھی مفقود ہیں۔ حالاں کہ دنیا کی فنا کے مظاہر ان کے سامنے باربار آتے ہیں' آگ وخون کے معرکے چند لمحوں میں غنی کو محتاج اور مال دار کو فقیر میں تبدیل کر دیتے ہیں' انہیں اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ دنیا کی دوڑ دھوپ کا یہ کاروبار چند لمحوں میں تباہ ہو سکتا ہے' سکون کی زندگی جینے کے یہ مظاہر پلک جھپکتے رخصت ہو سکتے ہیں' یہ سارا سامانِ تعیش منٹوں میں ہوا ہو سکتا ہے۔ یہ گھڑی غیر معین سہی' نامعلوم سہی' عین ممکن ہے' لیکن اس شدید احساس کے باوجود' ان میں سے کم ہی ایسے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنے مال کو محفوظ کروانے کی بصیرت رکھتے ہوں' جن کی سرمایہ کاری صرف اللہ کے لیے ہو اور جو غلبہٗ اسلام کی مہم کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر تعاون دینے کا یارا رکھتے ہوں۔

کچھ یہی حال تمہارے مستقبل پرست (Careerist) نوجوانوں کا ہے۔ جن کی کوتاہ اندیشی چند روزہ زندگی کے حصول کو کیریر قرار دے بیٹھی ہے۔ آخرت کی دائمی اور واقعی زندگی کا تصور ان کے دل و دماغ سے محو ہو چکا ہے۔ ساری دوڑ دھوپ کا محور و مرکز یہ ہے کہ روٹی کے حقیر ٹکڑوں میں کچھ زیادہ حصہ مل سکے خواہ اس کے لیے اصل متاعِ حیات ہی ہاتھ سے کیوں نہ جاتی رہے۔ کاش کہ تمہیں اس حقیقت کا ادراک ہوتا کہ یہ شکم شکم زندگی دراصل تمہارے نظریاتی وجود کی موت کا سامان ہے جس کے بعد شاید تم زندگی کا کوئی جواز پیش نہ کر سکو۔ تمہارے اہلِ ثروت لوگوں کے لیے ساری وفاداریوں سے مقدم رزق کے فانی مظاہر ہیں۔ غلبہٗ اسلام جیسی خطرناک مہم میں شرکت ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سرکاری ملازم ہیں' باطل کے تعمیر کردہ نئے رزاق خداؤں کی ناراضگی مول لینے کا ان میں یارا

نہیں۔ افسوس کہ تم باطل کی چاکری میں اس حد تک آگے جا چکے ہو کہ علی الاعلان حق سے منہ موڑتے ہو۔ یہ سب کچھ روٹی کے ان چند ذلیل ٹکڑوں کے لیے جس نے (تمہارے دریاؤں کے دل دہلانے دینے والے وجود کو فقط) گوشت پوست کے ناکارہ ٹکڑے میں تبدیل کر دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس شدید ترین زوالِ فکر و عمل کے باوجود آخر کس منہ سے تم اب بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا دم بھرتے ہو۔

افسوس کہ تمہارے مسیحاؤں پر کہ جنہیں تم اپنی زوالِ فکر و نظر کے باعث مسیحا سمجھ بیٹھے ہو' نزاع کی دردناک کیفیت طاری ہے۔ اخلاقی اور روحانی خرابیوں میں یہ تم سب سے بھی بڑھ کر ہیں' نفاق بونا اور آپس کے جھگڑوں میں اپنی گردن اونچی کیے رکھنے کا شوق ان میں سے ہر کسی کا واحد سرمایہ ہے' کاش کہ انہیں اس بات کا احساس ہو تاکہ بھیڑ میں اونچی گردن ہی سب سے پہلے کٹتی ہے' لیکن مدت ہوئی تم اس عمل سے دور ہو گئے' یہ مقدس باتیں ماضی کا فسانہ ہیں۔

دینی تنظیموں کا کس بل نکل چکا ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے مایوسی ان کا کل سرمایہ ہے۔ ساری کوشش اپنے خول میں جئے جانے کی ہے۔ گروہی اور تنظیمی حصار سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے' دنیا کی محبت کا یہاں بھی غلبہ ہے۔

اے الٰہی پیغام کے وارثو!

یقین جانو صورت حال انتہائی سنگین ہے۔ چہار طرف سے مایوسی اپنی حصار تنگ کیے دے رہی ہے۔ مہلک اندیشے پریشان کیے دیتے ہیں' بھلا اس تباہ حالی اور پریشان خصالی میں غلبہ اسلام کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے؟ اندھیرا اتنا سخت ہے کہ اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو آنکھیں بصارت کھو دیں' ذہن ماؤف ہو جائے' انسانی وجود ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے۔

بشارت!

کہ ایک نئی صبح شبِ تاریک کے در پر دستک دے رہی ہے۔ میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اس بظاہر مایوس کن ماحول میں بھی تمہاری قابل ذکر اکثریت ایک ایسے شخص کے انتظار میں بیٹھی ہے جو

اپنے قول وعمل سے ان کے اندر رضائے الٰہی کا شدید داعیہ پیدا کردے گا۔ انتظار ہے! سخت انتظار ہے! شدید انتظار ہے! ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں' عامۃ الناس کی اکثریت اسلام کے غلبہ اور اللہ کی رضا کے لیے اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

اسی امید پر اس مقدس عمل میں ایک کمزور گنہگار مسلمان کی حیثیت سے اپنی شرکت کے لیے میں یہ منشور سعادت مند روحوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

۲

آج کوئی شخص تعلیم کو امت کا بنیادی مسئلہ قرار دیتا ہے تو کوئی کہتا ہے مسلمانوں کی اقتصادی ترقی ان کے تمام مسائل حل کردے گی۔ کوئی صنعت و حرفت کو درد کا درماں بتاتا ہے تو کسی کو اصرار ہے کہ کلید دراصل سیاست کے ہاتھ میں ہے۔ گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔ زیل کا یہ مضمون اسی خلط مبحث کا قرآنی فکر میں ایک جائزہ ہے جہاں ترجیحات کے تعین میں ان خودساختہ پیغمبروں سے ہوشیار رہنے کی دعوت دی گئی ہے جو ہر لمحہ رسول اللہ ﷺ کی امت کی ترجیحات اپنے دل ودماغ سے متعین کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

امت میں جھوٹے پیغمبروں کا ظہور

مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس کی طرف متوجہ ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مسلمانوں میں اپنے حامیوں کی تلاش میں تو وہ ناکام ہو گیا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس نے بہت سے دلوں میں منصب رسالت کے حصول کی جوت جگادی۔ خود مسیلمہ کے عہد میں کئی اور لوگوں نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا، بعض تائب ہو گئے اور بعض نے اپنی دکان لپیٹ دینے میں عافیت جانی۔ مسیلمہ کو شاید اس بات کا اندازہ تھا کہ نبوت کوئی عام سی شئے نہیں اور یہ کہ اس کے اعلان کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول اکرم ﷺ کے مدمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک طرف تو ذات ختمی رسالت اور دوسری طرف محض بلند بانگ دعووں کا بہروپیا، ناکامی مسیلمہ کا مقدر تھی۔

نبوت کے دعویداروں کی دوسری نسل کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ محمد ﷺ کی امت سے لوگوں کو نکال لے جانا اور ایک نئے نعرے کے گرد انہیں جمع کر لینا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔ لہٰذا دوسری نسل نے خود کو امت کا فرد بتا کر اس امت میں نقب زنی کی کوشش کی۔ مسلمانوں میں بہت سی ٹیڑھی میڑھی تحریکیں اس مقصد کے لئے اٹھائی گئیں اور بہت سے لوگ دشمنوں کی شہ پا کر اس مہم میں آگے بڑھے۔ اب نبوت کے نئے دعویداروں کا مقصد کسی نئی امت کی تشکیل نہیں بلکہ خود اس امت کے اندر نئی اجنبی فکر کی آبیاری تھا، لہٰذا نئی نئی فکری اڑان کے ساتھ نئے فرقے وجود میں آئے۔ البتہ ان سبھوں کی کوشش یہ رہی کہ اپنی فکری کجی کی بنیادیں انہیں دینی مآخذ پر رکھیں تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ ان کا تعلق بھی رسول اکرم ﷺ کی امت سے ہے۔ ایران میں بہائی تحریک نے گو کہ ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا تھا لیکن عرصے تک ان کے لئے حوالے کی کتاب قرآن مجید ہی رہی اور

آج بھی مغربی ممالک میں بہاء اللہ کے متبعین کی گفتگو سے چند ثانیے کے لئے ہی سہی، مسلمان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ برصغیر میں مرزا غلام احمد کی تحریک بھی خود کو اسلام اور مسلمانوں کے قالب میں پیش کرتی رہی اور آج بھی اس کا اصرار ہے کہ اسے امت مسلمہ کا جزو تصور کیا جائے۔ اسی طرح اسماعیلیوں نے اجنبی تشریح و تعبیر کے بل بوتے پر ایک نیا مذہب تیار کر ڈالا۔ گو کہ یہ بھی اپنا تاریخی تعلق اسلام سے بتانے پر مصر ہیں۔ امت کے خیمے میں نقب لگانے والوں کو اگر کوئی کامیابی ملی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو پہلے تو اللہ اور اس کے رسول سے اپنے تعلق کا یقین دلاتے تھے اور پھر دین کے خادمین کی حیثیت سے خود کو پیش کرتے پھر وہ انہیں رفتہ رفتہ اسلام کے بنیادی تصورات سے دور لے جاتے۔ کوئی فی زمانہ جہاد کے ساقط ہو جانے کا حکم لگاتا تو کوئی قرآن کے بین الاقوامی vision کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے نور البہا کی روشنی میں ایک نئے بین الاقوامی معاشرے کے قیام کی دعوت دیتا۔ کسی کو اس بات پر اصرار تھا کہ رسول اکرم ﷺ کی امت اب الوہیت کا اثر لئے نئے امام کی اتباع میں اپنا سفر جاری رکھے گی تو کوئی اولی الامر کی تشریح و تعبیر میں اس حد تک غلو کرتا کہ اس پر شرک کا شائبہ ہونے لگے۔ گویا جتنے منہ اتنی باتیں، البتہ ایک بات تو سب میں مشترک تھی وہ یہ کہ یہ سب کے سب بنیادی طور پر اللہ اور اس کے رسول سے اپنا حوالہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ حتی کہ ابھی حال کی تاریخ میں کنیڈا میں جس تازہ بتازہ پیغمبر نے اپنے ظہور کی خبر سنائی تھی وہ بھی قرآن میں معجزاتی طور پر عدد ۱۹ کے جلووں کی کارفرمائی کے موجد و مبلغ تھے۔ نبوت کے دعویداروں کی یہ دوسری نسل اپنے پیش رووں کے مقابلے میں اس اعتبار سے زیادہ کامیاب رہی کہ انہیں اس امت سے کچھ الٹے سیدھے اور سادہ لوح پیروکاروں کا ایک حلقہ ہاتھ آگیا جو آج بھی ان منحرف تحریکوں سے اس دھوکے میں وابستہ ہے کہ شاید اب بھی اس کا تعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ٹوٹا نہیں ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جھوٹے نبیوں کی پہلی اور دوسری نسل نے اس امت کو بڑے فتنے سے دوچار کیا۔ تاریخ کے نازک مرحلے میں جب امت کو اپنی ساری توانائی بیرونی دشمنوں سے محاذ آرائی پر صرف کرنے کی ضرورت تھی، ان اندرونی فتنوں نے اسے داخلی محاذ پر الجھائے رکھا۔ لیکن یہ امت چونکہ آخری رسول ﷺ کی امت ہے اور اسے رہتی دنیا تک رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دینا ہے اس لئے اسے ان

نازک نظری مسائل پر کامیاب و کامران گزرنا ہی تھا۔ نبوت کے جھوٹے دعویداروں کو امت کے کچھ لوگ تو یقیناً ہاتھ آگئے البتہ امت کا اپنا انبیائی مزاج بر قرار رہا اور ہمارا جمہوری شعور اس بات سے خالی نہ ہوا کہ ہم گو کہ فی الوقت ہر اعتبار سے تباہ حال ہیں لیکن ہمارا اصل کام کتاب و سنت کی بنیاد پر عالمی نظام عدل کا قیام ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں بندوں سے خالق کا ٹوٹا ہوا تعلق بتمام و کمال پھر سے بحال ہو جائے۔

ایک ایسے عہد میں جب چہار طرف نظام کفر سے عالمی قیادت چھین لینے کا معرکہ جاری ہے اور جب دنیا کے مختلف ملکوں میں منتشر امت کے حوصلہ مند افراد نئی صبح کے قیام کے لئے سر توڑ جد و جہد میں مصروف ہیں، دشمن کو پہلے سے کہیں زیادہ اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ مسلمانوں کی تنگدستی اور بدحالی کے باوجود خارجی محاذ پر ان کا مقابلہ ممکن نہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کے پر شور، گرجدار اسلحے مسلمانوں کے اندرون میں پلتی، بڑھتی نظری قوت پر قابو نہیں پاسکتے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے اندر فکری اور نظری سطح پر انتشار اور پراگندگی پھیلانے والے خیالات عام کئے جائیں جو مسلمانوں میں انحراف کی بنیادیں مضبوط کر سکیں اور یہ سب کچھ اس طرح ہو کہ عام ذہنوں میں یہ احساس بھی پیدا نہ ہو کہ کوئی نیا ایجنڈا، کوئی نئی بات امت میں عام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس مقصد کی خاطر تعمیر و ترقی کے مغربی تصورات مسلم معاشرے میں پھیلائے جارہے ہیں اور مغرب کی کامیاب زندگی کے پیمانے اور نفع و نقصان کا برآمد کردہ میزانیہ ہمارے درمیان عام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دیکھا جائے تو امت کو پراگندگی فکر سے دوچار کرنے کے لئے جھوٹے نبیوں کی یہ تیسری نسل میدان میں آچکی ہے۔

مدعیان نبوت کی یہ تیسری نسل اپنے متقدمین کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باضابطہ طور پر نبوت کے اعلان سے احتراز کرتی ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ ہے کہ امت کسی نئے نبی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور نہ ہی اس بات کا کوئی امکان ہے کہ کوئی شخص مہدی یا مجدد کے دعوے کے ساتھ میدان میں آئے اور اس امت کا رخ اس کے اصل راستے سے پھیر دے یا یہ بتائے کہ اسلام کے فلاں فلاں ارکان اب ساقط ہوگئے ہیں یا اس بات کا یقین دلائے کہ چوں کہ فی زمانہ جمہوریت کا دور دورہ ہے اس لئے اسلامی نظام عدل کے قیام کی بات اب فرسودہ اور متروک مفروضہ ہے کہ اب ایک مخلوط سوسائٹی اور سکڑتی دنیا کے لئے نیا خواب تشکیل دینا چاہئیے۔ چوں کہ اتنی بھونڈی باتیں اور اللہ

اور اس کے رسول ﷺ سے اتنی صریح بغاوت امت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی اس لئے جھوٹے پیغمبروں کی تیسری نسل نے اپنے لئے کام کا بالکل مختلف انداز اختیار کیا ہے۔ ان حضرات کی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنے ڈھب کا کوئی فرقہ تیار کرنے کے بجائے خود ان کے اندر رہ کر انہیں دین حنیف سے ہٹا دیا جائے اور اس کے لئے سب سے آسان ترکیب یہ ہوگی کہ مسلمانوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ اب تک اللہ اور اس کے رسول کے حوالے سے جو بڑی بڑی قربانیوں کے مظاہر وہ پیش کرتے آئے ہیں اور جس دین کی تبلیغ میں وہ اپنا سب کچھ قربان کر دیئے اور جس نظام خلافت کے قیام کو اپنی بنیادی دینی ذمہ داری سمجھ بیٹھے ہیں وہ سرے سے اس وقت اسلام کو مطلوب ہے ہی نہیں، کرنے کا کام تو کچھ اور ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خود کو جذباتی طرز و فکر سے آزاد کریں، عملی طرز فکر کی عادت ڈالیں اور Pragmatic بن کر دنیا میں سرخرو ہوں۔ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ انہیں کسی عالمی نظامِ عدل کا ہراول دستہ بننا ہے یا یہ کہ انہیں دنیا سے شرک وظلم کے خاتمے کا فریضہ سونپا گیا ہے یا یہ کہ وہ اس بات کے لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کا اللہ سے ٹوٹا رشتہ دوبارہ جوڑ سکیں۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں، غیر عملی خیالات ہیں۔ کرنے کا کام تو یہ ہے کہ ہم سب لوگ غربت اور جہالت کے خاتمے کے لئے کام کریں، مسلمانوں کی معاشی پوزیشن مستحکم ہو، تکنیکی تعلیم کے ادارے کھولے جائیں، ہسپتال اور شفاخانوں کا جال بچھایا جائے اور خدمت خلق کی ایک ایسی فضا بنائی جائے کہ لوگ خود ہی پکار اٹھیں کہ ہاں، ایسے ہوتے ہیں مسلمان۔

جدھر دیکھئے جھوٹے پیغمبروں اور ان پر ایمان لے آنے والوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ بعض جھوٹے مدعیانِ کارِ نبوت تو اس حد تک جری ہو گئے ہیں کہ وہ علی الاعلان امت کو de-emotionalize کرنے کی تحریک بھی چلا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جذباتی تعلق رکھنا اور دین مبین کی توہین کے مظاہر پر بے باکانہ مضطرب ہو جانا ایک جذباتی اور غیر عقلی رویہ ہے۔ ان مدعیانِ کارِ نبوت میں کوئی غربت کے خاتمے کو اولین ترجیح دیتا ہے تو کوئی پوری امت کو تکنیکی تعلیم کے عمل میں مصروف کر لینا چاہتا ہے۔ کوئی عیسائی مشنریوں کے طرز پر شفاخانوں اور خدمت خلق کے ذریعے اس ملک میں مسلمانوں کے وقار کی بحالی کا راستہ دکھاتا ہے تو کوئی اس بات پر مصر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو سب کام چھوڑ کر جمہوریت اور سیکولرازم کے استحکام میں لگ جانا چاہئے، تو کوئی اس سے بھی آگے بڑھ کر اجنبی

تصورات کو امت کی نظری اساس بنادینے پر بضد ہے۔ اس میں سے کچھ لوگ تو سادہ لوحی میں یہ نعرے لگا رہے ہیں اور بعض لوگ نظام کفر کی پروپیگنڈہ مشنری سے مسحور ہوئے ہیں۔ البتہ کچھ ایسے بھی ہیں جو جان بوجھ کر محض چند جھوٹے دنیاوی فائدوں کے لئے اس امت پر منحرف اور اجنبی تصورات لاد دینا چاہتے ہیں اور یقیناً ان ہی جھوٹے مدعیان نبوت میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی روزی روٹی موجودہ نظام کے سہارے ہی وابستہ ہے اور جو کسی نئی صبح کے قیام کو اپنی موت تصور کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ تمام لوگ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئے ہیں اور بہت سے لوگ محض اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ان نعروں کا شکار ہوگئے ہیں اس لئے عام مسلمانوں کو ان کے انحراف کا صحیح اندازہ بھی نہیں۔ البتہ اب جب کہ بعض متشدد اور جری قسم کے لوگ علی الاعلان مسلمانوں کو de-emotionalize کرنے کا اعلان کر چکے ہیں تو امت کے بعض بالغ نظر حلقوں میں ان منحرفین کے پیدا کردہ خطرے کا احساس ہو چلا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ امت کو اجنبی تصورات کا اسیر بنانا چاہتے ہیں یا جو لوگ امت کا انبیائی ایجنڈا تبدیل کرنے کے درپے ہیں یا جو لوگ اس بات کی عمداً کوشش کر رہے کہ ترجیحات کے تعین کا کام کتاب و سنت کے بجائے ان کے دل و دماغ کی اپج سے انجام پائے، ضرورت کہ ان کے پیش کردہ تصورات کا انتہائی سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے اور واضح طریقے سے بتایا جائے کہ امت کا ایجنڈا متعین کرنے میں ان سے کہاں بھول ہوئی ہے۔ تاکہ بہت سے مخلصین جو جھوٹے پیغمبروں کے سحر میں آگئے ہیں وہ اپنا قبلہ درست کرسکیں اور امت کے اندر مسلسل بڑھتی ہوئی فکری پراگندگی کا یکسر خاتمہ ہوسکے۔

آیئے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ نبوت کے جھوٹے مدعیان اور ان سے متاثر مصلحین ہمیں کس راستے پر لے جانا چاہتے ہیں؟ وہ ہم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟ پھر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ بعینہ یہی سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو مطلوب ہے یا نہیں؟

شعور کی زندگی سے انحراف

پہلی چیز جو ہمیں ان نئے مصلحین کے یہاں کھٹکتی ہے وہ زندگی کی طرف ان کا خالص مادی نقطہ نظر ہے۔ ان حضرات کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کی دنیا سنور جائے، معاشی

خوشحالی کا دور دورہ ہو، ملک کے وسائل میں بقدر تعداد انہیں بھی حصہ ملے، ان کے یہاں بھی خوبصورت بنگلوں اور چمکتی کاروں کا ہجوم ہو تا کہ دنیا سے فیض یاب ہونے میں وہ دوسری قوموں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی اخروی نجات کا راستہ کیا ہے تو یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں جسے نئے مصلحین کی توجہ حاصل ہو۔ دین کی درستگی کے لئے کچھ مختلف قسم کے لوگ ہیں جن کے پاس آخرت کی کامیابی کے کچھ شرطیہ قسم کے فارمولے موجود ہیں۔ اوراد و وظائف کے جوڑ گھٹاؤ اور عبادت کے مخصوص مظاہر کے ذریعے وہ کچھ اس اعتماد کے ساتھ آخرت کی کامیابی کا نسخہ تقسیم کر رہے ہیں جس طرح کوئی بازاری حکیم شرطیہ علاج کرتا ہے۔

دیکھا جائے تو نئے مصلحین کی تمام تر توجہ صرف اس زندگی کو موضوع بحث بناتی ہے جسے ہم حیوانی یا مادی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ انسان ہونے کے حیثیت سے ہم سبھوں کو ضروری احتیاجات پر مشتمل دن رات ایک جسمانی زندگی کے مراحل سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بھوک، پیاس کی شدت ہمیں روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔ جسم کا جاں سے تعلق قائم رکھنے کے لئے ان بنیادی ضرورتوں سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن مومن صرف جسمانی سطح پر نہیں جیتا بلکہ اعلیٰ شعوری اور روحانی سطح پر بھی ایک ایسے جہان میں وہ سانس لیتا ہے جہاں مادہ پرست کافر پر بھی نہیں مار سکتا۔ کافر اور مومن کی زندگی میں بنیادی فرق یہی ہے کہ جہاں کافر موجودہ زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے حصول میں ہی اپنی ساری قوت لگائے دیتا ہے وہیں ایک مومن زندگی کے بہترین وسائل کو بھی آخرت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ دنیا کی طلب میں دراصل اسے آخرت کی طلب متحرک رکھتی ہے۔ علم کا حصول، اعلیٰ ٹیکنالوجی کی بازیافت، تجارت و حرفت میں انہاک ان سبھی عوامل کے پیچھے یہی فکر کارگر رہتی ہے کہ اس کے نتیجے میں اسے اللہ کا قرب حاصل ہو سکے اور اس کی تمام توانائی اور وسائل اعلائے کلمۃ الحق کے کار عظیم میں استعمال ہو سکے کہ اگر ایسا نہ ہو تو مومن اور کافر کی زندگی کا بنیادی فرق ہی ختم ہو جائے۔ نئے مصلحین کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ان کی نگاہیں صرف اس مادی زندگی کے مظاہر میں الجھ کر رہ گئی ہیں لہٰذا اس بات کی فکر تو کی جا رہی ہے کہ تکنیکی تعلیم اور تجارت میں مسلمان آگے آئیں، ملازمتوں میں انہیں خاطر خواہ حصہ ملے۔ لیکن یہ بات سرے سے محل نظر نہیں ہے کہ مسلمانوں کو

زیادہ دولت مند، زیادہ با اقتدار اور زیادہ با وسائل بنا کر آپ ان سے آخر کیا کام لینا چاہتے ہیں؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ انبیائی تحریک کا پہلا مرحلہ ہے اور یہ کہ آنے والے دنوں میں آپ ان سے وہی کام لے سکیں گے جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے تو اس مفروضے کا مزید باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آپ جسے ہماری ملی زندگی کا ایجنڈا بنائے دینے پر مصر ہیں اس کا اصل اسلامی ایجنڈا ہونا تو درکنار، کیا یہ ترکیبیں کسی قوم کو صرف دنیا میں سرخرو کرنے کے لئے بھی مفید ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر کبھی دل توفیق پر آمادہ ہو تو یہ بھی دیکھ لینے میں کچھ حرج نہیں کہ آیا رسول اکرم ﷺ نے امت کی سربلندی کے لئے جو منصوبہ ترتیب دیا تھا وہ آپ کے تجویز کردہ منصوبے سے کسی درجے میں میل کھاتا ہے یا نہیں؟

یقیناً اسلام ہمیں حصول دنیا سے نہیں روکتا اور نہ ہی اسے یہ بات پسند ہے کہ مسلمان دنیا کے امور کو کفار و مشرکین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور خود اپنی نجات کی فکر میں راہبانہ تصوف کی راہ لیں کہ اسلام دنیا اور آخرت کے درمیان ایک ایسے توازن کا طالب ہے جسے صرف شعوری سطح پر جینے والے لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ "إنَّ الدُّنيا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَة" یعنی دنیا تو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے لیکن مسلمان اس بات کو بھول نہ جائیں کہ وہ دراصل شہر آخرت کے باسی ہیں۔ دنیا میں رہ کر آخرت کی طرف دیکھنا اور مسلسل دیکھے جانا یہی مومن کی صفت ہے اور یہی وہ اعلیٰ شعوری زندگی ہے جس سے اس سرزمین کے تمام باسیوں کو اسلام متعارف کرانا چاہتا ہے۔ انسانی زندگی کا تمام تر فساد اسی وجہ سے ہے کہ لوگ دنیا کی رنگ و رعنائی میں کچھ اس طرح سے کھوئے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ دنیا جمع کرنے کی دوڑ میں ہر شخص، جائز و ناجائز کی پروا کئے بغیر، ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ چھوٹی کاروں سے بڑی کار اور چھوٹے بنگلوں سے بڑے بنگلوں، فارم ہاؤس، تفنن طبع کے مقامات اور نہ جانے کیا کیا! حالانکہ ہر روز اس کے درمیان موت کا فرشتہ مسلسل یہ اعلان کر رہا ہے کہ اب تمہاری مہلت عمر کم ہوتی جا رہی ہے اور یہ کہ بہت سے جاہ و حشم والے لوگ اپنی جنت نشاں رہائش گاہوں کو چھوڑ کر جا چکے، اب تمہارا وقت بھی قریب آیا چاہتا ہے۔ لیکن جو لوگ شعور کی سطح پر نہیں جیتے، جو صرف حیوانی سطح پر زندگی جیتے ہیں، انہیں یہ صدائے جرس سنائی نہیں دیتی۔

معصوم آئیڈیالزم

نئے مصلحین یہ سمجھتے ہیں کہ عالمی نظام عدل کا خواب اور خلافت اسلامی کے قیام کی باتیں مسلمانوں میں غیر عملی قسم کا مثالیت(idealism) پیدا کرتی ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ مسلمانوں کو عظمت رفتہ کی یاد میں وقت گنوانے یا ان مقدس خوابوں کی دنیا میں رہنے کے بجائے حقیقت کو کھلی آنکھوں اور کھلے دل و دماغ سے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ان حضرات کے مطابق موجودہ صورت حال میں قیامِ خلافت کی بات کرنا حقیقت پسندی کے خلاف ہے، اب دنیا بدل چکی ہے، اب دنیا پر کسی ایک نظریے کی حکومت نہیں ہوسکتی۔ مخلوط ثقافت اور مخلوط تکثیری معاشرے(Plural Society) کے اس دور میں اب اسلامی نظام عدل کی باتیں کرنا حقیقت پسندی کے سخت خلاف ہے۔ لہٰذا مسلمان عملی(pragmatic) رویہ اختیار کریں اور وہی باتیں سوچیں اور بولیں جو کہ قابل عمل بھی ہوں، اور چوں کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا بنیادی انقلابی ایجنڈا فی زمانہ ایک ناقابل عمل، موہوم خواب ہے اس لئے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی ایجنڈے کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے اور پوری امت ان کاموں میں لگ جائے، جو بقول ان کے، عملی ہوں اور جس کے فوری نتائج نکلنے کی توقع ہو۔ نئے ایجنڈے کے مضمرات پر ہم آگے گفتگو کریں گے، ابھی ہم صرف اتنا یاد دلانا چاہتے ہیں کہ زندہ قومیں کبھی بھی اپنا ایجنڈا ترتیب دیتے وقت یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ سب کچھ pragmatic ہے یا نہیں؟ اس کے برعکس جو لوگ تاریخ کو اپنے راستے پر چلانا چاہتے ہیں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کر دکھائیں۔ ورنہ اگر محض pragmatic کی بنیاد پر مستقبل کا منصوبہ ترتیب دیا جائے تو دنیا میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی، کوئی انقلاب نہیں آسکتا اور نہ ہی کبھی موجودہ کافرانہ نظام کے status quo کو چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

ذرا غور کیجئے، طائف سے واپسی پر رسول اکرم ﷺ کے حصے میں زبردست ہزیمت و بے بسی آئی تھی۔ اہل مکہ کے معاندانہ رویے سے تنگ آکر آپ بڑی امیدوں کے ساتھ طائف تشریف لے گئے تھے لیکن آپ پر طائف کا دن انتہائی سخت ثابت ہوا۔ استہزاء، تمسخر اور جسمانی اذیت کے تمام اوچھے ہتھکنڈے آپ پر آزمائے گئے۔ آپ کو ان مصائب کی تو ذرہ برابر پرواہ نہ تھی البتہ آپ کو یہ فکر دامن

گیر تھی کہ کہیں طائف کی یہ حوصلہ شکن خبر دوسری جگہ نہ پہنچ جائے کہ اس سے دعوت اسلامی کی ہوا اکھڑ سکتی تھی۔ مؤرخین نے لکھاہے کہ طائف کے سفر سے قبل تین برسوں میں کوئی پندرہ قبائل سے آپ نے امان کی درخواست کی تھی جس میں آپ کو ناکامی ہوئی تھی۔ اب طائف کے اس سفر میں جو واقعات پیش آئے تھے، اسے مصائب اور اذیتوں کا نقطہ عروج کہا جاسکتا ہے۔ وقت کا رسول جب سخت مخالفانہ ماحول میں مکے کو لوٹ رہا تھا تو عام لوگوں کو یہ بات صاف طور پر نظر آرہی تھی کہ محمد ﷺ کی یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ پھر بھی ان سخت حالات میں جو لوگ آخری رسول ﷺ کے دست وبازو بننے پر مصر تھے اور جنہیں اس راہ میں بڑی سے بڑی اذیت ترک تعلق پر آمادہ نہ کرتی تھی، یہ تمام کے تمام لوگ بنیادی طور پر idealist تھے، وہ اس بات پر مصر تھے کہ حالات جتنے بھی خراب ہوں، الٰہی پیغام کی لو کو مدھم نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ذرا ان واقعات کو یاد کیجئے، جب قریش کی سفارت ابو طالب تک آئی تھی۔ سرداران قریش کی پیش کش تھی کہ محمد ﷺ جو کچھ چاہیں ہم پیش کرنے کو تیار ہیں لیکن وہ اپنے پیغام کی کاٹ کو ذرا کم کردیں جب بھی اس اندیشے کے باوجود کہ شاید وہ اپنے عظیم سرپرست ابو طالب کی حمایت سے محروم ہو جائیں، وقت کے رسول ﷺ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ وہ اپنے پیغام کو tone-down کریں، نرم نرم اور میٹھا میٹھا بنا کر پیش کریں، بلکہ آپ نے ان نازک لمحات میں بھی جو الفاظ مبارک اپنی زبان سے ادا کئے وہ رہتی دنیا تک کے لئے pragmatism کے مقابلے میں idealism کی برتری کا اعلان تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

"وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوْا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَ الْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ اَوْ اَهْلِكُ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهُ"

بات یہ ہے کہ جو چیز عام لوگوں کو محض Idealism اور خالص Idealism نظر آتی تھی، وقت کا رسول جانتا تھا کہ دراصل یہی Pragmatic رویہ ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ شعور کی سطح پر جیتے ہیں وہ اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے Pragmatism کا ہی دوسرا نام Idealism ہے اور یہ کہ جو لوگ واقعی Pragmatic ہوتے ہیں وہ نتائج کی فوری حصولیابی پر زور نہیں دیتے، ان کی نگاہیں دور بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ مومن اور کافر کے Pragmati... میں یہی بنیادی فرق ہے کہ کافر جس کی

نگاہیں مادی زندگی کے جلوؤں سے آگے نہیں دیکھ پاتیں، وہ صرف اس خیال کو pragmatic قرار دیتا ہے جس سے فوری طور پر کسی منفعت کی توقع ہو اور جو مادی نفع و نقصان کے میزانیے میں اسے کامران قرار دے سکے۔ جب کہ مومن کا Pragmatism شعور کی دنیا میں اس Idealism کے حصول اور اس سلسلے میں پیش رفت سے متعلق ہوتا ہے۔

اب آیئے ان اجزاء کا جائزہ لیا جائے جس کے تعامل سے نئے مصلحین بزعم خود ایک Pragmatic رویئے کے قیام پر مصر ہیں اور جسے وہ اس امت کا اصل ایجنڈا باور کرانا چاہتے ہیں۔

تعلیمی تحریک

ہمارے عہد میں یہ خیال عام ہے کہ امت کا اصل مسئلہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے لہٰذا جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں انہیں چاہئے کہ امت کے اندر تعلیمی تحریک کی ہوا چلائیں، جا بجا تکنیکی اور حرفی تعلیم کے ادارے قائم کئے جائیں، اسکولوں اور کالجوں کا جال بچھایا جائے کہ امت میں تعلیم کے عام ہوتے ہی اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لئے امت کا بڑا حصہ اسی خام خیالی کا اسیر بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے قیام میں اپنی قوت اور وسائل صرف کر رہا ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع نہیں ہے جب تعلیم کے ذریعے اور نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے راستے امت میں مستقبل سازی کا خیال پیدا ہوا ہے۔ کوئی سو سال پہلے اسی خیال نے سرسید کو MAO کالج کے قیام پر مجبور کیا تھا۔ لیکن تب سے اب تک مسلمانوں کو قیادت و سیادت تو کیا حاصل ہوتی، زندگی کے ہر میدان میں ان کا گراف مسلسل نیچے آتا گیا، یہاں تک کہ وہ اب اس ملک میں تعلیمی طور پر سب سے پس ماندہ قوم قرار دیئے جا چکے ہیں۔ اس لئے تعلیمی ترقی کے دلفریب نعرے کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اصولی طور پر تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم عمل کی پہلی سیڑھی ہے۔ جاہل آدمی اپنی پستی کے ازالے کے لئے جو بھی قدم اٹھائے گا، اس سے اس کے مسائل میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوگا۔ لیکن یہ بات کہ ہم جسے علم سمجھ بیٹھے ہیں وہ واقعی علم ہے بھی یا نہیں؟ یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل

ہے۔ اس لئے کہ تعلیمی تحریک کی سو سالہ جدو جہد کے نتیجے میں اگر مسلمانوں پر حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جائیں تو اس علم کی عظمت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی پہلی وحی اقراء سے شروع ہوتی ہے اور بندے سے خدا کے قرب کی کوئی بھی کوشش علم و معرفت کے بغیر انجام نہیں پاسکتی۔ لیکن اسلام جس اقراء کی تلقین کے ساتھ اپنی مہم کا آغاز کرتا ہے اور جس علم کے سہارے اہل ایمان کی شعوری زندگی کی ترتیب و تنظیم کا کام انجام دیتا ہے وہ یقیناً ان علوم سے مختلف ہے جن کے فارغین اور حاملین پر صرف حصول رزق کے دروازے وا ہوتے ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ اسلام اپنے ماننے والوں میں شعوری زندگی جینے کی جوت جگاتا ہے۔ مومن پر عقیدہ توحید کے نتیجے میں بہت سے سربستہ راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا اصل لطف شعور کی سطح پر جینے میں ہے، مادی زندگی کے مظاہر فنا ہو جانے والے ہیں اور اسے بہت جلد اس دنیا سے دست کش ہونا ہے۔ اگر دنیا کو برتنے میں اس نے آخرت کا خیال نہ رکھا تو وہ سراسر گھاٹے میں رہے گا۔ اسے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا فیصلہ وسائل کی کمیابی یا اسلحوں کی فراوانی پر منحصر نہیں بلکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے حق میں تبدیلی کی خواہش رکھتے ہوں، جو ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کر دکھانے پر یقین واثق رکھتے ہوں لازم ہے کہ اس کام میں انہیں آسمانی مدد پر گہرا ایقان بھی حاصل ہو۔ علم و معرفت کی یہی وہ شاہ کلید ہے جس سے کامیابی کا ہر قفل کھل سکتا ہے۔ یقیناً جو لوگ امت میں انقلابی تبدیلیوں کی ارتھمیٹک عام کریں اور جو بھولے بھالے غافل مسلمانوں کو یہ بتا سکیں کہ وہ کوئی عام لوگ نہیں بلکہ آخری رسول ﷺ کی امت ہیں جسے رہتی دنیا تک رشد و ہدایت اور قیادت و سیادت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے تو یقیناً ایسے لوگوں کی کوششوں سے جمہور امت میں جو دانشورانہ انقلاب آئے گا وہ لامحالہ ایک نئی صبح کے قیام پر منتج ہوگا۔ اس لئے مجھے فی نفسہ اس کلیے کی صداقت پر شبہ نہیں کہ علم و معرفت کی عمومی تحریک اس امت کو احیاء اور اس دنیا کو انقلابی کیفیت سے دوچار کر دے گی لیکن افسوس اس بات کا کہ تعلیمی تحریک کے مبلغین سرے سے اس علم و آگہی کی بات ہی نہیں کرتے۔

ان حضرات نے علم کو حرفت تک محدود کر رکھا ہے۔ یہاں تعلیم کا بنیادی مقصد چوں کہ معاشی

ترقی قرار پایا ہے اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہمارے فارغین، "پڑھے لکھے لوگ" اس نظام کے لئے خود کو مفید ثابت کر سکیں، اس لئے تعلیمی تحریک بنیادی طور پر موجودہ جابرانہ نظام کے استحکام کے لئے کارندے فراہم کر رہی رہے، جس کا وجود ہی انفرادی آزادی کے خلاف ہے اور جس کے جبر کے زیر سایہ اس وقت پوری دنیا پریشان ہے۔ یعنی جس نظام کو الٹ پھینکنے کے لئے ہمیں کام کرنا چاہئے تھا اس کے استحکام کے لئے ہم اپنے فارغین کی کھیپ کے کھیپ فراہم کر رہے ہیں۔ یقیناً ہم میں بعض لوگ اس نظام کا حصہ بن جانے کے بجائے ابتداء میں صرف مادی فائدے کشید کرنے کو اپنا مشن قرار دیتے ہیں لیکن عملی طور پر ہوتا یہ ہے کہ مادی آسودگی کے متلاشی اپنے مفادات اسی نظام سے کچھ اس طرح وابستہ پاتے ہیں کہ بعد کے مراحل میں اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ان کے لئے ایک امر محال بن جاتا ہے۔ پھر جو لوگ بیورو کریسی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں یا جنہیں پالیسی سازی میں کسی بھی سطح پر کسی عمل دخل کا دھوکہ محسوس ہوتا ہے ان پر اس نظام جبر کی ناانصافی عام لوگوں کے مقابلے کہیں زیادہ منکشف ہوتی ہے۔ وہ ہر لحہ اپنے ارد گرد ظلم و ناانصافی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ دیکھتے ہیں۔ لیکن بیورو کریسی کی مصلحت انہیں ان مظالم کے خلاف آواز اٹھانے سے روکتی ہے۔ رفتہ رفتہ ایک بدعنوان نظام میں رہ کر ان کے اندرون کچھ اتنی تبدیلی آجاتی ہے کہ وہ اپنے اندر آخری رسول ﷺ کے امتی کی کوئی خوبی نہیں پاتے۔ مادی طور پر آسودہ لیکن تباہ حال اندرون والا یہ شخص ابتداء میں تو شاید یہ غلط فہمی پالتا ہو کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر اس کی درستگی کا سامان کرے گا، لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ جاہل اخلاق باختہ سیاست داں جسے اس نظام نے اس کے اوپر Boss کی حیثیت سے مسلط کر رکھا ہے اسے اس سڑے ہوئے نظام کے ایک غیر اہم پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تو وہ تھک ہار کر حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ بے ضرر قسم کے قومی کاموں میں حصہ لے کر اپنے دبے کچلے ضمیر کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور بس۔ رہی یہ بات کہ وہ ایک باخبر اور باعمل مسلمان کی حیثیت سے شعور کی سطح پر جینے کا سامان کرے یا یہ کہ کفار کے مقابلے میں زندگی کی طرف اس کا رویہ ممتاز و ممیز ہو تو ایسا اس لئے نہیں ہو پاتا کہ اس غریب کو "پڑھے لکھے" کی صف میں شامل کرنے کے لئے جو علم عطا کیا گیا ہے، اس میں سرے سے کہیں اس فسانے کا

ذکر بھی نہیں ہوتا۔ مومن کی شعوری زندگی کا ادراک تو بہت آگے کی بات ہے، ہمارے بیشتر پڑھے لکھے دانشوروں کو تو کبھی زندگی کے اعلیٰ مقاصد پر غور و فکر کا موقع بھی شاید و باید ہی ملتا ہے۔

جو لوگ تعلیمی تحریک کے دلفریب نعروں سے احیاء اسلام کا معرکہ سر کرنا چاہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن میں جس علم کے حصول پر زور ہے وہ بنیادی طور پر معرفت کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ دنیا کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنا، ستاروں پر کمند ڈالنا اور ساری کائنات کو اپنے لئے مسخر کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جس کی مسلمانوں کو بار بار ترغیب دی گئی ہے، اس لئے اللہ اور اس کے رسول کے ایجنڈے کو بروئے کار لانے کے لئے تمام جدید علوم اور ٹکنالوجی کے حصول کو ہم مسلمانوں کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ علوم اعلیٰ اسلامی مقاصد کے حصول کے بجائے نظام کفر کو قوت فراہم کرنے کے لئے صرف ہونے لگیں یا ان علوم کا مقصد صرف مادی زندگی کی منفعت قرار پائے تو ہم اسے اپنی قوت کا زیاں سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اپنے لوگ دشمنوں کے خیموں میں اجنبی ایجنڈوں کے لئے سرگرم ہو گئے ہوں۔ قرآن جس چیز کو علم قرار دیتا ہے وہ شعور کی زندگی سے عبارت ہے جو لوگ شعور کی سطح پر زندگی جینے کا سامان کریں گے وہ یقیناً اپنے علم و حرفت اور ٹیکنالوجی کو اسلامی ایجنڈے کے لئے ہی وقف کریں گے۔ البتہ اگر تعلیم سے شعور کی زندگی جینے کا داعیہ پیدا نہ ہوا اور ہمارے فارغین صرف حیوانی سطح پر زندگی جینے مظاہرہ کرتے رہے تو یہ بات تعلیم کے بنیادی مقصد کو شکست دینے کے مترادف ہوگی۔

خدمتِ خلق

عیسائی مشنریوں اور مغرب کے بعض فلاحی اداروں کے "کارِ خیر" سے متاثر ہو کر بعض مصلحین نے غربت اور بیماری کے خلاف بھی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ امت کا اصل مسئلہ غربت ہے جس کے سد باب کے لئے بھرپور تحریک چلائی جانی چاہئے۔ ان حضرات کو اس بات کا بھی قلق ہے کہ مسلمان رفاہی کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ "مہذب مغرب" کے مقابلے میں مسلم دنیا میں رفاہی اداروں کا کال ہے۔ صحت کی سہولتیں حاصل ہیں اور نہ ہی مسلمانوں میں ایسے پروجیکٹس پر پیسہ لگانے کا چلن ہے جن سے عمومی فلاح و بہبود وابستہ ہو۔ گذشتہ چند برسوں میں مسلم دنیا میں بین

نئے مصلحین چونکہ زندگی کے صرف ان مسائل سے کلام کرتے ہیں جو مادی زندگی کی سطح پر انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے یہاں صرف حیوانی سطح پر زندگی کو خطاب کیا جاتا ہے۔ شعوری سطح کی زندگی ان کے خواب و خیال سے ماوراہوتی ہے اس لئے فطری طور پر ان حضرات کا اصرار ہے کہ جب ہم نے موجودہ نظام جبر کے اندر فلاح کا راستہ ڈھونڈ ہی لیا ہے تو اب اس نظام سے چھیڑ خانی نہ کی جائے۔ اس قبیل کے ناصحین بار بار موجودہ نظام میں اپنے ایمان و ایقان کا اعادہ کرتے ہیں اور عام مسلمانوں سے بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کے استحکام میں اپنی قوت صرف کر دیں کہ اگر یہ نظام ہی نہ رہا تو اس نظام کی مناسبت سے ملی فلاح و بہبود کے جو منصوبے دریافت کئے گئے ہیں ان کی اثر انگیزی کو بھی گہن لگ جائے گا۔ لہٰذا نئے مصلحین سیکولرازم، ڈیموکریسی اور عدم تشدد کو اپنی تمام تر کار گزاریوں کی اساس قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں دستوری، جمہوری اور پرامن طریقہ تبدیلی کا تذکرہ بار بار آتا ہے۔ نوبت اب یہاں تک آپہنچی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ایجنڈے کے لئے قائم ہونے والی جماعتیں اور دین و شریعت کا علم رکھنے والے ثقہ قسم کے ملی قائدین بھی اب خوشی خوشی سیکولر ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر رہے ہیں۔ اب انہیں سیکولرازم کا مبلغ کہلانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہوتا۔ اگر ایسا محض اس وجہ سے ہے کہ جھوٹے پیغمبروں کے زیر اثر ان حضرات کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ سیکولرازم اور جمہوریت اسلامی نظام ہی کی ذرا نئی بدلی ہوئی شکل ہے جو نئے حالات میں کارگر ہو سکتی ہے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مغالطے کا بھی پردہ چاک کیا جائے۔

جمہوریت

ہمارے خیال میں جو لوگ جمہوریت کی رٹ لگا رہے ہیں وہ انتہائی قدامت پسندانہ، جامد ذہن کے لوگ ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور یہ حضرات ابھی تک ان فرسودہ تصورات کو جدید سمجھے بیٹھے ہیں، جسے بے راہ رو مغرب نے اپنے تہذیبی سفر میں صدیوں پہلے دریافت کیا تھا۔ تب وہ تازہ بتازہ دلفریب نعرہ تھا۔ لوگوں کو یہ امید تھی کہ شاید اس نئے سیاسی فارمولے سے امن و انصاف کی فضا قائم ہو جائے گی۔ لیکن مختلف معاشروں میں برسہا برس کے تجربوں کے بعد جمہوریت نے جو کچھ دیا ہے اس کے نتیجے میں پوری

نئے مصلحین چونکہ زندگی کے صرف ان مسائل سے کلام کرتے ہیں جو مادی زندگی کی سطح پر انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے یہاں صرف حیوانی سطح پر زندگی کو خطاب کیا جاتا ہے۔ شعوری سطح کی زندگی ان کے خواب وخیال سے ماوراہوتی ہے اس لئے فطری طور پر ان حضرات کا اصرار ہے کہ جب ہم نے موجودہ نظام جبر کے اندر فلاح کا راستہ ڈھونڈ ہی لیا ہے تو اب اس نظام سے چھیڑ خانی نہ کی جائے۔ اس قبیل کے ناصحین بار بار موجودہ نظام میں اپنے ایمان وایقان کا اعادہ کرتے ہیں اور عام مسلمانوں سے بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کے استحکام میں اپنی قوت صرف کردیں کہ اگر یہ نظام ہی نہ رہا تو اس نظام کی مناسبت سے ملی فلاح و بہبود کے جو منصوبے دریافت کئے گئے ہیں ان کی اثر انگیزی کو بھی گہن لگ جائے گا۔ لہٰذا نئے مصلحین سیکولرازم، ڈیموکریسی اور عدم تشدد کو اپنی تمام ترکار گزاریوں کی اساس قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں دستوری، جمہوری اور پرامن طریقہ تبدیلی کا تذکرہ بار بار آتا ہے۔ نوبت اب یہاں تک آپہنچی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ایجنڈے کے لئے قائم ہونے والی جماعتیں اور دین وشریعت کا علم رکھنے والے ثقہ قسم کے ملی قائدین بھی اب خوشی خوشی سیکولر ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے اپنی تمام تر قوتیں صرف کررہے ہیں۔ اب انہیں سیکولرازم کا مبلغ کہلانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہوتا۔ اگر ایسا محض اس وجہ سے ہے کہ جھوٹے پیغمبروں کے زیر اثر ان حضرات کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ سیکولرازم اور جمہوریت اسلامی نظام ہی کی ذرا نئی بدلی ہوئی شکل ہے جو نئے حالات میں کارگر ہوسکتی ہے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مغالطے کا بھی پردہ چاک کیا جائے۔

جمہوریت

ہمارے خیال میں جو لوگ جمہوریت کی رٹ لگارہے ہیں وہ انتہائی قدامت پسندانہ، جامد ذہن کے لوگ ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور یہ حضرات ابھی تک ان فرسودہ تصورات کو جدید سمجھے بیٹھے ہیں، جسے بے راہ رو مغرب نے اپنے تہذیبی سفر میں صدیوں پہلے دریافت کیا تھا۔ تب وہ تازہ بتازہ دلفریب نعرہ تھا۔ لوگوں کو یہ امید تھی کہ شاید اس نئے سیاسی فارمولے سے امن وانصاف کی فضا قائم ہوجائے گی۔ لیکن مختلف معاشروں میں برسہا برس کے تجربوں کے بعد جمہوریت نے جو کچھ دیا ہے اس کے نتیجے میں پوری

دنیا کے وسائل پر چند ممالک قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ دنیا کے دس فیصد لوگوں کے ہاتھوں میں ساری دولت سمٹ آئی ہے۔ نوے فیصد تہی دست اور محروم رہ گئے ہیں۔ معاملہ اقوام عالم کا ہو یا جمہوریت کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کا، کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ پالیسی سازی میں عقل و شعور کو بھی کوئی دخل ہے۔ اوپر سے نیچے تک mis-management کی حکمرانی ہے۔ خطرناک اسلحے اور ان اسلحوں پر خرچ ہونے والی انسانی اور مادی قوت بھیانک حال کو بھیانک تر مستقبل میں بدلنے کے لئے بیتاب نظر آتی ہے۔ نہ تو جمہوری معاشروں میں کوئی Law & Order ہے اور نہ ہی عالمی سطح پر اقوام عالم عالمی غنڈوں کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ جمہوری نظام کے عالمی اداروں اور "مہذب" دنیا کے نمائندہ اداروں مثلاً اقوام متحدہ World Bank IMF, NATO اور ہیگ کی بین الاقوامی عدالت کی موجودگی کے باوجود ظلم و ناانصافی کی کون سی قسم ہے جو اس نظام میں نہ پائی جاتی ہو۔ فہرست طویل ہے، یہاں اس مسئلے پر کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں، ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ جس نظام کے استحکام میں اپنی قوت صرف کر رہے ہیں وہ دراصل ایک نظام جبر ہے۔ آپ کا کام اس نظام جبر سے دبے کچلے انسانوں کو نجات دلانا تھا۔ لیکن یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آپ اس نظام کی بساط تو کیا لپیٹتے، خود اس کے حواریوں میں شامل ہو گئے۔

یہ بات تو ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ جمہوریت کی کوئی دینی اساس نہیں ہے اس لئے کہ جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ انسانوں کی منتخب کردہ جمہوری اسمبلی یا پارلیمان کو حاصل ہوتا ہے اور اسے یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ اکثریت کی رائے سے لوگوں کے لئے زندگی کی ایک شریعت وضع کر سکے۔ جب کہ اسلام میں انسانوں کی وضع کردہ شریعت ایک لغو خیال ہے، کار لایعنی ہے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے حق پر دست درازی کے مترادف ہے۔ اسلام اس بات کا سرے سے قائل ہی نہیں کہ انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اس کے برعکس اس کا مطالبہ یہ ہے کہ بندوں کو بندوں کی تابعداری سے نکال کر الٰہ واحد کی اطاعت میں داخل کیا جائے۔ یہاں کثرت رائے آسمانی شریعت میں ذرہ برابر بھی کسی ترمیم کا حق نہیں رکھتی۔ اس لئے جو لوگ شورائیت کو جمہوریت سے خلط ملط کرتے ہوں انہیں جان لینا چاہیئے کہ ان دو تصورات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک، دوسرے سے متصادم بلکہ متحارب ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا کام اس شیطانی جمہوری ڈرامے کی بساط لپیٹنی ہے جس نے پوری دنیا پر بدعنوان، اوباش اور گمراہ حکمرانوں کو

مسلط کر رکھا ہے کجا کہ ہم اس کے استحکام کے لئے کام کریں۔

یہ تو جمہوریت کے بارے میں ایک دینی نکتہ تھا۔ جن لوگوں کے اطمینان قلب کے لئے صرف دینی محاکمہ کافی نہ ہو، ان کے لئے ہم مزید یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جمہوریت تو ایک ایسا فرسودہ خیال ہے کہ عقلی طور پر بھی کوئی صالح طبیعت اسے قبول نہیں کرسکتی۔ ذرا غور کیجئے، یہ بھی کیا بات ہوئی کہ اکثریت کو اقلیت کے مقابلے میں تمام تر اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ معاشرے میں بعض خیالات کو صرف اس وجہ سے عروج حاصل نہ ہو کہ اس کے حامی تعداد میں کم ہیں خواہ فی نفسہ یہ خیالات کتنے ہی مفید کیوں نہ ہو۔ احمقوں کی اکثریت کے مقابلے میں عاقل و دانا لوگ خود کو اقلیت میں پاکر بے بس محسوس کریں۔ آخر یہ کون سا نظام انصاف ہے جہاں اقلیت کو دم مارنے کی مہلت نہ ہو۔ پھر اس صورت حال کا تصور کیجئے جب احمقوں، بدعنوانوں اور مجرموں کی اکثریت اپنے ڈھب کے لوگ حکومت کے ایوانوں میں بھیجتی ہو جس کے نتیجے میں ہم پر حکومت کرنے والے یقیناً ہم میں بہتر لوگ نہیں ہوتے۔ اس بات سے تو غیر قومیں بھی اتفاق کرتی ہیں کہ موجودہ جمہوری تماشے میں سزایافتہ مجرمین اور اخلاق باختہ افراد کو ملک کے وسائل سے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔ ان اخلاق باختہ حکمرانوں کے ہاتھوں میں نہ تو ملک محفوظ ہے اور نہ ہی ملک کے عوام۔ روز ایک نئی بدعنوانی کا سراغ لگتا ہے۔ ظلم کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوتا ہے اور وسائل کے احمقانہ استعمال کی ایک نئی پالیسی تشکیل پاتی ہے۔ ہم اس جمہوری تماشے کو بے بسی سے دیکھتے اور جمہوری اقتدار کے استحکام کا راگ الاپتے ہیں۔ ہم اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں ووٹ کی قوت ہے جو ان بدعنوان ہاتھوں سے زمام اقتدار چھین سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ووٹ کی اس مفروضہ قوت کی بات بھی ایک واہمے سے زیادہ نہیں۔ اس جمہوری تماشے میں سیاسی زندگی کی تبدیلی بڑی حد تک سماجی اور معاشی اداروں پر منحصر ہے۔ جو لوگ اس نظام میں فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں وہ چند خاندان ہیں جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی دولت مرتکز ہو گئی ہے۔ یہ ہر قیمت پر دولت کے ارتکاز کو اپنے ہاتھوں میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ان سیاسی خادمین اور پارٹیوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کے مفاد کے تحفظ کی ضمانت دے سکیں۔ ووٹ کی سیاست میں عروج کے لئے سرمایہ داروں اور بندوق برداروں کی حمایت بھی لازمی ہے اور یہ سب کچھ کسی بیدار مغز اور بیدار روح انسان کے

لئے موجودہ نظام میں حاصل کرلینا کچھ آسان نہیں۔ ووٹ کی سیاست کے نتیجے میں حکمرانوں کے چہرے تو ضرور بدلتے ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت اسی سرمایہ دارانہ نظام کے خادمین کی ہوتی ہے۔ اس لئے ووٹ کی قوت سے آپ حکمرانوں کے چہرے تو تبدیل کرسکتے ہیں لیکن ان ہاتھوں سے زمام اقتدار نہیں کھینچ سکتے جو پردے کے پیچھے سے اس جمہوری تماشے کو بکمال خوبی پیش کررہے ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر انسانوں کی عقل کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی اس چال کو نہیں سمجھ پاتے۔ کیا کوئی بات صرف اس لئے قابل قبول ہوسکتی ہے کہ اسکے ماننے والے تعداد میں زیادہ ہوں جب کہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ سے دنیا میں اصحاب علم ودانش بہت تھوڑی تعداد میں پائے جاتے رہے ہیں۔ وہ لوگ جو شعور کی سطح پر زندگی جینے کا یارا رکھتے ہیں ہر معاشرے میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اکثریت حیوانی سطح پر زندگی جینے والوں کی ہوتی ہے۔ اب یہ کون سی عقل مندی ہے کہ ہم ایک ایسا نظام بنائیں جس میں ہمیشہ اعلیٰ روحانی شعور سے خالی، حیوانی سطح پر زندگی جینے کے متوالوں کو امور زندگی فیصل کرنے میں یگ گونہ سبقت حاصل ہوجائے؟

جمہوری شریعت کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ یہاں اقدار کو ثبات نہیں۔ آج جو چیز مغضوب ہے کل وہی چیز محبوب بن جاتی ہے۔ مغرب کے جمہوری معاشروں میں بعض ایسی قبیح اخلاقی حرکتوں کو قابل قبول قدر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے جس کے ارتکاب پر کل ان ہی معاشروں میں عبرتناک سزائیں دینے کا رواج تھا۔ کبھی سزائے موت کو جائز قرار دیا جاتا ہے تو کبھی اسے بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کبھی رائے دہندگان کے لئے عمر میں تخفیف کردی جاتی ہے تو کبھی عورت کو ووٹ دینے کا حق عطا کردیا جاتا ہے، گویا جمہوری معاشرہ مسلسل بدلتے اقدار کا معاشرہ ہے۔ بھلا یہ کون سا انصاف ہے کہ آج جس جرم میں کسی شخص کو موت کی سزادے دی گئی ہو، کل اسی جرم کی پاداش میں کوئی شخص صرف اس لئے بری قرار دیا جائے کہ اب قوانین بدل گئے ہیں۔ گویا پہلے جس شخص کو آپ نے موت کی سزادی ہو تو خواہ مخواہ آپ کے تساہل کا شکار ہوا، اس لئے کہ قانون کے بدلنے میں اور قانون کے اس ارتقائی مرحلے تک پہونچنے میں تاخیر تو آپ ہی کی جانب سے ہوئی ہے۔ بدلتے اقدار کے معاشرے میں جہاں اقدار کے تعین کی کوئی ٹھوس بنیاد نہ ہو، انصاف اور ناانصافی ایک ہی سکے کے دو رخ نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ شریعت

جمہور میں ہر لمحہ اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ جب کوئی قانون آپ کی خواہشات کا ساتھ نہ دے سکے تو اپنی ضرورت کے مطابق ایک نیا قانون وضع کر ڈالیں۔ قدیم تاریخ میں بھی تو یہی ہوتا تھا کہ قبائلی سردار یا بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتا ایک نیا قانون بنا ڈالتا، لیکن تب اسے اس پارلیمانی جمہوری تماشے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے دونوں صورتیں یکساں ہیں، پھر ایک کو قدیم اور ایک کو جدید کیوں قرار دیا جائے۔ ایک کو غیر مہذب اور ایک کو مہذب کیوں سمجھا جائے اور سب سے اہم بات یہ کہ کسی اکثریت کو یہ اختیار کیسے دے دیا جائے کہ وہ جب چاہے اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو اقلیت پر تھوپ دے۔ کیا کوئی عاقل و بالغ شخص کسی ایسے ظالمانہ نظام کے استحکام کے لئے کام کرنے کا خیال بھی اپنے دل و دماغ میں لا سکتا ہے؟

جو لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں جمہوریت کے استحکام کی تحریک چلا رہے ہیں یا جو حضرات جمہوریت کے راستے سے کسی تبدیلی کا یقین رکھتے ہیں وہ دراصل انسانی فکر کے ارتقاء کو روک کر بیٹھ جانے والوں میں ہیں۔ انہیں عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئیے کہ اب جمہوریت سے آگے کی بات سوچنے کا وقت آگیا ہے۔ اگر وہ مغرب کے جمہوری تماشوں سے تنگ آکر اسلامی نظامِ عدل کو ایک بہتر متبادل کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تو کم از کم انہیں متعفن جمہوری نظام سے آگے کی بات تو سوچنی ہی چاہئیے۔ لہٰذا جو لوگ مختلف مسلم ممالک میں فوری تبدیلی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور جن کا ایقان جمہوری تماشے سے پوری طرح اٹھ چکا ہے تو انہیں محض اس لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ وہ دستوری جد و جہد میں یقین نہیں رکھتے یا یہ کہ پرامن تبدیلی کے علاوہ بھی انہوں نے اپنی سرگرمیوں کے اور بھی بہت سے میدان ڈھونڈ نکالے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ مصر، اردن اور الجزائر وغیرہ میں جمہوری ڈراموں کا بہت قریب سے مشاہدہ کر چکے ہیں اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ ہر نظام اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے لئے قوانین کا ایک جال بچھاتا ہے جس کا بنیادی مقصد مذکورہ نظام کو تحفظ دینا ہوتا ہے، اس لئے کسی دستوری جد و جہد کے نتیجے میں اس نظام کو الٹ پھینکنا ایک لغو خیال ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ ان قوانین میں پائے جانے والے Loop-hole سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ یقیناً کامیاب انقلاب اپنے اندر پرامن تبدیلی کا جلوہ لئے ہوتا ہے لیکن پرامن تبدیلی کی فضا ہموار کرنے کے

لئے قوت کا استعمال لازمی ہے۔ اس لئے جو لوگ ہر قیمت میں جمہوری تماشے کی بساط لپیٹنے کے درپے ہوں انہیں انتہا پسند کہنے کے بجائے انسانی تحریک کا محسن گردانا چاہئے، اس لئے کہ جب پوری دنیا جمہوریت کے سلسلے میں تقلید جامد کا شکار ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو جمہوریت سے آگے کی بات سوچ رہے ہیں۔

سیکولرازم

جمہوریت ہو یا سیکولرازم، وحشیانہ قوم پرستی (Jingoism) ہو یا میٹھا میٹھا نیشلزم، ان کا اسلامی ایجنڈا قرار پانا تو در کنار یہ مسلمانوں کے لئے، سرے سے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ ہمارے عہد میں بعض دینی جماعتوں نے بھی سیکولرزم کی بے ضرر قسمیں تلاش کر لی ہیں جس سے بقول ان کے، ان کے ایمان پر حرف نہیں آتا۔ ہمارے خیال میں سیکولرزم کا کوئی بھی تصور مغربی سیاق و سباق سے پوری طرح الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب ملک کی کسی بھی زبان میں لفظ سیکولر کا کوئی متبادل موجود نہ ہو۔ ہندی میں سیکولرازم کے لئے "دھرم نرپیکچھتا" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اردو میں اسے "غیر مذہبی" یا "لادینی" کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان ایک لادینی ریاست کے دست و بازو بنیں، یہ بات عام مسلمانوں کے حلق سے اتارنا انتہائی مشکل ہے، اس لئے جو دینی جماعتیں اور شخصیات سیکولرازم میں اپنے ایقان کا بار بار اعادہ کرتی ہیں وہ اس لفظ کے اردو ترجمے سے دانستہ طور پر احتراز کرتی ہیں۔

سیکولرازم کے مبلغین مختلف پیرائے میں یہ بات کہتے رہے ہیں کہ ہندوستان کے پس منظر میں لفظ سیکولرازم مخصوص اہمیت کا حامل ہے اور یہ کہ ہم جس سیکولرازم کے مبلغ ہیں اس کا اسلام سے براہ راست کوئی ٹکراؤ نہیں۔ لیکن پہلی بات تو یہ کہ نئے مفہوم کی بات فلسفیانہ طور پر درست نہیں ہے، اس لئے کہ کسی اصطلاح میں نئے معانی اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی اجنبی صورت حال میں پرانے معانی یا تو اس کا ساتھ نہ دے سکیں یا یکسر ذہنوں سے محو ہو جائیں، ورنہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ اس اصطلاح پر معانی کی ایک اور پرت چڑھ جائے گی۔ ہندوستانی تناظر میں سیکولرازم کی کیسی بھی تشریح کر لی جائے، اس بنیادی تصور سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا جس میں زندگی کو مادیت اور روحانیت کے دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور جہاں ایک کو دوسرے میں عمل دخل کی اجازت نہیں ہے۔ ہندوستانی سیکولرازم کم

سے کم ہم سے جو مطالبہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ امور مملکت کو چلانے میں اسلام کیا کسی بھی مذہب کی کوئی ہدایت قبول نہیں کی جائے۔

جو لوگ موجودہ نظام کی فتنہ سامانیوں سے مطمئن ہوں اور جنہیں نظام جبر کی موت موت زندگی باغ عدن کا سالطف دیتی ہو، ان کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ اس خدا بیزار نظام کو ان ہی بنیادوں پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ البتہ جن لوگوں کی نگاہ اس خدا بیزاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مفاسد پر ہے اور جو اسی خدا بیزاری کو ام المسائل قرار دیتے ہیں، یقیناً ان کی کوشش ہوگی کہ جلد از جلد اس بے سمت تہذیب اور بے لگام معاشرے کو خدا بیزاری سے خدا شناشی کی طرف لے جانے کی کوشش کریں، جب انسانی معاشرے کو بہتر طریقے سے چلانے کے لئے اور امور مملکت کو عادلانہ خطوط پر منظم کرنے کے لئے الٰہی ہدایات موجود ہوں تو انسانی تہذیب کو اور سیاسی اداروں کو بے سمت ارتقاء کے لئے کھلا چھوڑ دینا انسانی قوتوں کا کچھ مصرف نہیں۔ پھر یہ کہ جو لوگ اس سرزمین میں آخری ہدایت کے حاملین ہیں، بنیادی طور پر ان کی ذمہ داری ہے کہ سیکولرازم کے اعلان سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اسے پر کرنے کے لئے میدان میں آئیں۔ ریاستی پالیسی کی حیثیت سے سیکولرازم کا انتخاب گویا اس بات کا اعلان ہے کہ ہدایت کے نام پر اس ملک کے باسیوں کے پاس مکمل خلا ہے۔ ریاستی مشنری کو چلانے اور امور مملکت کو انجام دینے کے لئے اس کے پاس کوئی آسمانی ہدایت نہیں ہے۔ اب اگر جن لوگوں سے اس خلا کو پر کرنے کی توقع ہو، اگر ان کی باتوں سے اس خلا میں مزید خلا پیدا کرنے کا اشارہ ملنے لگے تو یہ انسانی تہذیب کے ساتھ ایک بہت بڑا سانحہ ہوگا۔

مہذب دنیا

یہ خیال کہ اب دنیا وسیع اور وسیع القلبی کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے جہاں کسی ایک تہذیب کو سبقت حاصل نہ ہوگی اور نہ ہی کسی معاشرے میں کوئی ایک نظریہ سکہ رائج الوقت بن سکے گا، ایک لغو خیال ہے، دشمنوں کا پھیلایا ہوا پروپیگنڈہ ہے۔ اس خیال کے حاملین یہ بھی کہتے نہیں تھکتے کہ اب دنیا بھر میں ملے جلے Plural معاشرے تشکیل پا رہے ہیں، حالات بدل چکے ہیں۔ مہذب دنیا میں کسی تبدیلی کے لئے نرم

نرم گفتگو اور جمہوری جد و جہد کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ اس قسم کے خیالات جو بدقسمتی سے مسلم معاشرے میں عام ہوتے جارہے ہیں، مغالطے در مغالطے کی پیداوار ہیں۔ اول تو یہ مفروضہ ہی باطل ہے کہ ہم ایک مہذب دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ موجودہ دنیا کی ترتیب و تشکیل میں اور اس کی جلوہ سامانیوں پر چونکہ مغرب کو بڑی حد تک کنٹرول حاصل ہے، اس لئے اس نے اس بات کا زور و شور سے پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ اس کی تعمیر کردہ دنیا ایک مہذب دنیا ہے۔ اپنے آپ کو مہذب ثابت کرنے کے لئے قدیم تاریخ اور قبائل کی خانہ جنگیوں کو دانستہ طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ مہذب دنیا میں درندگی کے جو مظاہر عام ہیں اور معاصر تاریخ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں وقتاً فوقتاً انسانی ہاتھوں سے جو جہنم تعمیر پاتے رہے ہیں ان جیسی مثالیں تو قدیم تاریخ میں بھی نہیں ملتیں۔ یہ کون سی مہذب دنیا ہے جہاں سابق یوگوسلاویہ میں کوئی چار سال تک بدترین جہنم برپا رہا۔ کوئی تین لاکھ بوسنیائی مسلمان شب و روز قتل ہوتے رہے، کوئی پچاس ہزار عورتیں دشمنوں کے ذریعے حاملہ بنا کر چھوڑ دی گئیں۔ ان چار سالوں میں وہ سب کچھ سننے کو ملا جس کے تذکرے سے تاریخ کی کتابیں خالی ہیں۔ اور اسی دوران ساحل کے دوسری طرف زندگی محو خرام رہی۔ سیاحوں کے غول کے غول دھوپ سینکتے اور سمندر کھیلتے رہے۔ یوں جانو جیسے چند کلو میٹر دور انسانوں پر جو کچھ بیت رہا ہو، اس سے ان کا کچھ تعلق نہ ہو۔ اس قبیل کی مثالوں سے ہماری مہذب دنیا کی معاصر تاریخ بھری پڑی ہے۔

ایک ایسا معاشرہ جو توحید کے بجائے شرک کے بنیادی اصولوں پر تشکیل پایا ہو، خدا بیزاری جس کی گھٹی میں پڑا ہو، بھلا ایک ایسے معاشرے کو آپ مہذب معاشرہ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ وحشی زندگی کے جو مظاہر آپ کو چہار طرف نظر آرہے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی تو ہے کہ اس معاشرے کی بنیاد ہی غلط عقائد اور تصورات پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس نظام کی عیاری دیکھئے کہ اس نے آپ کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ آپ ایک مہذب معاشرے میں سانس لے رہے ہیں اور یہ کہ شریف لوگوں کو تبدیلی کے لئے صرف پرامن جد و جہد ہی زیب دیتی ہے۔ دھرنے، مظاہرے Peace March، پیکٹینگ، مشعل جلوس اور بس۔ حالاں کہ یہی نظام اپنی بقا اور استحکام کے لئے طاقت کے استعمال کا کوئی موقع نہیں کھوتا۔ جب دیکھئے کسی ملک کی ناکہ بندی کی جارہی ہے، کہیں میزائل داغے جارہے ہیں، کہیں بمبار طیارے حرکت میں ہیں اور کہیں اس

نظام کو چیلنج کرنے والے انقلابیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی اسکیم بنائی جارہی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کسی واقعی تبدیلی کے لئے اس کی منصوبہ بندی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب وہ نظام کفر کے پروپیگنڈے کی زد سے آزاد ہو کر اس کام کو انجام دے، ورنہ ہر گزرتا لمحہ اسے ایسا محسوس ہوگا کہ جو تھا وہ نہیں ہے اور جو نہیں تھا وہ ہے۔

یقیناً اس وقت امت مسلمہ ایک سنگین، بحران سے دوچار ہے۔ دشمنوں نے مستقبل کے راستے پر پہرے بٹھادیئے ہیں۔ جھوٹے پروپیگنڈوں کے زیر اثر بڑے بڑے اصحاب علم ودانش کے ذہنوں نے کام کرنا بند کردیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جن اصحاب دین وشریعت سے یہ توقع تھی کہ ان کے ہاتھوں میں عالمی نظام عدل اور خلافت اسلامی کا علم ہوگا، آج وہی ہاتھ Nation State کے جھنڈوں سے آلودہ ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان حضرات کو احساس زیاں کا کچھ احساس بھی نہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی قوم ہو جس کے پاس کوئی ریاست نہ ہو سوائے اہل ایمان کے۔ ہم بین الاقوامی طور پر ایک امت ضرور ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی ریاست نہیں۔ ایک ایسی ریاست جو امت کی سیاسی وحدت کی داعی ہو اور جس نے خلافت کے جھنڈے کو پوری دنیا پر لگانے کا عزم کر رکھا ہو۔ دنیا میں پائے جانے والے ہر جھنڈے کو کوئی نہ کوئی ریاست، کوئی نہ کوئی عمارت ضرور میسر آگئی ہے۔ اگر کوئی جھنڈا محروم رہ گیا ہے تو وہ خلافت اسلامی کا جھنڈا ہے جو گذشتہ پون صدی سے کسی عمارت، کسی در وبام سے محروم ہے۔ ایک ایسی امت کے لئے جس کا اپنا ڈھانچہ منہدم ہوچکا ہو جس کے سر سے خلافت کا سائبان غائب ہو اور جو کھلے آسمان کے نیچے پناہ گزینوں کے انداز سے دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی گزار رہی ہو اس کے لئے کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کو از سرنو منظم کرے۔ اپنے درمیان سے کسی صالح قیادت کو ڈھونڈھ نکالے جسے اس عہد میں امت کی نگہبانی اور رہنمائی کا کام سونپا جاسکے اور جسے ہم قرآنی اصطلاح میں اپنا اولی الامر قرار دے سکیں۔ اس کے بعد یہ خلیفہ کا دردسر ہے کہ وہ عالمی نظام عدل کے قیام کا کام ہم سے کس طرح لینا چاہتا ہے؟ تعلیم کو ترجیحی حیثیت حاصل ہوگی یا جہادی دستوں کی تشکیل کا کام اہمیت اختیار کرلے گا۔ دعوت اسلامی پر اپنی تمام تر قوت صرف کرنی ہوگی یا فلاحی کاموں کے ذریعے امت اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرے گی۔ مسئلہ فلسطین بزور بازو حل کیا جائے گا یا اس کے لئے مذاکرات کی میز سجانا

مناسب ہوگا۔ یعنی کس بات کو کس قدر اہمیت حاصل ہوگی اور کون سا کام کس طرح انجام دینا ہے؟ ان امور کے بارے میں کوئی حتمی رائے صرف خلیفہ کی ذات ہی دے سکتی ہے اور اسی کی رائے کو پوری امت ماننے کے لئے مذہبی طور پر پابند بھی ہے، ورنہ امیر امت یا خلیفہ کے غیاب میں مفید قیمتی مشورے بھی انتشار فکر و عمل میں اضافے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ خلیفہ کے علاوہ نہ تو کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ پوری امت سے سمع و طاعت کا مطالبہ کرے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ اس لئے کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم مختلف النوع سرگرمیوں میں اپنی قوت ضائع کرنے کے بجائے جلد از جلد اپنے درمیان سے ایک امام عادل ڈھونڈ نکالیں اور پھر اسے امور امت سونپ کر مکمل سمع و طاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ابرو و اشارے پر اپنا سب کچھ داؤں پر لگادیں، یہی اس امت کا موجودہ صورت حال میں بنیادی ایجنڈا ہو سکتا ہے۔

گو کہ موجودہ صورت حال میں عالمی نظام عدل کا قیام ایک امر محال معلوم ہوتا ہے اور عجب نہیں کہ اس خیال کے حاملین کو موجودہ صورت حال میں ڈریم مرچنٹ کہہ کر رد کر دیا جائے۔ اور عجب نہیں کہ خود مسلمانوں کی طرف سے، نظامِ عدل کا قیام جن کے ایمان کا حصہ ہے، طنز و استہزاء کی یورش ہونے لگے۔ لیکن جو لوگ مستقبل کی تاریخ لکھنا چاہتے ہوں انہیں یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ انقلابی تبدیلی کی ہر دعوت اور منظم و مستحکم نظام کو منقلب کرنے والی ہر آواز کو ابتدائی مرحلے میں تمسخر کا نشانہ بننا ہی پڑتا ہے۔ اگر آپ اس مرحلے سے بخوبی گزر گئے تو اگلا مرحلہ مصائب اور آزمائشوں کا ہے۔ اگر یہاں بھی آپ نے ثابت قدمی دکھائی تو موجودہ نظام آپ سے کچھ لے دے کر معاملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ خوشامدانہ انداز سے آپ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی جائے گی۔ دنیا آپ کے قدموں میں رکھ دی جائے گی، یہی آپ کا آخری امتحان ہوگا۔ اگر اب بھی ان حریفوں سے آپ بچ نکلے تو سمجھ لیجئے کہ دنیا میں اللہ کے انعام و اکرام کا وقت اب آ پہنچا ہے۔ نئی صبح کے طلوع کو اب دنیا کی کوئی قوت نہیں روک سکتی۔

✡ ✡ ✡

۳

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے فروری ۱۹۸۷ء میں دہلی کے بوٹ کلب پر ایک تاریخی ریلی منعقد کی تھی جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی دس لاکھ مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ اس ریلی نے آنے والے دنوں میں مسجد کے قضیے کو مسلمانوں کے بنیادی مسئلہ کی حیثیت سے متعارف کرایا اور اس کے گرد ہندوستانی مسلمانوں کی تمام تر جدو جہد مرکوز ہو گئی۔ مسلم تنظیموں کے اس عظیم الشان مظاہرے سے اسلام دشمن قوتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ آنے والے دنوں میں مسلم منافرت کی آگ ہر طرف پھیل گئی۔ مصنف کے خیال میں مسجد کے مسئلے کو جذباتی ایجنڈا بنانا لائحۂ عمل کی سخت غلطی تھی۔ انھوں نے بالکل ابتداء میں ہی سیاسی مسلمانوں کو مسجد کے جذباتی استحصال سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ ذیل کا یہ مضمون عوامی کتابچہ کی شکل میں بابری مسجد ریلی کے فوراً بعد شایع ہوا تھا اور اسے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے درمیان تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس کتابچہ میں جن خطرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا بدقسمتی سے اس صورت حال کو روکا نہ جا سکا۔

انہدام بابری مسجد سے چند ماہ قبل ستمبر ۱۹۹۱ء میں "ملی پارلیامنٹ کی ضرورت" نامی کتابچہ میں مصنف نے اس دھماکے کی پیش گوئی کر دی تھی جسے بالآخر ۶ر دسمبر کو پیش آنا تھا۔ آپ نے لکھا تھا:

"عنقریب ملک میں ایک بڑا دھماکہ ہونے والا ہے۔ یہ دھماکہ اپنی شدت کے اعتبار سے تو یقیناً زبردست ہوگا البتہ یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی، طریقۂ اظہار کیا ہوگا اور یہ کہ اس دھماکے سے کیا کچھ نتائج برآمد ہوں گے...... مختلف اندازِ فکر کے لئے اب اس ملک میں گنجائش کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ ان قوتوں کی طرف سے ہو رہا ہے بظاہر

جن کے ایمان کا حصہ ملک کی سالمیت ہے، وندے ماترم گانا جن کے فارغ اوقات کا محبوب مشغلہ ہے۔ گوکہ اس ملک کے باسیوں کی ایک قابل ذکر آبادی اس بڑھتے ہوئے فسطائی رجحان کو اب بھی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اس معصوم گروہ کے پاس نہ کوئی قوت ہے اور نہ ہی کسی ایسے عمل کے لئے واضح محرک۔ یہ بے بس و غیر مؤثر گروہ، خواہ عددی اعتبار سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو واقعہ یہ ہے کہ اب تک خاموش تماشائی بنا رہا ہے اور مستقبل میں بھی اس سے کسی بڑے عمل کی توقع نہیں، ایسی صورت میں دھماکے کا فائدہ یقیناً ان قوتوں کی جھولی میں جاتا نظر آتا ہے جو اس ملک کو صرف اور صرف ایک تہذیب کی آماجگاہ بنانے پر مصر ہیں، جن کے لئے اس ملک میں مسلمانوں کا وجود ناقابل برداشت ہے اور جو پوری امت مسلمہ پر بدترین غلامی مسلط کر دینے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔"

مذکورہ مضمون کا اس تاریخی پس منظر میں مطالعہ کرنا آج بھی مستقبل کی طرف ہمارے غلط اقدام کو روک سکتا ہے۔

——— مدیرہ

بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان

برادرانِ اسلام!

ہندوستان کی موجودہ صورت حال ایک بھیانک خطرے کی پیش گوئی کر رہی ہے۔ ہر وہ شخص جس کی حالات پر ذرہ برابر بھی نگاہ ہے اس کی ہولناکی کا اندازہ کرسکتا ہے۔ دور کیوں جایئے پچھلے دس سالوں میں ملک کی سیاسی صورتِ حال میں جو زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ کس صاحبِ نظر سے پوشیدہ ہے؟ چہار طرف فرقہ پرستی اور تنگ نظری کی آندھیاں اٹھ رہی ہیں۔ رنگ اور نسل اور عقائد کا امتیاز جنون کی حد تک بڑھتا جارہا ہے۔ علاقائی اور قومی عصبیتوں نے علاقہ پرستی اور قوم پرستی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ہر قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے اور تنہا زندہ رہنے کا حق مانگ رہی ہے۔ قدیم ہندوستان کے احیائی، ترشول بردار جنونی، گلیوں گلیوں کوچوں کوچوں گھوم رہے ہیں۔ گویا وہ اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ اب ہندوستان میں صرف ایک قوم ہوگی، ایک تہذیب ہوگی اور ایک زبان کے بولنے والے ہوں گے۔ دوسری طرف ردعمل میں مختلف علاقائی تہذیبیں، بڑی اور چھوٹی اقلیتیں، لسانی گروہ، اپنے تحفظ کی انتہائی کوششوں کے لیے میدان میں آگئے ہیں۔ اس وقت ملک کی مجموعی صورتِ حال میں ترشول اور تلواروں کی جھنکار ہے، بموں کے دھماکے اور بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں ہیں اور اجتماعی قتل کی تقریب میں استعمال کئے جانے والے خوفناک وحشی ڈھول کی ڈرم ڈرم ہے۔ جئے بجرنگ بلی اور اللہ اکبر کے نعرے ہیں۔

پسِ پردہ ایک خوفناک خانہ جنگی کی فضا تیار کر دی گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پردہ اٹھتا کب ہے اور کن ہاتھوں سے۔ خدانخواستہ یہ پردہ اگر اٹھ گیا تو ہم بھی، جو خود کو اب تک خاموش تماشائی سمجھتے رہے ہیں، اس کی زد سے نہیں بچ سکیں گے کہ یہ ڈرامہ حاضرین کو بھی اپنے کرداروں میں شامل کرلے گا۔ پھر

ہندوستان کی جغرافیائی صورتِ حال کا جو کچھ بھی ہو، مسلمانوں کا حال اسپین سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ لا قدر اللہ، کہ یہ لکھتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے، اللہ ہماری حفاظت فرمائے، اگر ایسا ہوگیا کہ یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے، تو یقین جانئے کہ ہند کی یہ سرزمین صدیوں کے لیے اللہ کی طرف بلانے والوں سے خالی ہو جائے گی۔ بدشگونی کی یہ باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں اور نہ ہی آپ کو۔ لیکن کیا کیجئے گا کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اور اس کے پیچھے جو منظّم سازش کارفرما ہے اس کا منطقی نتیجہ یہی کچھ نکلنے والا ہے۔ الا یہ کہ اس سے قبل کہ پردہ سَرکے اور وحشت و بربریت کا یہ ڈرامہ کھیلا جائے، ایک بڑی قوت اٹھے اور ان سازشوں کا قلعہ قمع کر دے، ان کرداروں کو تہہ تیغ کر دے، بلکہ میرے نزدیک تو واقعی حل یہ ہے کہ اس کہانی کو ہی سرے سے نیست و نابود کر دیا جائے کہ جس کو عملیانے کی بار بار کوشش ہوتی رہتی ہے۔ اس سخت ترین کام کے لیے ضرورت ہے ایک ایسے گروہ کی جو مادی آلات و حرب سے کہیں زیادہ اخلاقی اور روحانی فیوض و برکات کا حامل ہو۔ بالخصوص اس وقت جب پردے کے پیچھے سازشوں کا انبار ہے، مختلف قوتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور بدقسمتی سے خود امت مسلمہ بھی ایک فریق بن گئی ہے۔ کسی مخصوص گروہ سے یہ کام ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تدارک کی کوئی صورت ہے تو وہ صرف یہ کہ خود امت مسلمہ ایک انقلابی نظریاتی گروہ کی حیثیت سے اس ذمہ داری کو سنبھالے۔

اوپر میں نے جس خطرناک صورتِ حال کا تذکرہ کیا ہے اسے میں نہ تو مسئلہ لاینحل سمجھتا ہوں اور نہ ہی اپنے آپ کو اس صورتِ حال میں بے بس محسوس کرتا ہوں کہ مومن کے لیے اللہ کی مدد سب کچھ ہے۔ البتہ خلوص شرط ہے اور امید کی یہی وہ کرن ہے جو مشکل سے مشکل تر حالات میں بھی فتح و نصرت کی طرف لے جاتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں اور بالخصوص امت مسلمہ کی تاریخ میں بے شمار ایسے نازک موڑ آئے ہیں جب اپنی تدبیر اور نصرتِ خداوندی کے باعث امت بڑے سے بڑے خطرات سے بچ کر صاف نکل گئی ہے اور ذرا سی غفلت و بے توجہی نے صدیوں کے لیے خطوں کو اس کے نام و نشان سے خالی کر دیا۔ میرے خیال میں امت مسلمہ ہند آج ایک ایسے ہی نازک مقام پر ہے۔ لیکن میرے لیے جو امر سب سے زیادہ پریشان کن ہے اور جس نے میرے دن کا چین اور رات کی نیند غائب کر دی ہے وہ یہ کہ پوری ملت اسلامیہ ہند، کیا بڑے کیا چھوٹے، کیا علماء کیا دانشور ہر کوئی صورتِ حال کی نزاکت کے اس احساس سے عاری ہے۔

میرے نزدیک موجودہ صورتِ حال سے کہیں زیادہ خطرناک ہمارا اپنا رویہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بابری مسجد پر کفار و مشرکین کا غیر منصفانہ اور جابرانہ قبضہ ہمارے لیے انتہائی دلآزاری کا باعث ہے، یہ سچ ہے کہ آج ہماری بے شمار عبادت گاہوں کے دروازے ہم پر بند کر دیے گئے ہیں اور بے شمار مساجد و مقابر کے انہدام کا عمل جاری ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج ہمارے سرمایۂ حیات قرآن مجید کے خلاف بہتان تراشی کی جا رہی ہے، یہ سچ ہے کہ ہماری محبوب شخصیت رسول مقبول ﷺ کی توہین کے سلسلے جاری ہیں، یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے شخصی اور عائلی قوانین تنقید و مذاق کا ہدف بنائے جا رہے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کے مذاق اڑانے کی ہر ایرے غیرے جچوں اور تنگ نظری اور تعصب کے محافظوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔

اے اللہ کے نام لیواؤ! اے محمد ﷺ کے عاشقو! اے توحید کے فرزندو! تمہارے یہ سارے گلے اور شکوے بجا ہیں، میں انہیں تسلیم کرتا ہوں، لیکن محض گلے اور شکووں سے آج کی دنیا میں مسائل حل نہیں ہوتے، غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار بھی کسی قوم کی قسمت نہیں بدل سکتے۔ اور تم اپنی قسمت کے شاکی کیوں ہو، تمہارے اعتماد کو آخر کیا ہو گیا ہے؟ تم دوسروں کی قسمت لکھنے کے لیے آئے تھے۔ تم یہ کیوں بھول گئے کہ تمہارا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو سکتا ہے، تمہاری زبان اللہ کی زبان ہو سکتی ہے، تمہارے کان اللہ کے کان ہو سکتے ہیں اور تمہاری آنکھیں اللہ کی آنکھیں ہو سکتی ہیں۔ دنیا کی تقدیر تمہارے ہاتھوں میں لکھی جانے والی تھی۔ افسوس! تم ذہنی زوال کی کس انتہا پر پہنچ گئے ہو۔ قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے آج خود اپنی قسمت پر نوحہ کناں ہیں۔ تقدیر کے فیصلے لکھنے والے آج دوسروں سے اپنی تقدیر لکھوانا چاہتے ہیں۔

اے توحید کے فرزندو! آج تم ذہنی، اخلاقی اور روحانی زوال کی جس انتہا پر پہنچ چکے ہو مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری یہ آواز تمہاری جھنجھلاہٹ میں مزید اضافے کا سبب نہ بن جائے۔ تم جن خوش کن نعروں اور مرحبا و تحسین کے عادی ہو چکے ہو مجھے خطرہ ہے کہیں میری یہ باتیں تمہیں مجھ سے متنفر نہ کر دیں۔ تم جس سہل پسندی کے عادی ہو گئے ہو مجھے خوف آتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں جس مشکل راستے کی طرف اشارہ کرتا ہوں وہ تمہاری حوصلہ شکنی کا سبب بن جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس تلخ حقیقت کے

اعتراف کے بجائے اس شخص کی طرف تمہاری انگلیاں اٹھنے لگیں جو تمہاری ہی بھلائی کے لیے تمہیں ایک بڑے خطرے سے آگاہ کرتا ہے تاکہ تم اس غضبناک تباہی سے بچ سکو۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میری یہ باتیں تمہیں انتہائی ناگوار گزریں گی، یہ شاید تمہیں کچھ زیادہ ہی تلخ محسوس ہوں لیکن یقین جانو کہ یہ تمہارے لیے زہر نہیں تریاق ہے۔ اسے دوا کا کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی جاؤ کہ اس میں تمہارے لیے شفا ہے، زندگی ہے۔

اے اللہ کے نام لیواؤ! آخر تم ہندوستان میں زندہ کیوں ہو؟ یہ سرزمین جو دن بہ دن تمہارے اوپر تنگ ہوتی جارہی ہے، جہاں ہر نیا آنے والا دن تمہاری تکالیف میں اضافے کا سبب بنتا ہے، جہاں بھیڑ اور بکریوں کی طرح تمہارے افراد قتل کردیے جاتے ہیں، جہاں دیکھتے ہی دیکھتے تمہاری بستیاں ویران ہوجاتی ہیں، جہاں تمہاری عزت و آبرو، جان و مال اور ایمان کچھ بھی محفوظ نہیں رہ گیا ہے، مجھے بتاؤ کہ ان ساری مصیبتوں کے باوجود تمہارے اندر زندہ رہنے کی تمنا کیوں ہے؟ تمہارا جاہ و حشم تم سے چھینا جاچکا ہے، تمہارا تہذیبی اور مذہبی سرمایہ بہت کچھ لٹ چکا اور جو باقی ہے وہ لٹتا جارہا ہے، تمہاری نئی نسل ایک ایسی زبان میں کلام کرتی ہے جو تم سمجھنے سے قاصر ہو۔ لیکن ان واضح حقیقتوں کے باوجود تمہارے کاروبارِ دنیا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، تم اسی مسرت کے ساتھ جشن کی محفلوں میں شریک ہوتے ہو، مکانوں کی تعمیر اور ان کی آرائش میں مگن رہتے ہو، شادی بیاہ کی تقاریب میں دل کھول کر پیسے صرف کرتے ہو، برقی قمقموں اور آتش بازی جیسے اصراف میں مبتلا ہوتے ہو۔ اس طرح اپنے طرز عمل سے اس بات کا اظہار کرتے ہو کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اگر تم صرف اس لیے زندہ رہنا چاہتے ہو کہ دوسری قوموں کی طرح تم بھی اس دنیا کے مزے لوٹ سکو تو تُف ہے تمہاری زندگی پر۔ کاش کہ ایسی زندگی جینے سے قبل ہی تمہیں موت آلیتی۔ کاش کہ کوئی آسمانی عذاب صفحۂ ہستی سے تمہارا خاتمہ کردیتا تاکہ رسول اللہ کے مقدس مشن کی مٹی تمہارے ہاتھوں پلید ہونے سے بچ جاتی۔

لیکن اگر تمہارا جینا اور مرنا صرف اللہ کے لیے ہے، تم اس لیے زندہ رہنا چاہتے ہو تاکہ انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو، جو اس خطہ ارض پر رہتی ہے، جہنم کے عذاب سے بچانے کا سامان کرسکو اور اس آسمانی پیغام کو عام کرسکو جو تمہیں محمد ﷺ کے ذریعہ ملا ہے تو یقین جانو ایسی زندگی کی صرف ایک خواہش

ہزاروں زندگی کی شمع روشن کر سکتی ہے۔ پھر تمہاری آبادیوں کا تہہ تیغ ہو جانا مہر وماہ وانجم کے لیے باعثِ صد رشک ہو گا۔ لیکن افسوس کہ ایسی زندگی تمہاری خواہشوں کا حصہ ہو تو ہو، تمہاری عملی زندگی میں اس کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ حقیقت تو وہی ہے جس کا اظہار میں نے اوپر کیا ہے۔ افسوس کہ اس ملک میں تم محض ایک قوم کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہو، تم ایک فریق کی حیثیت سے ہندوستان کی آب و ہوا اور اس کے فطری وسائل میں اپنا حصہ طلب کرتے ہو۔ تم حکومت کے ایوانوں میں اپنی نشستیں مانگتے ہو اور محض ایک اقلیت کی حیثیت سے اس ملک میں زندگی کے طالب ہو۔ آج تمہارے دلوں میں کافروں کی ہیبت بیٹھ چکی ہے۔ معاملہ خواہ ایمان و عقائد ہی کا کیوں نہ ہو اظہارِ حق کے واسطے تمہارے بڑے بوڑھوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، سرکار دربار کی مخالفت کے خیال سے ہی ان کے جسموں پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے اور ان میں جو ذرا اپنے ہوش و ہواس برقرار رکھ پاتے ہیں ان بے چاروں کی زبان سے اگر کوئی بات نکلتی ہے تو یہ کہ پولس میں مسلمانوں کو نمائندگی دی جائے تاکہ وہ فسادات میں خود کو محفوظ محسوس کر سکیں، معاشی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں ہمارے نوجوانوں کے لیے مخصوص کوٹا مقرر کیا جائے جو اس ملک میں ان کے معاشی مستقبل کی ضمانت دے سکے۔ کاش کہ تم اور تمہارا خدا تمہاری حفاظت کے لیے کافی ہوتے اور کاش کہ اللہ کے بہترین رزاق ہونے پر تمہارا یقین ہوتا تو کم از کم اغیار کے در کی گداگری سے بچ جاتے اور خدا کے محبوب رسولؐ کی امت دیارِ ہند میں بے آبرو ہونے سے بچ جاتی۔

آخر تم یہ ہاری ہوئی جنگ کب تک لڑتے رہو گے؟ ایک خالص قومی لڑائی میں شکست تمہارا مقدر ہے۔ اس لیے کہ تمہارا مذہبی ڈھانچہ اور تہذیبی سرمایہ ایک قوم کا نہیں ایک نظریاتی گروہ کا ہے۔ پس جب تک تم اپنے ڈھانچے میں ایک بڑی تبدیلی، بنیادی تبدیلی پیدا نہیں کرتے اس وقت تک وہ حقوق بھی حاصل نہیں کر سکتے جو تعداد کے اعتبار سے کوئی دوسری قوم حاصل کر سکتی ہے۔ اس لیے ایک خالص قومی لڑائی میں کامیابی کے لیے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے کئے گئے عہد و پیمان سے دستبردار ہونا ہو گا اور تب شاید تعداد کے اعتبار سے تمہیں تمہارے حقوق مل جائیں گے۔ لیکن جب تک دلوں میں مقدس تمناؤں کی مشعلیں روشن رہیں گی اور جب تک ہر قومی لڑائی میں عین نازک موڑ پر تمہیں اپنی اصل حیثیت کا احساس ہوتا رہے گا، رسول اللہ سے کئے گئے عہد و پیمان یاد آتے رہیں گے، خدا کے حضور پیشی کے خیال

سے تمہارا سر ندامت سے جھکتا رہے گا، اس وقت تک ایک خالص قومی لڑائی میں بھی تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بھلا اس پائیلٹ کے بارے میں تم کیا خیال کرو گے جو پرواز کے خوف سے ہوائی جہاز کو زمین پر چلاتا ہو اور اس سے ٹیکسی کا کام لینا چاہتا ہو۔ جو اپنی ناکارگی کو چھپانے کے لیے ہوائی جہاز کو موٹر میں تبدیل کر دینے پر مصر ہو۔ کچھ یہی حال ذوقِ پرواز سے عاری امت کے موجودہ سربراہوں کا ہے جو پرواز کا ہنر سیکھنے کے بجائے امت کے جہاز کو مانندِ ٹیکسی چلانا چاہتے ہیں۔ پرواز میں خطرہ ضرور ہے لیکن اس کے ذریعہ مدتوں کا سفر لمحوں میں طے ہو سکتا ہے، امت کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل ہو سکتا ہے اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی وہ نظیر دوبارہ دنیا کو دیکھنے کو مل سکتی ہے جس کی مقدس خواہش آج بھی ہر ہندوستانی مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ امت کی زبوں حالی کی چند وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آج امت کا ہوائی جہاز ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہاتھوں لگ گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے ارادوں میں خواہ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں ان سے ہر لمحہ پوری امت کو خطرہ ہے۔ پس جتنی جلد ان ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہاتھوں سے اس جہاز کو نجات مل سکے امت کے حق میں اتنا ہی مفید ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلی چھ سات دہائیوں سے ان ٹیکسی ڈرائیوروں نے امت کے جہاز کو جس بد تہذیبی کے ساتھ استعمال کیا ہے اُس نے اِس کی ہیئت ہی مسخ کر دی ہے۔ یہ نہ تو اب فضاؤں میں اڑان بھر سکتا ہے اور نہ ہی سرعت کے ساتھ زمین پر دوڑ لگا سکتا ہے۔ لہٰذا اب اس کی اصل ہیئت میں لوٹانے کے لیے منظّم کوشش درکار ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس ضروری مرمت کے دوران تمہیں ایسا لگے جیسے پہلی سی زندگی بھی جاتی رہی ہو، ہو سکتا ہے کہ تم جو محض انجن کی گڑگڑاہٹ سے مطمئن رہنے کے عادی ہو گئے ہو، چیخ اٹھو کہ ہمیں سابق حالت ہی میں رہنے دو کہ یہ نیا عمل ان بے ہنگم آوازوں کو بھی روکے دیتا ہے جس سے کم از کم ہماری نفسیاتی تسکین ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ تم شدت احساس سے کانپ اٹھو کہ اس عبوری مرحلے نے رینگنے والی رفتار بھی ہم سے چھین لی ہے، یہ نئی اسکیم کچھ دینے کے بجائے ہم سے بہت کچھ چھین رہی ہے۔ لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا لازمی ہے اور تم خوب جانتے ہو کہ اس زحمت انتظار اور قربانی کے نتیجے میں اگر مقصدِ مطلوب ہاتھ آ گیا، جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، تو پھر تم کو اس ملک میں اپنے حقوق کی بازیابی کی جنگ نہیں لڑنی پڑے گی۔ پھر تم کو مساجد و مقابر کا نعرہ

دے کر کوئی سر پھرا اندھی بھیڑوں کی طرح ہنکا کر نہیں لے جائے گا۔

اے میرے عزیز ترین بھائیو! بابری مسجد کا سانحہ یقیناً ہندوستان میں تمہارے لیے ایک بھیانک مستقبل کی پیش گوئی کر رہا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تمہارا یہ رویہ ہے جس کے ذریعہ تم اس مسجد کی بازیابی چاہتے ہو۔ خدا کی قسم تم ایک بڑی خیانت کا ارتکاب کر رہے ہو، تم اللہ کے گھر کے نام پر اپنی قومی لڑائی کی جڑیں مضبوط کر رہے ہو، افسوس کہ اسلام کی آبرو داؤ پر لگاتے ہوئے بھی تمہیں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ تم ہر قیمت پر اپنی قومی ترقی کا سامان کرنا چاہتے ہو، کاش کہ تم نے ماضی کے تجربات سے کچھ سبق لیا ہوتا۔ تمہارے اسی اندازِ فکر نے محض قومی مفاد کی خاطر ملک کو تقسیم کروالیا، تمہیں اس بات سے تو خوف آتا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں تم معاشی بدحالی کے شکار ہو جاؤ گے، ہندو تم پر حاوی ہو جائیں گے اور اس لیے ایک الگ خطے کا حصول ناگزیر ہوگیا۔ لیکن تمہیں اس بات کی کوئی فکر نہ رہی کہ منقسم ہندوستان کو اگر مسلمانوں نے خالی کر دیا تو عرصۂ دراز تک یہ سرزمین اللہ اکبر کی صداؤں سے خالی ہو جائے گی اور انسانوں کی ایک قابلِ لحاظ آبادی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے سارے راستے یک لخت بند ہو جائیں۔ پھر اس لولی لنگڑی قومی فکر کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا اور خدا کے نام پر مفاد پرستوں کے حاصل کردہ ملک پاکستان میں جو کچھ ہو تا رہا ہے وہ خدا کا عذاب ہے، ایک بڑی خیانت کی سزا ہے۔ کاش کہ تم اس سے کچھ سبق لو۔ ان قومی مفاد پرستوں نے دشمنانِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ دیکھو پاکستان میں اسلام فیل ہوگیا۔ جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کو داخل ہونے کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا گیا۔ روزِ اول سے جس خطرناک غلطی کو روا رکھا گیا وہ یہ تھی کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی تنظیم نظریاتی بنیادوں پر کرنے کے بجائے نام نہاد قومی بنیادوں پر کی گئی۔ جب قوم سے وابستگی اللہ سے وابستگی پر سبقت لے جائے، جب قومی مفاد سب کچھ قرار پائے تو ایسی صورت میں قوم کے اندر مختلف فرقوں کا وجود میں آنا اور ان کے درمیان باہمی کشمکش اور پھر خوں ریزی کا ہونا عین فطری ہے۔ میں نے تقسیم کے سانحہ کا قدرے تفصیل سے اس لیے ذکر کیا کہ آج پھر مجھے اسی قسم کے خود غرضانہ اور نفس پرستانہ قومی نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ آج پھر قوم سے وفاداری جسے ہم نے "ملی ذمہ داریوں" کا نام دے رکھا ہے، اللہ سے وفاداری پر سبقت لے جا رہی ہے۔

میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مسحور کن قومی نعرے اور قومی مفاد کے لیے کی جانے والی کوششیں تمہارے درد کا درماں نہیں ہوسکتیں۔ ایک خالص قومی لڑائی میں تمہاری شکست یقینی ہے، افسوس کہ تمہاری اخلاقی پستی نے شکست و فتح کی تمیز بھی تم سے چھین لی ہے۔ ذرغور کرو! اس غلط رویے کے ذریعے ایک طویل قومی لڑائی کے نتیجے میں اگر تم نے بابری مسجد حاصل کر بھی لی تو اس سے اسلام کا کیا بھلا ہو جائے گا؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم مقابل قوم کے سامنے سینہ پھلا کر کہہ سکو گے کہ تم ایک زندہ قوم ہو۔ تم اپنے قومی غرور کے نشے میں سرشار دوسروں پر حقارت بھری نظروں کے تیر پھینک سکو گے، لیکن یہ عمل جسے تم اپنی فتح سمجھ بیٹھے ہو دراصل تمہاری سب سے بڑی شکست ہوگی کہ اس پورے عمل میں تم نفرت کی جو فضا تیار کرو گے اور دوسری قوموں کے تعصب کی جس حد تک آبیاری کر چکے ہو گے، جس کا سلسلہ تمہارے سیکولر قوم پرست رہنماؤں کے ذریعہ شروع ہو چکا ہے، تو یقین جانو نفرت اور تنگ نظری اور قومی تعصب کا یہ بھیانک سیلاب داعیانہ تشخص بھی بہالے جائے گا۔ نتیجتاً ہندوؤں کی ایک بڑی اکثریت جس میں ابھی دعوتِ دین کے خاصے مواقع موجود ہیں اور جو وسیع النظری کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہے انہیں بھی تم ہندو تعصب کی دیواروں میں محصور کر دو گے۔ اس طرح قومی خطوط پر بابری مسجد کی بازیابی ملک میں ایک طویل عرصے کے لیے دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم کا دروازہ بند کردے گی اور پھر یہ سلسلہ یہیں نہ رکے گا، مقابل قوم کا احساس شکست اس کے اندر انتقام اور نفرت کا شدید جارحانہ داعیہ پیدا کردے گا اور پھر تمہیں اپنے تعمیر یافتہ قومی تعصب کے خول میں بھی پناہ نہ مل سکے گی۔

تمہاری سادہ لوحی پر ترس آتا ہے، تم فتح کی آس لگائے شکست کے راستے پر گامزن ہو۔ ”نصر من الله“ کے نعرے لگاتے اور خود میں مطمئن رہتے ہو، تمہارے دلوں میں پرواز کی تمنا ضرور ہے اور تم بلندی کے طالب بھی ہو۔ البتہ اس حقیقت کا ادراک تمہیں جتنا جلد ہو جائے بہتر ہے کہ بلندی کے شوق میں تم جس مشین پر سوار ہو وہ دراصل کوئلے کی کان میں لگی ہوئی لفٹ ہے جو ہر لمحے تمہیں سطح زمین سے نیچے کی طرف لیے جا رہی ہے۔ تم حرکت سے مطمئن ہو اور یہ نہیں دیکھتے کہ تمہاری حرکت کا رخ کیا ہے۔ تم اپنی تمناؤں کی دنیا کو حقائق کے تابع کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہو کہ حقائق تمہاری آرزوؤں کے تابع ہو جائیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ جس طرح کلکتہ جانے والا مسافر بمبئی جانے والی گاڑی میں

سوار ہو جائے، کلکتہ پہنچنے کی کیسی ہی تڑپ اس کے دل میں کیوں نہ ہو وہ بالآخر بمبئی ہی پہنچے گا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم عملی کوشش تو قومی غرور کی نشو ونما کی کریں اور توقع اعلائے کلمۃ الحق اور اسلام کی سربلندی کی کریں۔ کاش روزمرہ کے حقائق کی طرح یہ بات بھی تمہاری سمجھ میں آجاتی۔

یہ خالص قومی لڑائی جسے تم جوشِ مسلمانی میں کفر واسلام کی جنگ سمجھ بیٹھے ہو، ذرا دیکھو اس کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہے، اس کی قیادت کون لوگ کر رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جس نے کمپیوٹر کا فقط نام سنا ہو، اس کے دل میں کمپیوٹر کی اعلیٰ کارکردگی کے لیے جذبۂ تحسین بھی موجود ہو لیکن وہ اس کے طریقۂ عمل کی الف بے سے بھی ناوقف ہو، ایک ماہر کمپیوٹر کہلا سکے؟ کیا عملی زندگی میں ایک ایسے شخص کو، جس کے پاس اس سلسلے کی کوئی شخصی تربیت بھی نہ ہو، تم اپنا قیمتی کمپیوٹر حوالے کئے دیتے ہو؟ اور کیا تم ایک ایسے شخص کے برآمد کردہ نتائج پر یقین کر لیتے ہو؟ اگر نہیں تو دین کے بارے میں تم اتنے بے حس کیوں ہو، تم ان ناتجربہ کاروں کے ہاتھوں امت کی باگ ڈور کیوں حوالے کئے دیتے ہو جنہیں نہ تو راہ کی آشنائی ہے اور نہ ہی اس راہ کی دشوار گزاریوں کا علم۔ جنہیں نہ تو امت کی حقیقی حیثیت کا احساس ہے، اور نہ ہی جو خدا اور اس کے رسول کی متعین کردہ راہوں پر امت کے قافلے کو لے جانے کے خواہاں ہیں اور نہ ہی خود ان کی ذاتی زندگی میں اسلام چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ کبھی تقاریر کی حد تک اس کا تذکرہ غلط انداز آ بھی گیا تو اس طرح گویا اسلام اللہ کا پیغام نہیں بلکہ ہمارا مجموعی قومی تعصب ہے جو ہر قومی لڑائی میں بجرنگ بلی کے نعروں کو شکست دے سکتا ہے۔

موجودہ قیادت علی الاعلان سیکولر ہے، یہ سیکولرازم کے راستے تمہیں تمہاری عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا سبز باغ دکھاتی ہے۔ یہ تم سے تمہاری کھوئی گئی جاہ وحشم اور عزت و وقار واپس دلانے کی بات کرتی ہے جو ان راستوں سے ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ کارخانہ تو موٹر سازی کا لگایا جائے، ساری تیاریاں موٹر سازی کی ہوں، تربیت یافتہ افراد موٹر سازی کے ماہرین ہوں اور ان ساری تیاریوں کے بعد اچانک اس کارخانہ سے ہوائی جہاز کے پرزے ڈھل کر نکلنے لگیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ سیکولرازم کے کارخانے سے اسلام ڈھل کر نکلنے لگے یا کوشش تو سیکولرازم کی سربلندی کی ہو اور نتیجہ اسلام کی سربلندی کی شکل میں سامنے آئے، لیکن افسوس کہ تم ان واضح حقیقتوں سے صرف نظر

کرتے ہو۔ تم سیکولرازم کے محافظوں کو دانستاً اسلام کا محافظ سمجھ بیٹھے ہو۔

قومی قیادت کے پلیٹ فارم سے بار بار انتہائی واضح الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار ہو چکا ہے کہ بابری مسجد ایک علامت ہے، یہ ایک بڑی طویل لڑائی کا نقطہ آغاز ہے، یہ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ ہندوستان میں سیکولرازم کی بنیادیں ہلنے لگی ہیں۔ تم سے سیکولرازم کے احیاء کے لیے سربکف ہوکر نکلنے کی اپیل کی جاتی ہے اور تم بے سوچے سمجھے اس طویل جنگ میں کود پڑتے ہو۔ اس لیے کہ تمہیں سیکولرازم میں سکون نظر آتا ہے، اپنے قومی مفاد کا تحفظ نظر آتا ہے، تم سیکولرازم کو اپنی حفاظت کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ہو، سیکولرازم تمہارا محافظ ہے، تمہارا خدا تمہارے لیے کافی نہیں۔ فکر و نظر کی اس پستی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تم ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہو۔ پس جو کوئی بھی تم سے زندگی بخشنے کا وعدہ کرتا ہے تم اس کے پیچھے ہو لیتے ہو۔ کاش کہ تم زندگی کے اتنے آرزومند نہ ہوتے تو شاید اس حقیقت کو سمجھ پاتے کہ زندگی کے نام پر جانے والا یہ راستہ دراصل موت کی مہیب خوفناک گھاٹیوں میں جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ کاش کہ اب بھی تم اپنے قدم درست کر سکو۔

بالفرضِ محال ایک طویل جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں اگر تم اس سیکولر جمہوریت کی ہلتی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو کیا تمہارا اسلامی وقار بحال ہو جائے گا؟ کیا تمہاری عظمتِ رفتہ لوٹ آئے گی؟ کیا تم اس لائق ہو سکو گے کہ دنیا کے سامنے خلافت علی منہاج النبوۃ کی عملی تعبیر پیش کر سکو؟ یہ تو خیر وہ چیزیں ہیں جو اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ ان پست مقاصد کی طرف آؤ جن کے لیے تم یہ جنگ لڑ رہے ہو اور جن کے لیے تم بڑی سے بڑی قربانیوں کی بات کرتے ہو۔ کیا ایک واقعی سیکولر جمہوریت کا قیام تمہاری محض دنیاوی عظمت کی گارنٹی بھی دے سکے گا؟ ایک جمہوری نظام میں دوسری قوموں کے مقابلے میں آخر تمہارا وجہ افتخار کیا ہوگا؟ قوت کی اس لڑائی میں یا تو بڑی قوتیں تمہیں نگل لیں گی یا اپنی بے بسی کو تسلیم کرتے ہوئے تمہیں ان سے سمجھوتہ کرنا ہوگا اور پھر یہ حقیقت تم پر منکشف ہو جائے گی کہ۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

یقیناً یہ صورتِ حال تمہارے لیے انتہائی پریشان کن ہوگی، پیچھے مڑکر اس طویل جنگ کی "برکتوں"

پر نظر ڈالو گے، ناکامی کا شدید احساس تمہارے قویٰ شل کر دے گا، تم میں اتنا حوصلہ اور کس بل بھی نہیں رہ جائے گا کہ اپنی حفاظت ہی کر سکو اور تب کف افسوس ملنے سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

دلوں کا حال یقیناً صرف اللہ کو معلوم ہے لیکن تمہارے رہنماؤں کے قول و فعل سے جو کچھ بالکل عیاں ہے، اس کے بعد دل کے حالات جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ان کے متواتر بیانات اور طریقۂ کار نے یہ واضح کر دیا ہے کہ دراصل ان کے عزائم کیا ہیں، وہ کس قسم کی جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان واضح حقیقتوں کے باوجود تم کرتے کیا ہو۔ شاید تمہیں خدا کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ عذر بھی نہ مل سکے کہ اے خدایا ہم نے دھوکہ کھایا، ہمارے رہنما ہمیں اسلام کے نام پر فریب دیتے رہے اور ہماری گردنوں کے نذرانوں سے کفر کو استحکام بخشتے رہے۔ اس لیے کہ حقائق آج بھی تم پر واضح ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے رہنماؤں کے مشترکہ پلیٹ فارم سے بار بار یہ آواز آرہی ہے کہ ہم اس جنگ میں ہر اس شخص، پارٹی یا گروہ کا تعاون لیں گے جو کسی حد تک بھی ہماری تعاون کی درخواست پر لبیک کہے گا اور تم دیکھتے ہو کہ غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے غیر مسلم نمائندے تمہارے جلسوں میں حمایت کے اعلان کے لیے آتے ہیں، وہ اس جنگ میں اپنی شرکت اور تمہاری مدد کا وعدہ کرتے ہیں۔ تم ان گرما گرم تقریروں سے باغ باغ ہو جاتے ہو، تم دماغ سے خالی اور اعتماد سے عاری ہو، ہر مسحور کن نعرے پر ناچ اٹھتے ہو، اور اس طرح اپنی کمزوریوں سے دوسروں کے لیے سیاسی استحصال کا موقع فراہم کرتے ہو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ تمہاری مدد کے وعدے کرنے والا کون ہے۔ آخر تمہاری مساجد اور قرآن کے تحفظ میں انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جن کا سرے سے اس پر کوئی ایمان ہی نہ ہو۔ آخر تم کون سی اسلامی جنگ لڑنا چاہتے ہو جس میں کفر بھی شانہ بہ شانہ تمہاری حمایت کا اعلان کرتا ہے۔ افسوس کہ غیر اسلامی قوتوں کے تعاون سے ایک خالص غیر اسلامی قومی لڑائی کو تم ایک مذہبی جنگ سمجھ بیٹھے ہو۔ اللہ اکبر کے نعرے آج تمہارے ہاتھوں کتنے مظلوم ہیں۔ کاش کہ تم اللہ اکبر کے نعروں کا سہارا نہ لیتے، تم پر جو گزرتی سو گزرتی کم از کم اسلام کی صورت مسخ ہونے سے بچ جاتی۔

رہے وہ لوگ جو امتِ مسلمہ ہند کو اندھی بھیڑوں کی طرح ہنکا کر لے جانا چاہتے ہیں، جو ان کی گردنوں کے فوارے سے اپنی خواہشات کے باغ سیراب کرنا چاہتے ہیں اور جو بے بس امت کی لاش پر

ہوا و ہوس کے محل تعمیر کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ اس حقیقت کو جتنا جلد سمجھ لیں ان کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے کہ وہ خود غرضی کی انتہائی کھوکھلی بنیادوں پر استحکام کے فریب میں مبتلا ہیں۔ اگر امت کے جمہور کو ان کے خود غرض مذموم ارادوں کی بھنک بھی لگ گئی تو ان کی سیاست کا سارا پانسہ پلٹ جائے گا، پھر شاید انہیں ان کے وجود کے تحفظ کی بھیک بھی نہ مل سکے اور عین ممکن ہے ان کا یہ خوف حقیقت میں تبدیل ہو جائے۔ ان ناعاقبت اندیش رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت سے صرفِ نظر نہ کریں۔ وہ محمدؐ کی امت کے جذبات سے مزید نہ کھیلیں کہ محمدؐ کی امت کو اگر ہوش آگیا اور یہ بیدار ہوگئی تو شاید کعبہ کے غلاف میں لپٹنا بھی انہیں زندگی کی ضمانت نہیں دے سکے گا۔

تم دیکھتے ہو کہ بابری مسجد کی بازیابی کی ایک اپیل پر لاکھوں مسلمان دہلی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان میں قابلِ لحاظ تعداد ان سادہ لوح مسلمانوں کی ہوتی ہے جو اپنی ساری کج فہمی کے باوجود انتہائی خلوص کے ساتھ اللہ کے گھر کی بازیابی کے لیے آتے ہیں، جن کا نہ کوئی سیاسی عزم ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی دنیاوی مقصد۔ جو انتہائی خطرناک ماحول میں اپنی جان کو داؤ پر لگا کر اللہ کے گھر کے نام پر تمہاری آواز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ تم ان مخلص روحوں کا سودا کرتے ہو۔ تم میں سے ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس بھیڑ کی قیمت وصول کر سکے۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بو ذر و دلق اویس و چادر زہرہ

امت کے بیچ کھانے کے عمل میں بھی تم انتہائی بد تہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ سروں کی بہار دیکھ کر تمہارے اندر کا آدم خور شیطان قہقہے لگاتا ہے، تمہارے اسٹیج سے بھانت بھانت کی خوفناک آوازیں آتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے بابری مسجد کا اصل قائد میں ہوں اور وہ جو مشہور ہو گیا ہے اس کی شہرت خواہ مخواہ ہے۔ کوئی کہتا ہے واہ بھئی واہ معاملہ تو میں نے شروع کیا تھا، فضا میں نے بنائی تھی، مقامی طور پر اہمیت میری تھی اسے وہ کیسے لے اڑا جس کا شہرہ اب عام ہے۔ کوئی کہتا ہے فلاں شخص اس لیے اس تحریک کا قائد نہیں ہو سکتا کہ اس کا تعلق فلاں پارٹی سے ہے۔ تو کوئی کہتا ہے خود فلاں صاحب جو ایسا کہتے ہیں ان کا تعلق سرکار دربار سے ہے۔ تو کوئی کہتا ہے بابری مسجد خود اس تحریک کی قائد ہے اسے کسی قائد کی

ضرورت نہیں۔ اس طرح اسلام اور اللہ کے گھر کے نام پر تم کمال بد تہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہو، اسلامی اتحاد کی غلط اور مسخ شدہ شکل دنیا کے سامنے پیش کرتے ہو، محض اپنی دنیا کے حصول کے لیے امت کی اندرونی کمزوریوں کو طشت از بام کیے دیتے ہو۔ افسوس کہ تم امت کے راز کو برسرِعام نیلام کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

اے میرے عزیز ترین بھائیو! آج تم ایک عجیب افسردہ صورتِ حال سے دوچار ہو۔ اغیار سے جو خطرہ تھا وہ تو ہے ہی۔ اپنے بھی تمہارے استحصال کے درپے ہیں، راہیں مسدود نظر آتی ہیں، آخر گھپ اندھیرے میں تم کب تک ٹامک ٹوئیاں مارتے رہوگے۔ آج تم حالات کے ہاتھوں کتنے بے بس بنادیئے گئے ہو، اس احساس نے مجھے پریشان اور مضطرب کر رکھا ہے۔ لیکن میرا محض اضطراب بھی تمہارے لیے کسی خوشگوار تبدیلی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ آؤ اللہ سے توفیق اور نصرت کی دعا مانگو۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے ۔۔۔ امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین جو نکلا تھا بڑی شاں سے وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

لیکن اے میرے بھائی مجھے تم سے اگر کوئی امید ہے تو وہ صرف اس لیے کہ تم میں سے اکثر لوگ اللہ کے گھر کی بازیابی کے لیے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ تمہارے اندر اللہ کے نام پر قربان ہونے کا جذبہ، وقتی ہی کیوں نہ سہی، پایا جاتا ہے۔ تم آج بھی اس گئی گزری حالت میں اللہ کے گھر کو اپنی گردنوں پر ترجیح دینے کا عزم رکھتے ہو۔ اور سچ پوچھو تو دل موہ لینے والے تمہارے اسی مخلص عمل نے مجھے اس بات پر مجبور کیا ہے کہ تمہارے سامنے باتوں کو صاف صاف بیان کردوں اور تمہیں خلوص کے سوداگروں سے بچانے کے لیے مجھ سے جو کچھ بن پڑے ضرور کروں۔ تمہارے اس مخلصانہ عمل کو ایک سمت ملنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہوگیا تو یقین جانو کہ ساری کی ساری سرزمین ہند اللہ کی مسجد میں تبدیل ہوجائے گی۔

ہوسکتا ہے میری ان باتوں کی مخالفت پر تمہارے سمجھدار لوگ بھی آمادہ ہوجائیں کہ اتنی سچی باتوں کی اس وقت ضرورت نہ تھی۔ ہوسکتا ہے انہیں ان باتوں سے قومی اتحاد کی بنیاد ہلتی ہوئی محسوس ہو اور ایسا لگے جیسے میں وقتی اتحاد کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔ لیکن میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تم جسے اتحاد سمجھ

بیٹھے ہو وہ دراصل انتشار ہے، غیر تربیت یافتہ لوگوں کی بھیڑ ہے۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ تمہارے قائدین اور عوام قول و عمل میں کس افسوسناک انتشار کا شکار ہیں۔ عملی ہم آہنگی تمہاری صفوں میں مفقود ہے۔ اس غیر تربیت یافتہ بے ہنگم بھیڑ سے اگر تم یہ توقع رکھتے ہو کہ معرکہ تمہارے حق میں ہوگا تو یہ تمہاری خطرناک خوش خیالی ہے۔ تم کہتے ہو ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دراصل تم حقائق سے منہ موڑتے ہو، تم صرف اچھی خبریں سننا چاہتے ہو۔ تم اس اتحاد کو اپنی تاریخ کا عظیم الشان اتحاد کہتے ہو اور لوگوں کو دعوت دیتے ہو کہ بھلا برا جیسا بھی اتحاد ہے اس میں شامل ہو جاؤ۔ لیکن تم یہ نہیں دیکھتے کہ اس اتحاد کی واقعی حقیقت کیا ہے اور یہ تمہیں کہاں لیے جا رہا ہے۔ تم اتحاد کے فریب میں مبتلا اجتماعیت کی آواز لگانے والے ہر گروہ کے ساتھ ہو لیتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ اب اتحاد وجود میں آگیا ہے تو یقیناً کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اتحاد کفر کے لیے وجود میں آیا ہے یا اسلام کے لیے۔ عرصے سے اتحاد تمہاری آرزوؤں کا حصہ ہے۔ پس جو کوئی بھی اتحاد کا نعرہ لگاتا ہے تم اس کے پیچھے ہو لیتے ہو۔

تم ہر قیمت پر اپنی فتح کے خواہاں ہو۔ اس کے لیے اصولوں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے، آج اسی اتحاد کے ایک گوشے سے ہریجن مسلم اتحاد کی باتیں آرہی ہیں۔ تم اس فریب میں مبتلا ہو کہ شاید ہریجنوں کے ساتھ اتحاد تمہاری قوت میں اضافہ کر دے گا، شاید تم اس کے ذریعہ ہندو احیاء پرستی کے سیلاب پر بندھ باندھنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ تم اپنے اس مکروہ عمل کو اسلامی لباس پہنانے کے لیے ظالم اور مظلوم Oppressor اور Oppressed مستضعفین اور متکبرین جیسے الفاظ کا سہارا لیتے ہو اور یہ نعرہ بلند کرتے ہو کہ ظالم کے مقابلے میں مظلومین کو متحد ہو جانا چاہیے۔ ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقات سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہو اور اپنے اس عمل کو مظلومین کی مدد کا اسلامی فعل گرداننے سے بھی باز نہیں آتے۔ تم یہ بالکل بھول جاتے ہو کہ مظلومین کی مدد کے اس احساس کے پس پردہ صرف اور صرف تمہاری خود غرضی کارفرما ہے۔ مظلومین کی مدد اور نصرت کا یہ جذبہ دراصل تمہارے اپنے احساسِ عدم تحفظ کی پیداوار ہے۔ تمہارا مکروہ عمل مظلومین کی مدد کے ایک خالص اسلامی حکم کو اپنی خود غرضی کے ساتھ ملا کر ایک ایسا معجون تیار کرتا ہے جس سے اس عظیم اخلاقی حکم کی تصویر مسخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح تم اسلام اور اسلامی تاریخ کی ایک بالکل ہی غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہو۔ آخر یہ کیسے

ممکن ہے کہ دو مخالف نظریات کی حامل جماعتیں، جن کا اپنا واضح طرز فکر ہو کسی ایک مقصد کے لیے باہم متحد ہو جائیں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں اپنے اپنے اصول و نظریات سے جزوی دستبرداری کے نتیجے میں کسی سمجھوتے پر پہنچ سکیں۔ لیکن ایسی صورت میں جو ملغوبہ تیار ہو گا وہ اسلام نہیں ہو گا اسے کچھ اور نام دینا پڑے گا۔ بھلا تم یہ کیسے توقع کرتے ہو کہ ٹرین میں مخالف سمت سے جڑنے والا انجن اس کی رفتار میں مزید اضافے کا سبب بن جائے گا۔ البتہ اس کے نتیجے میں یا تو پوری ٹرین سکونی حالت میں واپس آجائے گی یا ان میں جو مضبوط انجن ہو گا وہ ٹرین کو اپنی سمت میں لے جائے گا۔ اس جمہوری نظام میں جہاں ہریجن تعداد میں تم سے بہت زیادہ ہیں، عین ممکن ہے گاڑی کا ہریجن انجن اسے اپنی سمت میں لے اڑے۔ اُس وقت تمہارے حصے میں بے بسی کے علاوہ کچھ بھی نہ آئے گا۔ ماضی میں ایک ایسا ہی تجربہ تمہارے بزرگوں نے کانگریس کے ساتھ اتحاد کی شکل میں کیا تھا جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے، تم آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہو، کاش کہ اس تجربے میں تمہارے لیے سبق ہوتا۔

ایک دوسرا طرزِ فکر جسے اب تمہارے درمیان مقبول ہونے کے آثار ہو چلے ہیں وہ ہریجن اور برہمنوں کے مابین منافرت کی پرورش کا خیال ہے۔ اس میں تم بہت زیادہ کشش محسوس کرتے ہو اس لیے کہ یہ تمہاری کوتاہ اندیش غیر اسلامی قومی سیاست کے چوکھٹے میں فٹ آتا ہے۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ ہریجنوں اور برہمنوں کے درمیان نفرت کا بیج بو کر اپنے قومی استحکام کا سامان کر لوگے لیکن تم اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کیے دیتے ہو کہ نفرت بونے والے نفرت ہی کی فصل کاٹ سکتے ہیں محبت کی نہیں۔ محمد ﷺ کی امت کی اس سے بڑی اور کیا بد نصیبی ہو سکتی ہے کہ وہ نفرت کی اشاعت میں اپنی عافیت جانے۔ محبت کے پیغامبر کی امت کے لیے اس سے بڑا سانحہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ نفرت کی تبلیغ میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ تم یہ کیوں بھولے جاتے ہو کہ تم محبت کا پیغام لے کر آئے تھے، تمہارا کام دلوں کو جوڑنا ہے نہ کہ توڑنا۔ تمہارے رسول نے گالیاں کھا کر بھی دعائیں دی ہیں۔ طائف کے اس انتہائی سخت دن بھی جب رحمتِ عالم کا جسم لہولہان تھا، جب حالت یہ تھی کہ جوتوں میں خون جم گیا تھا اس شام بھی طائف سے لوٹتے ہوئے نبی رحمت نے اہل طائف کی ہدایت کے لیے دعائیں کی تھیں حالانکہ وہ اگر چاہتے تو ان کی ایک بد دعا اہلِ طائف کا صفایا کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ عمل نہ تو رحمت کے

پیغمبر کو زیب دیتا تھا اور نہ ہی اس کی امت کے شایان شان ہے۔ اگر کانٹوں کے جواب میں تم بھی کانٹے بچھاتے رہے تو یقین جانو یہ دنیا صرف کانٹوں سے بھر جائے گی اور اس دنیا میں پھول کہیں بھی نظر نہ آئیں گے، کیا تم ایک ایسی ہی دنیا کے آرزو مند ہو؟

افسوس کہ تمہارا جوہر قابل بھی ہوا و ہوس کا شکار ہو گیا۔ تمہارے درمیان چند ایسے نظریاتی گروہ موجود تھے جن سے بجا طور پر توقع کی جاتی تھی کہ جب تم قومی تعصب کی دیواروں میں خود کو محصور کر رہے ہو گے، جب تم خود اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہو گے، وہ تمہارا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے کیے گئے عہد و پیمان کی یاد دہانی کرائیں گے۔ لیکن افسوس بتدریج یہ نظریاتی گروہ بھی اس مقام پر آپہنچے ہیں جہاں ان میں اور عامۃ الناس میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہ گیا ہے۔ یہ تمہاری ملی تاریخ کا کتنا بڑا سانحہ ہے کہ تمہارے درمیان چند نفوس پر مشتمل ایک ایسا گروہ بھی نظر نہیں آتا جو تمہیں اللہ کے رستے کی طرف بلائے اور اللہ کے دین کے لیے خالص ہونے کی دعوت دے۔ اگرچہ کہیں کہیں اعلائے کلمۃ الحق اور اقامتِ دین کی باتیں اب بھی ہوتی ہیں لیکن بجھے دلوں اور تھکے حالوں سے۔ یہ روح سے خالی اور عمل سے عاری خوبصورت الفاظ ہیں، ان میں پہلی سی بات ہے اور نہ ہی ان کو کہنے والی پہلی سی زبانیں ہیں اور عملاً جو کچھ ہے وہ اسی قومی تعصب کے فروغ کی کوشش ہے جس کے انجام کی تباہی سے وہ خوب واقف ہیں۔

یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ وہ لوگ جو دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اٹھے تھے جنہوں نے زمانے کے مستحکم نظام ہائے حیات کو چیلنج کیا تھا، جو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کی دولت سے مالا مال وقت کی بڑی سی بڑی طاقتوں سے ٹکر لینے کا عزم رکھتے تھے، جنہیں اسلامی نظام کے علاوہ ہر نظام سے الجھن ہوتی تھی، خواہ ہندوستان کا سیکولر نظام ہی کیوں نہ ہو، رفتہ رفتہ اس مقام پر جا پہنچے ہیں جہاں اسلام کو سیکولرازم کے چوکھٹے میں فٹ کرنے اور اسے موجودہ سیکولر نظام کے تابع کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ جنہیں ''سیکولر مسلمان'' اور ''اسلامی سوشلزم'' جیسی ترکیبوں سے بھی ابکائی آتی تھی آج اسلام اور کفر کا ملغوبہ بلا تکلف نگل جاتے ہیں۔ ہندو رہنماؤں کو اپنی قومی جنگ کا قائد گردانتے ہیں اور اس شرط پر ہندو امیدواروں کو ووٹ دینے کی تبلیغ کرتے ہیں کہ وہ ان کے مقاصد سے متفق ہوں اور ان کے کاز

سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں دو ہی باتیں ممکن ہیں یا تو وہ ہندوؤں کے لیے اسلام کا ایک قابلِ قبول ایڈیشن تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں یا اپنے داعیانہ رویے سے انحراف کے نتیجے میں ایک ایسے مقام پر جا پہنچے ہیں جہاں غیر اسلامی قوتوں کو اپنا ہمدرد و غمخوار بنانا ممکن ہے۔

جو چیز ان نظریاتی گروہوں کو عامۃ الناس سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کے اپنے نظریاتی گروہ ہونے کا احساس ہے، شریک تو اس قومی لڑائی میں وہ بھی برابر کے ہیں لیکن کچھ شکوک و شبہات کے ساتھ۔ البتہ یہ شبہات اتنے قوی نہیں کہ عمل کی راہیں متعین کر سکیں۔ تم دیکھتے ہو کہ عین لڑائی میں انہیں اپنے نظریاتی گروہ ہونے کا احساس ہوتا ہے، وہ اس قومی لڑائی سے علیحدہ رہنے کا ایک کمزور سا فیصلہ بھی کرتے ہیں، لیکن اس تحریری صفائی کے باوجود ان کے نمائندے اس قومی جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ بجھے دلوں سے ہی سہی قومی تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ ان کا بھی ہوتا ہے۔ یقیناً ان نظریاتی گروہوں میں ابھی ایسی مخلص روحیں موجود ہیں جنہیں اس بھیانک غلطی کا احساس ہو گا، لیکن یہ شاید اتنے آگے جا چکے ہیں کہ واپس آنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ضمیر انہیں جھنجھوڑتا ہے، کچوکے لگاتا ہے اور انہیں یقیناً واپسی کا خیال بھی آتا ہے لیکن اٹھتے قدم ہر مرتبہ یہ سوچ کر رک جاتے ہیں کہ قوم پر اس کا رد عمل کیا ہو گا؟ غلطی ہی سے سہی، جن قومی بنیادوں پر امت کی نشو و نما ہوئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ایسے موقع پر جب قومی تعصب اپنی انتہا پر ہے ان کا لوٹ آنا قوم کی ناراضگی کا سبب بن جائے۔ افسوس کہ اللہ کا خوف قوم کے غضب کے مقابلے میں ماند پڑ گیا ہے۔

میرے عزیز ترین مخلص بھائیو! میں نے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن کی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں نے خود کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے صرف تمہیں وہ سبق یاد دلانے کی کوشش کی ہے جسے تم بھول چکے ہو، خدا اور اس کے رسول سے کیئے گئے عہد و پیمان کی طرف توجہ دلائی ہے جو تمہارے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے، کوشش کی ہے کہ تمہیں قومی تعصب کے اس جہنم سے بچا سکوں جس کی طرف تم غیر شعوری طور پر گامزن ہو۔ ایک ایسی خطرناک صورت حال میں جب کہ نظریاتی گروہوں میں بچی کھچی زندہ روحیں بھی قومی غضب کی متحمل نہیں، ان کا داعیانہ تشخص قومی تعصب کے سیلاب میں بہہ چکا ہے، میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ہندوستان جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسولِ مقبول نے فرمایا تھا کہ

مجھے ہند سے خوشبو آتی ہے، اس ہند کے مستقبل کا کیا ہوگا؟ صورتِ حال انتہائی نازک ہے، یقین جانو کہ اگر تم نے ابھی اپنے قدم درست نہ کئے تو مزید آگے جانے کے بعد پیچھے آنا مشکل ہو جائے گا اور پھر جو کچھ ہوگا قلم میں قوت نہیں کہ اسے بیان کر سکے، کاش کہ تم خدا کے غضب سے ڈرو!

البتہ جو امر مجھے تقویت پہنچاتا ہے وہ یہ کہ آج بھی تمہارے عامۃ الناس کی اکثریت اللہ کے گھر کے لیے اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے آمادہ ہے اور یہی وہ عمل ہے جس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ ان مقدس روحوں کو دنیا و آخرت کے خسارے سے بچانے کا سامان کروں اور انہیں دعوت دوں کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے اور صرف اللہ کے لیے خالص کرلیں۔ میں نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اللہ نے جو احساس میرے دل میں ڈالا ہے جو دراصل اس کی امانت ہے، جوں کا توں اس کا اظہار تمہارے سامنے کردوں کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس کی امانتوں میں خیانت کا مرتکب ہوتا۔ میرے بھائی! میں اگر چاہتا تو میں بھی کوئی مقبول عام قومی نعرہ دے کر تمہاری آنکھوں کا تارا بن جاتا، تمہارا ہر دلعزیز رہنما قرار پاتا، میری ہر بات تمہارے نزدیک حکمِ خداوندی کا درجہ رکھتی پھر میں تمہارے سروں کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کر سکتا تھا، لیکن ایسی صورت میں اپنے خدا کو میں کیا جواب دیتا؟ یہی وہ بنیادی محرک ہے جو صاف گوئی کے اس پورے عمل میں میرا معاون رہا ہے۔ کاش! کہ تم اس درد کو سمجھ سکو۔

✡ ✡ ✡

۳

۱۹۸۹ء کے اوائل میں دہلی کے ماؤلنکر ہال میں بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے قائد سید شہاب الدین اور ان کے رفقاء کی جانب سے ہندوستانی مسلمانوں کا ملک گیر سیاسی کنونشن منعقد کیا گیا تھا جس میں اہل فکر مسلمانوں کو ایک نئی مسلم سیاست پر غور و فکر کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ مصنف نے اس موقع پر ہندوستانی مسلمانوں سے الحاج وزاری کے ساتھ قرآن مجید کو نئی سیاست کے لئے کتاب ہدایت کے طور پر قبول کرنے کی درخواست کی تھی۔ وہ اسٹیج پر اپنے ہاتھوں میں قرآن مجید کا ایک نسخہ لے کر برآمد ہوئے جس نے ہندی مسلمانوں کے اس جلسے پر چند لمحوں کے لئے حیرت واستعجاب کے ساتھ ایک ولولہ انگیز ایمانی کیفیت پیدا کردی۔ ذیل کا خطبہ اسی تقریر کا تحریری ورژن ہے جو بعد میں کتابچہ کی شکل میں افادۂ عام کی غرض سے شایع کیا گیا تھا۔

ایمانی سیاست کی راہ

خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے، قیامت سر پر آگئی ہے، الیکشن کا صور اب پھنکا ہی چاہتا ہے۔ ملکی سیاست میں ایک بڑا معرکہ گرم ہونے کو ہے۔ ایک ایسا معرکہ جو آنے والے پانچ برسوں اور پھر اس سے متعلق کئی پانچ برسوں کے لیے فیصلہ کن ہوگا، گویا ملک اور بالخصوص امت اسلامیہ ہند ایک ایسے فیصلہ کن مرحلے سے گزرنے والی ہے جس پر اس کے مستقبل کا بہت کچھ دارومدار ہے۔ کہہ لیجئے فیصلے کی گھڑی آپہنچی ہے۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ مجموعی طور پر امتِ اسلامیہ ہند کو نہ تو اس فیصلہ کن لمحے کی اہمیت کا احساس ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی قابل ذکر تیاری کے آثار نظر آرہے ہیں۔ منصبِ قیادت کی حامل امت جسے ملک کے نازک لمحات میں قیادت کا فریضہ انجام دینا تھا، قیادت تو درکنار خود اپنے لیے کسی مثبت تبدیلی سے مایوس اور خوف زدہ مکمل سیاسی بن باس لے چکی ہے۔

صورتِ حال انتہائی سنگین ہے کہ وہ جنہیں رہنمائی سونپی گئی تھی، کہ جن سے سنگین سے سنگین حالات میں بھی خیر کی بڑی توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں، ان میں سے بیشتر خیر کی دشوار راہوں سے منحرف ہوچکے ہیں۔ مسلم دانشوروں اور علماء کے ہاں کسی سیاسی لائحہ عمل کا فقدان اسی امر پر دال ہے۔ ان کی مجلسوں میں ہونے والی گفتگو اس سوال کے جواب سے خالی ہے۔ خاموشی، مکمل خاموشی ان کے لیے عافیت ہے، جنت ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا جمہور شدید خوف اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہے کہ قیامت آنے کو ہے جس کے لیے کوئی تیاری نہیں، کوئی اجتماعی لائحہ عمل نہیں۔ مسلمان اس بات سے خوب واقف ہیں کہ آنے والی مصیبت مستقبل کے پانچ سالوں کے لیے ان کی قسمت پر فیصلہ ثبت کردے گی، وہ کچھ کرنے بلکہ کر گزرنے کے آرزومند ہیں۔ البتہ کسی لائحہ عمل کے تعین کے سلسلے میں

ان کا دامن بھی یکسر خالی ہے۔ فکری اور عملی رہنمائی سے عاری ۲۰ کروڑ مسلمانوں کے لیے اب اس کے علاوہ آخر چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے کہ وہ ترحم بھری نظروں سے اغیار کی طرف دیکھے، قاتلوں سے مسیحائی کی توقع وابستہ کرے اور منافق وعدوں میں سے ہی کسی وعدے پر صدقِ دل سے ایمان لے آئے۔

مسلمانو! ہندوستان میں تم چالیس سال سے جس سیاسی لائحہ عمل پر کاربند رہے ہو اسے بجا طور پر زندگی کی بھیک مانگنے والی سیاست کہا جاسکتا ہے۔ تمہارا اگر کوئی مطالبہ رہا ہے تو وہ صرف یہ کہ تمہیں زندگی جینے دیا جائے لیکن عملی طور پر ہوا یہ کہ زندگی جینے کی ہر خواہش تمہیں موت سے زیادہ قریب لے آئی۔ دنیا جینے کے آرزومند تم اب ایک ایسی زندگی جینے پر مجبور ہو جہاں تمہاری زندگی پر موت کا گمان ہوتا ہے۔ ذرا غور کرو، تم کون ہو؟ اور تم کس سے زندگی کی بھیک طلب کر رہے ہو؟ کاش کہ تمہیں اپنی حیثیت کا احساس ہوتا، کاش کہ تم یہ جانتے کہ تمہارا رشتہ اس مشن سے جاملتا ہے جس کی نصرت کے لیے آسمان وزمین کے رب کا وعدہ ہے۔ کاش کہ تم یہ نہ بھولتے کہ تم آخری نبی کی امت ہو اور رہتی دنیا تک انبیائی قیادت کی جانشینی تمہارا حصہ ہے۔ فکر و نظر کا یہ کتنا بڑا زوال ہے کہ دوسروں کو زندگی بخشنے والی امت کفار و مشرکین سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دی گئی ہے۔

دنیا جینے کی شدید خواہش کبھی تو تمہیں کانگریس کے در پر لے گئی اور جب جب اس در سے ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا تم اپنا کاسۂ گدائی لیے ؛مید و بیم کی کیفیت میں دوسرے دروازے کھٹکھٹاتے رہے۔ تمہاری چالیس سالہ سیاست گدائی کی شرمناک اور عبرت ناک سیاست ہے۔ شاید تم یہ حقیقت بھلا بیٹھے ہو کہ گدائی بہر حال گدائی ہے اور صاحب خیر پر گدا کا کوئی اختیار نہیں۔ گدا کو بہت کچھ منت و سماجت کے بعد اگر کچھ مل سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف ذلت اور در حقیقت یہی تمہاری چالیس سالہ سیاسی کمائی کا نتیجہ ہے۔ ذلت کی تلاش میں مارے پھرنا تمہاری عادت بن چکی ہے۔

یقیناً تم پر ایسے لمحات بھی گزرے ہیں جب تمہیں اپنی شرمناک حالت کا کچھ احساس ہوا ہے، جب تمہارے اندر ذلت کی زندگی سے نجات پانے کی آرزو پیدا ہوئی ہے لیکن بھلا محض آرزوؤں اور تمناؤں سے بھی کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے؟ کانگریس سے طویل وابستگی کے بعد جب تمہارے رہنماؤں کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ذلت کی روٹی کے چند ٹکڑے ان کی دنیا جینے کی آرزو کی کفالت نہیں

کرتے اور جب انہیں کانگریس سے فراخ دلانہ بھیک ملنے کی ساری توقع ختم ہوتی نظر آئی تو انہوں نے ملی بنیادوں پر غیر وابستگی کی سیاست کا آغاز کیا۔ لیکن یہ قومی سیاست بھی کوئی برگ و بار لائے بغیر مرجھا گئی۔ اس تجربے میں تمہیں اپنی شکست کی تاریخ نظر آتی ہے۔ تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ کوئی بھی انفرادی تجربہ اس ملک میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اغیار کے در کی گدائی ہی شاید تمہارا مقدر ہے۔ ایسا اس لیے کہ مدتوں سے زوال کے اسباب پر غور کرنے کے عادی نہیں رہے، تم محض اچھی خبریں سننا چاہتے ہو، مسائل کو ایک جست میں حل کرنا چاہتے ہو۔ اول تو ناوابستگی کی اس سیاست کو، جسے تم مسلم مجلس کے ناکام تجربے کے نام سے یاد کرتے ہو، ایک علیحدہ عمل سمجھنا اور اسے کسی نظریاتی سیاست کا نقطہ آغاز سمجھنا بڑی ہی سنگین غلطی ہے کہ اگر تاریخ کی تفہیم میں تم نے اتنی بڑی غلطیاں روا رکھیں تو اس کی بنیاد پر کسی واقعی مستقبل کی تعمیر مشکل ہو جائے گی۔ آخر تم یہ حقیقت کیوں بھلائے دیتے ہو کہ مسلم مجلس کی تشکیل کے پیچھے کسی نئی سیاست کے آغاز کے بجائے کانگریس کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ تم صرف کانگریس کے ووٹ بینک بنے رہنے پر مجبور نہیں ہو کہ اگر تمہارے مطالبات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو تم کوئی دوسری سیاسی راہ بھی اختیار کر سکتے ہو۔ تم یہی کچھ باور کرانا چاہتے تھے کہ اس سے آگے کی کوئی بات، کوئی انقلابی منشور تب بھی تمہارے فہم سے بالاتر تھا۔ گویا تم نے ملی اور قومی بنیادوں پر بھی اپنی سیاسی زندگی کی تعمیر کی جو کچھ کوشش کی اس کا منتہائے مقصود بھی روٹی کے چند ذلیل ٹکڑے ہی تھے، پھر تم کہہ لو کہ روٹی کی ملی سیاست ناکام ہو گئی تو روٹی کی سیاست تو ناکام ہونے کے لیے ہے ہی۔ افسوس کہ تم زوال کی اس انتہا پر پہنچ چکے ہو جہاں مختلف طریقوں سے، نئے اور خوبصورت ناموں سے، ذلت کی روٹی کے طالب ہو، موت کی سی زندگی جینے کے متمنی ہو۔

پھر ملی سیاست کی بساط بھی لپیٹ دی گئی لیکن ذلت کی آرزوؤں اور تمناؤں نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا۔ دنیا جینے کی آرزو لیے تم ہر اس شخص اور گروہ کے پیچھے بھاگتے رہے جس نے تمہیں زندگی بخشنے کی موہوم سی امید بھی دلائی۔ تمہاری توانائیاں مختلف سیاسی پارٹیوں کو قوت فراہم کرنے میں صرف ہوتی رہیں، تمہارے خون سے باطل کو استحکام ملتا رہا، تمہارے حلق سے نکلنے والی آواز تمہاری نہ رہی، تم دوسروں کے بول بولتے رہے۔ تمہاری گردنوں کے مقدس نذرانے نے جو صرف اور صرف انبیائی مشن

کے لیے مخصوص تھے باطل کی بارگاہ میں پیش ہوتے رہے۔ یہ عمل گذشتہ چالیس برسوں سے اتنے تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہوتا رہا ہے کہ اب تمہاری شناخت کھو چکی ہے، تم اپنے آپ کو اتنے مختلف رنگوں میں رنگتے رہے ہو کہ تمہارا اصلی رنگ یعنی اللہ کا رنگ زائل ہو چکا ہے۔ افسوس کہ دنیا جینے کی آرزو میں تم اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے ہو۔

تم یہ بالکل ہی بھلا بیٹھے کہ قیادت تمہارا حصہ ہے، آخری نبی کی امت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ قیامت تک لوگوں کو زندگی کے ہر معاملے میں رہنمائی فراہم کرے۔ ذرا غور کرو، تمہارے فکر و عمل میں کس قدر زوال در آیا ہے؟ قیادت کے منصب پر فائز کی گئی امت رہنمائی کے لیے دوسروں کی طرف دیکھتی ہے۔ تم حق کی طرف لوگوں کو ہانکے پکارے کیا بلاتے الٹا تم ہی باطل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہر الّم غلم سیاسی پارٹی کے ساتھ ہو لیتے ہو۔ محمد ﷺ کی امت کی اس سے بڑی تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ منصب قیادت سے منحرف ہو کر باطل قوتوں کا ضمیمہ بن جائے، اسی میں اپنی عافیت جانے اور اسی موت کی وادی میں زندگی کے امکانات کی متلاشی رہے، بھلا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ حاملینِ قرآن، ہدایات و رہنمائی کے لیے، اہل ضلالت کی پیروی کرنے لگیں۔

ضلالت کی تاریک وادیوں میں مسلسل چالیس سال بھٹکنے کے بعد اب تم ایک ایسی اندھی گلی میں داخل ہو چکے ہو جہاں راہیں مسدود نظر آتی ہیں، آگے کا راستہ یہیں ختم ہو جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملکی سیاست میں تم اسی تذبذب اور کشمکش سے دو چار ہو۔ جائیں تو جائیں کہاں؟ راستے کھوئے گئے، ترکیبیں معلوم نہیں، پرانے طریقے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ باطل کے جلوس میں شامل ہونے اور اسی کی آواز میں آواز ملانے کی جس پالیسی پر تم پچھلے چالیس برسوں سے عمل پیرا تھے اس کے امکانات بھی ختم ہو گئے کہ اب باطل کو بھی تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ کہ جن منافقانہ وعدوں پر جینے کے تم عادی ہو چکے ہو اس کی کوئی قسط شاید اب تمہیں اس الیکشن میں نہ مل سکے۔ ملکی سطح کی دونوں سیاسی پارٹیاں تم سے غایت درجہ بے اعتنائی برت رہی ہیں کہ اب جس طرز کی سیاست کا آغاز ہو چکا ہے اور جو پچھلے سیاسی رویہ کا لازمی نتیجہ تھا، اس میں تمہاری کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ تم پوچھتے ہو کہ موجودہ الیکشن میں مسلمان کسے ووٹ دیں؟ تم اس حقیقت سے خوب واقف ہو کہ حکمراں کانگریس ہو یا اپوزیشن

کی پارٹیاں دونوں کے ہاتھ تمہارے خون سے رنگین ہیں، دونوں کے دامن پر تمہارے خون کے تروتازہ دھبے نمایاں ہیں۔ پھر تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ پچھلے چالیس سالوں سے ان میں سے ہی کسی ایک قاتل کو ووٹ دینے کی پالیسی تمہاری زندگی میں کوئی خوش گوار تبدیلی پیدا نہ کرسکی۔ اس تلخ اور واضح حقیقت کے باوجود آخر وہ کیا چیز ہوسکتی ہے جو تمہیں ان ہی قاتلوں میں سے کسی ایک کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی تحریک دلائے؟ کیا تم اس ملک میں خود کو اتنا بے بس محسوس کرتے ہو کہ قاتلوں کے ہاتھوں خود ہی اپنی گردنیں حوالے کرنے پر مجبور سمجھو؟ کیا واقعی تمہاری اس مفروضہ کمزوری کا حقیقت سے کچھ بھی تعلق ہے؟

اے اللہ کے نام لیواؤ! اے محمدؐ کے پیروؤ! خوفناک قصائیوں کے ہاتھوں بیس کروڑ کی امت نیلام ہونے والی ہے۔ اس سے بڑھ کر فکر کی بات یہ ہے کہ آج پھر کفار و مشرکین کے درمیان محمد ﷺ کی امت کی قیمت لگائی جانے والی ہے۔ بھلا تم ہی بتاؤ کہ جس محمد ﷺ سے محبت کا تم دم بھرتے ہو اس ہستی کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کی امت کے افراد کوڑیوں کے بھاؤ کفار و مشرکین کے ذریعہ خرید لیے جائیں۔ الٰہی مشن کی اس سے زیادہ تذلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کی بیس کروڑ آبادی پر مشتمل فوج ظفر موج کفار و مشرکین کے ہاتھوں سیاسی غلام بنالی جائے؟ کیا محمد ﷺ کی امت کی یہی قدر و قیمت رہ گئی ہے کہ وہ کفار و مشرکین کے ہاتھوں خرید لی جائے اور وہ ان کی سیاسی غلامی کھلے دل سے قبول کرلے؟

ہوسکتا ہے کہ مسلم خور قصائیوں کے چہروں سے تمہاری مسلسل بڑھتی ہوئی نفرت، تمہارا بتدریج بڑھتا ہوا سیاسی شعور اور ترحم کی بھیک سے مایوس دل و دماغ، تمہارے روایتی سیاسی رویہ میں فوری طور پر تعطل پیدا کردیں۔ عین ممکن ہے کہ قاتلوں کی آواز میں آواز ملانے کی روایتی سیاسی روش سے تم باز آجاؤ یا کم یا از کم اتنا ہو کہ تمہاری آوازوں میں پہلے کا سا جوش و خروش باقی نہ رہے۔ تم سیاسی عمل میں ان ہی پارٹیوں کے ساتھ حصہ تو لو لیکن انتہائی بے دلی سے۔ اس بات کے بھی آثار ہو چلے ہیں کہ تمہاری قابل ذکر اکثریت مایوسی اور بے دلی کے نتیجے میں کلی طور پر سیاسی عمل سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ اس کنارہ کشی سے یہ فائدہ تو یقیناً ہوگا کہ تم قاتلوں کے ہاتھوں خود ہی اپنی گردن دینے کے عمل سے بچ جاؤ

گے لیکن قاتلوں کے ہاتھ تو بہر طور تمہاری گردنوں تک پہنچ ہی جائیں گے۔ الٰہی پیغام کے حاملین نے سیاسی عمل سے اگر کلی طور پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ چوروں اچکوں کو کھل کر کھیلنے کا موقع ملے گا اور تب شاید تمہیں اپنی عافیت کی خانقاہوں میں بھی پناہ نہ مل سکے۔ تم اس حقیقت سے خوب واقف ہو کہ ملکی سطح کی سیاسی تبدیلی تمہاری زندگیوں پر براہِ راست اثرانداز ہوتی ہے اور اسی لیے تم اس عمل سے خود کو علیحدہ کرنا نہیں چاہتے، بذاتِ خود یہ ایک مبارک عمل ہے لیکن کاش کہ تمہارے رویے کو وہ انبیائی رخ مل سکتا جس کا توڑ دنیا کی کوئی سیاسی حکمت عملی نہیں کرسکتی۔ کاش کہ تم اپنی مجتمع قوت کو اس پُرعظیمت راہ پر ڈال پاتے۔

غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے مکمل مایوسی اور حکومت و قیادت کی قوت کا خوف جو مدتوں سے تمہارے دل و دماغ پر طاری ہے، ہوسکتا ہے تمہاری سیاست کو خالص قوم پرستانہ اور خودغرضانہ رخ پر موڑ دیں، اس صورت میں تمہارے سامنے دو متبادل راستے ہوسکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ تم بحیثیت مجموعی اس بات کی کوشش کرو کہ تمہاری سیاست کا کاروبار الگ کر دیا جائے، تمہارے لیے متناسب نمائندگی کی بنیادوں پر اسمبلی اور پارلیامنٹ کی نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ اگرچہ اس کے آثار فی الوقت بہت کم نظر آرہے ہیں لیکن ہوسکتا ہے شاید تم پہلے سے کہیں زیادہ زور و شور سے Separate Electorate کا نعرہ بلند کرسکو اور قوت کی سیاست میں بہرحال اس بات کا امکان تو یقیناً ہے کہ اگر تم ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہو جاؤ تو اس مطالبہ کو تسلیم کرانا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن میرے خیال میں تمہارا یہ فیصلہ انتہائی بے بصیرتی اور کوتاہ بینی پر مشتمل ہوگا کہ اس میں فائدے کم اور نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ اولاً Separate Electorate کے نعروں سے ماضی کی اسی خودغرضانہ اور قوم پرستانہ سیاست کی بو آتی ہے جس کی سزا پوری امت اسلامیہ ہند و پاک آج تک بھگت رہی ہے۔ یہ جان لو کہ قومی بنیادوں پر کوئی سیاست تمہیں اس ملک میں وقار نہیں دلا سکتی ہے۔ اس قسم کی سیاست کے بل پر اگر کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف روٹی کے چند ذلیل ٹکڑے۔ اب اگر یہی کچھ تم نے اپنا منتہائے مقصود قرار دیا ہے تو اس کے لیے قیمتی جانوں کی قربانی کی کیا ضرورت ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی زندگی جینے کی ضرورت ہی کیا ہے جس میں زندگی کی کوئی بوباس نہ پائی جائے؟ الٰہی مشن کے حاملین اگر الٰہی طریقہ

غلامانہ خواہش کے ختم کر دینے کا امکان پایا جاتا ہے۔ البتہ قیادت کی منزل یہاں بھی بہت دور رہ جاتی ہے۔

تم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو کہ بھیک کی سیاست سے ذرا آگے بڑھ کر اگر تم اس لائق ہو سکے کہ بزورِ بازو اپنے حقوق منوا سکو، اگر حقوق کی لڑائی میں تم بھی ایک جارح فریق کی حیثیت سے سامنے آسکے اس صورت میں بھی قوت کی لڑائی میں تمہیں دوسروں کے مقابلے میں روٹی کا بہت چھوٹا ٹکڑا ہاتھ آئے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ طاقتور مریضوں کی چھینا جھپٹی میں تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہ لگ سکے۔ گویا دوسروں کے رحم و کرم پر جینے کے لیے چند نوالے جواب تک ملتے رہے ہیں، نفرتوں کی بھیک پر پلنے کی جو سہولت تمہیں میسر رہی ہے شاید وہ بھی جاتی رہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑا نقصان، جس کی طرف اب تمہاری توجہ کم ہی جاتی ہے، یہ ہوگا کہ تم قیادت کے منصب سے نظریاتی اور عملی ہر دو اعتبار سے کلی طور پر سبک دوش ہو کر خود کو محض ایک عام قوم کی زندگی جینے پر مجبور پاؤ گے۔ گویا عظیم الٰہی پیغام سے سبکدوشی اور نظریاتی سرمایہ سے تہی دستی اگر تمہیں کچھ دلا سکے گی تو صرف اور صرف دنیا جینے کی بے بس اور ناکام تمنائیں اور یاد رکھو کہ جب کوئی قوم ذلت کی زندگی جینے پر مطمئن ہو جائے، جب وہ بے بسی کے حالات سے مکمل سمجھوتہ کرلے، اس کے پاس جینے کے لیے کوئی معقول عذر، کوئی انقلابی خیال نہ ہو تو ایسی قوم اس ذلت کی حالت پر بھی زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ خدانخواستہ اگر تم اس سیاسی روش پر چل نکلے تو عین ممکن ہے کہ مستقبل کے مورّخ کو اس ملک میں تمہارے آثار بھی ڈھونڈھے نہ ملیں۔

سرزمین دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

کلیجہ منہ کو آتا ہے، یہ سب لکھتے ہوئے ہاتھ کپکپاتا ہے کہ جس ملک کے چپّے چپّے پر اسلامیانِ ہند کی عظمت کی داستان رقم ہے، اس ملک سے خدانخواستہ ایک غلط سیاسی حکمتِ عملی سے ان کا مکمل صفایا نہ ہو جائے، لاقدر اللہ۔

قرائن بتاتے ہیں کہ اسلامیانِ ہند کی بڑی اکثریت سابقہ سیاسی تجربات سے مایوس اور دل شکستہ کسی بھی نئے سیاسی عمل کو مرحبا کہنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ ذلت کی چالیس سالہ زندگی نے ان کے عزائم بہت پست کر دیے ہیں، قیادت و سیادت کا خیال انہیں اب کم ہی آتا ہے، دنیا کو الٰہی رنگ میں رنگ دینے

کی خواہش ان کی آرزوؤں کا حصہ ہو تو ہو، عملی زندگی میں الٰہی مشن کے نام پر اگر کوئی عمل جاری ہے تو وہ اپنی ذات کو تسلی دینے والا افسردہ اسلامی عمل ہے، انبیائی عمل کی جھلک عرصہ ہوا رخصت ہو چکی ہے۔ اب اس گئی گزری حالت میں اگر کوئی سیاسی طریقۂ عمل ان کے لیے کشش کا باعث ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک ایسا طریقہ جس میں ان کی مادی زندگی کی ہلتی بنیادوں کو مضبوط کرنے یا کم از کم فوری طور پر سہارا لینے کی امید پائی جاتی ہو۔ ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا سودا کرنے والے قومی بنیادوں پر سیاسی عمل کے آغاز کی شدت سے ضرورت محسوس کریں گے کہ اس زوال پذیر امت میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے یہی نسخہ سب سے زیادہ کارگر ہو سکتا ہے۔ اس بات کے امکانات بہت روشن ہیں کہ موجودہ سیاسی ماحول میں کوئی سر پھرا خود غرضی کی لے میں قومیت کا نغمہ گائے، اور پوری امت بے ساختہ اس نغمہ پر جھوم اٹھے۔

پس پردہ ملکی اور صوبائی سطحوں پر ایک ایسی ہی قومی لڑائی کی تیاری کا آغاز ہو چکا ہے۔ مختلف گوشوں سے مسلم قومی عصبیت کو ہوا دینے اور اس بنیاد پر قوت کی سیاست میں قدم رکھنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ پھر تم میں ہی کچھ ایسے افراد بھی ہیں جن کی آنکھوں پر جاہ و حشم کی لالچ کے پردے پڑ چکے ہیں، جن کے دلوں سے ایمان تو کیا قوم کی محبت بھی کب کی رخصت ہو چکی ہے، جن کی نظریں کسی ملی فائدے سے پرے صرف اور صرف اپنی کرسیوں تک دیکھتی ہیں۔ مسلمانوں پر کچھ بھی گزر جائے ان سے وزارت کا قلمدان اور شاہ کی مصاحبی نہیں چھوٹتی۔ مسلمانوں کی بے بسی کا ملال انہیں بھی ہے، مگرمچھ کے آنسو بہانے میں یہ دوسروں سے کہیں آگے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ الیکشن کے موسم میں مسلمانوں کے دکھ درد کا یہ بڑی فراخ دلی سے ذکر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا اظہارِ درد ہی انہیں حکومت کے ایوانوں تک لے جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا خون نہایت ارزاں ہے کہ یہی تو انہیں وزارت کا قلمدان دلواتا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ بے بسی نے ہی انہیں یہ موقع فراہم کیا ہوا ہے کہ وہ ان کی لاشوں پر اپنی سیاست کی دوکان چلاتے رہیں۔ یہ کھلے منافق اور بدترین غدار ہیں کہ واقعی اگر اس امت کی نظریاتی حیثیت دوبارہ بحال ہوگئی تو ان منافقوں اور لٹیروں کا سیاسی مستقبل ہی کیا ہے؟ پھر حکومت کے ایوانوں میں پہنچنے کے لیے انہیں زینہ کون فراہم کرے گا؟

رہے وہ لوگ جنہیں اللہ نے خلوص کی دولت سے نوازا ہے، جن کی آنکھیں مسلمانوں کی

موجودہ بے بسی پر واقعی نم ناک ہیں اور جو واقعی اس امت کو زوال کی موجودہ کیفیت سے نکالنے کے لیے ہمہ وقت بے چین نظر آتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا بنیادی طریقۂ عمل ان کے ہاں بھی مفقود ہے۔ زوال کا کرب انہیں متحرک تو ضرور رکھتا ہے اور یقیناً ان کا کوئی لمحہ امت مسلمہ کی فکر سے غفلت میں بھی نہیں گزرتا۔ البتہ انبیائی طریقۂ انقلاب سے بہت حد تک ناواقفیت اور تاریخ کی انبیائی تفہیم و تشریح سے یکسر تہی دامنی ان کے شدید دردِ ملت سے بھی عروج کا کوئی نسخہ برآمد نہیں کرپاتا ہے۔ اس بات کا امکان بہت روشن ہے کہ نادان مخلصین کا یہ مختصر لیکن موثر گروہ مسلمانوں کو موجودہ صورتِ حال سے نجات دلانے کے لیے کوئی ایسا طریقۂ عمل ایجاد کرنے کی کوشش کرے جس میں فائدے کم اور نقصانات بہت زیادہ ہوں۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ گذشتہ چند برسوں سے ملک کے مختلف گوشوں سے ہریجن مسلم اتحاد کی صدائیں سنائی دے رہی ہیں۔ پچھلے دس برسوں میں مسلم ہندوستانیوں پر ابتلاء و آزمائش کے شکنجے جس طرح مسلسل سخت ہوتے رہے ہیں اور جب سے انہوں نے قومی نوعیت کے دو بڑے مسائل یعنی مسلم پرسنل لاء اور بابری مسجد کی تحریک کو ملکی وسعت کے ساتھ چلانے کا تجربہ کیا ہے تب ہی سے ان کے اندر یہ آرزو قوی سے قوی تر ہوتی گئی ہے کہ کاش کوئی سیاسی گٹھ جوڑ لمحوں کی جست میں انہیں اغیار کے سیاسی تسلط سے نجات دلا سکے۔ الٰہی بصیرت سے دور، ڈرے سہمے مسلم لیڈروں کو عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا کوئی راستہ نظر آیا تو صرف یہ کہ دلتوں اور ہریجنوں کے ساتھ ایک مشترکہ سیاسی محاذ وجود میں آجائے۔ گرچہ بذاتِ خود یہ ایک مشکل عمل ہے اس لیے کہ جس امت میں اب بھی عقیدے کی بو باس پائی جاتی ہو، اب بھی جس کے تحت الشعور میں امت کی پیغمبرانہ شناخت قائم ہو، ایک ایسی امت کو کلی طور پر دلتوں اور ہریجنوں کی صف میں لا کھڑا کرنا کچھ آسان نہیں۔ البتہ اس عمل کی کامیابی کے امکانات سے مکمل صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ایسی صورت حال میں جب پریشان و بے چین امت اپنے حالات میں مثبت تبدیلی کے لیے کوشاں ہے، جب اس کی جھولی زوال سے نجات کے کسی متبادل طریقۂ عمل سے یکسر خالی ہے اور جب اس کے درمیان کوئی ہمالیائی نظریاتی قیادت موجود نہیں ہے، بہت ممکن ہے مضطرب اور مائل بہ عمل انسانوں کی یہ بھیڑ کوئی ایسا شخص اچک لے جائے جو ان میں سب سے زیادہ چرب زبان ہو، جسے مستقبل کا سبز باغ دکھانے کا

خصوصی ملکہ ہو اور جسے امت مسلمہ کے خلوص کو برسرِ عام نیلام کرنے اور اس کی بنیاد پر اپنی ہوس پرستی کو تسکین دینے کی خصوصی تربیت حاصل ہو۔

امت کے ایک گنہگار خادم کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ اللہ نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، شر اور خیر میں فرق کرنے کی تمیز دی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حقائق مجھ پر منکشف کردیے ہیں جسے تم جوشِ مسلمانی میں نظر انداز کئے دیتے ہو اور اس حیثیت سے بھی کہ اللہ نے میرے دل میں جو بات ڈالی ہے وہ اس کی امانت ہے اور اسے تمہارے سامنے بلاکسی خوف وخطر جوں کا توں پیش نہ کردینا خیانت ہوگی، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس راہ کے خطرے سے تمہیں آگاہ کردوں کہ جس پر چلنا امت مسلمہ کی مکمل تباہی کا باعث ہوگا۔ اسی احساسِ ذمہ داری نے مجھے مجبور کیا ہے کہ تمہیں محض نعروں میں محصور کرنے کے بجائے ایک ایسے راستے کی طرف دعوت دوں جو دنیا و آخرت میں یکساں کامیابی کا ضامن ہو۔ ہوسکتا ہے تمہارے بڑے بوڑھے ان حقائق سے بدک اٹھیں کہ انہیں آہوں کراہوں کی طویل زندگی میں ہریجن مسلم اتحاد کے نعروں سے ہی زندگی بخش جھونکے چلنے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن میں تمہیں ناقابل تردید تاریخی حقائق کی روشنی میں یقین دلاتا ہوں کہ کمزور طبقات کے ساتھ مسلمانوں کے اتحاد سے کوئی زندگی افروز نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ خبردار! دنیا جینے کی بے تاب خواہش تمہیں کسی ایسے راستے پر نہ ڈال دے جو موت کی مہیب خوفناک گھاٹیوں میں جاکر ختم ہوجاتا ہو۔

کمزور طبقات کے ساتھ مشترکہ سیاسی محاذ کی تشکیل اور اس راستے اقتدار تک پہنچنے کی تمہاری خواہش کا اولین مرحلہ یہ ہوگا کہ تمہیں اپنے نظریاتی تشخص سے دستبردار ہوکر محض ان جیسی ایک قوم کی حیثیت سے سیاسی عمل میں حصہ لینا ہوگا۔ گویا کچھ ملنے کی موہوم سی امید میں تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔ اب ذرا اس بات کا بھی جائزہ لو جو کچھ حاصل کرنے کی دھن میں تم الٰہی مشن سے دستبرداری قبول کیے لیتے ہو، کیا وہ کچھ بھی تمہیں حاصل ہوسکے گا؟ پہلی بات تو بہت واضح ہے کہ قوت اور عدد کی سیاست میں خود تمہارے مشترکہ محاذ میں ہریجنوں کی حیثیت فیصلہ کن ہوگی اس لیے کہ وہ تعداد میں تم سے بہت زیادہ ہیں۔ پھر بفرض محال تمہارا یہ مشترکہ محاذ اگر حکومت کی تشکیل کی پوزیشن میں آبھی جاتا ہے تو تمہاری جھولی میں ان کی کرم فرمائیوں اور چند وزارتوں کے علاوہ کچھ بھی نہ آئے گا۔

پالیسیوں کی تشکیل اور ملک کے اہم امور میں فیصلہ کن اہمیت ان کی ہی رہے گی۔ تمہاری حیثیت وہاں بھی ضمیمے کی ہوگی۔ گویا تمہاری بے شمار قربانیوں سے جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف یہ کہ سیاسی قوت کا سرچشمہ برہمنوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہریجنوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔

مشترکہ سیاسی محاذ کا تجربہ تم ماضی میں بھی کر چکے ہو۔ کانگریس اور جمعیۃ العلماء کی مشترکہ سیاسی جدوجہد کے نتائج سے یقیناً تم ناواقف نہیں ہو۔ اس وقت بھی تم اسی طرح مضطرب اور بے چین تھے، انگریزوں کے ظلم وستم نے تمہیں بے چین کر رکھا تھا۔ تم محسوس کرتے تھے کہ انگریز تمہارے سات سو سالہ سیاسی اقتدار پر قابض ہیں، ان کے غلبہ نے تمہیں حاکم سے محکوم بنادیا ہے۔ تم شاید یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کے رخصت ہوتے ہی تمہاری سابقہ حالت لوٹ آئے گی، تم نے ہر قیمت پر ہر اس قوت سے سمجھوتہ کیا جو کسی بھی درجے میں تمہارے اس مفروضے میں معاون نظر آئی۔ عظمت رفتہ کی بازیابی کے جوش میں تم نے حالات کی صحیح تفہیم سے صرف نظر کیا، تم نے نہ تو تاریخ کے مطالعہ سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی اور نہ الٰہی بصیرت کو کام میں لاکر مستقبل کے صحیح وجدان کی ضرورت محسوس کی۔ تمہارے پاس الٰہی پیغام موجود تھا لیکن تم نے اپنے طریقہ عمل کی تشکیل میں اس سے کوئی مدد نہ لی، اسے رہنمائی کے لیے خاطر میں نہ لائے، اپنی ترکیبیں لڑاتے رہے کہ تب ان ترکیبوں پر تمہیں بہت زعم تھا۔ تمہاری ان ہی الٹی سیدھی ترکیبوں کا ثمرہ ہے کہ جو کچھ تم آج دیکھ رہے ہو۔ ذرا مجھے بتاؤ آزادی کی لڑائی میں سب سے زیادہ قربانیاں کس نے دیں؟ روزِ اوّل سے کامیابی کے مراحل تک اسے بے لوث قیادت کس نے فراہم کی؟ جب ہندوؤں کے زعما آزادی کے نام سے ہی خوف کھاتے تھے، مکمل آزادی کا نعرہ بلند کرنے والا جگر کس امت نے فراہم کیا؟ گذشتہ دو صدیوں میں کس امت کے خون سے یہ سرزمین لالہ زار رہی ہے؟ بتاؤ اس عظیم قربانیوں سے کیا نتیجہ بر آمد ہوا؟ آج پھر تم ظلم وجبر کی ویسی ہی رات کے اسیر بنا دیے گئے ہو اور آج ایک بار پھر تم اس دردناک زندگی سے آزادی کے خواہاں ہو۔ آخر تم کب تک ایک قاتل سے تلوار چھین کر دوسرے قاتل کے ہاتھ میں دیتے رہو گے؟ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ مومن ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا، لیکن تم بار بار آزمودہ طریقوں کو آزماتے ہو۔ آج پھر تم ان ہی آزمودہ نسخوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے والے ہو یعنی موجودہ کانگریس یا اپوزیشن کے

ساتھ شرکت یا ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے ساتھ مشترکہ سیاسی محاذ کی تشکیل۔ کاش کہ تم ایک بل سے بار بار ڈسنے کے لیے خود کو پیش نہ کرتے۔ کاش کہ تم میں ذرّہ برابر بھی ایمان کی خوشبو پائی جاتی۔

تم پوچھتے ہو جب یہ سارے راستے منزل کی نشاندہی نہیں کرتے تو پھر عظمت رفتہ کی بازیابی کا واقعی راستہ کون سا ہے؟ جب یہ ساری سیاسی حکمتِ عملی امتِ مسلمہ کے حق میں زہر ہے تو آخر تریاق کہاں دستیاب ہے؟ تمہیں بجا طور پر توقع ہوگی کہ جب میں نے تمہارے درمیان مروجہ یا مجوزہ طریقہ سیاست کی خامیاں واضح کی ہیں تو یقیناً میرے پاس کوئی متبادل لائحۂ عمل بھی ہوگا۔ میری صاف باتوں نے تمہارے زخم کو پھر ہرا کر دیا ہے۔ تم بجا طور پر اس بات کی توقع کر رہے ہوگے کہ میں تمہارے ان زخموں پر مرہم رکھ سکوں اور واقعہ یہ ہے کہ تمہارا نسخۂ شفا میں نے بہت سنبھال کر رکھا ہے اور آج تمہیں اسی امانت کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں خود تمہارا بھولا ہوا سبق ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ تم مدت سے جس غفلت کے شکار ہو، محکومی اور ذلت کی جس زندگی کے خوگر ہو چکے ہو اور بے بسی کی جس فضا میں سانس لے رہے ہو ایسا نہ ہو کہ عظیمت کی پرخطر وادیوں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی تم ہمت ہار بیٹھو۔ ایسا نہ ہو کہ تم جس مایوس مردہ زندگی جینے کے عادی ہو چکے ہو، واقعی زندگی کی کوئی رمق تمہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ مجھے خطرہ ہے کہ تمہارے بڑے بوڑھے، جو مدت سے مرمر کے جئے جانے کی سیاست پر عمل پیرا ہیں، کہیں ان کی مصلحت پسندانہ روش انہیں اس انبیائی طریقہ عمل کی مخالفت پر آمادہ نہ کر دے۔ یاد کرو اس تاریخی تجربے کو جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں توجہ دلائی ہے: جب موسیٰ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے بھیجے گئے اور جب انہوں نے اہل ایمان کو حق کی بنیاد پر مجتمع کرنے اور فرعون کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی، اس وقت ان کی قوم کے بڑے بوڑھوں کا ردعمل کیا تھا؟ وقت کے حاملین پیغام الٰہی، یعنی بنی اسرائیل کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ ان پر ذلت کی بدترین زندگی مسلط کر دی گئی ہے، وہ صبح و شام اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی نسل کشی کے مناظر دیکھتے تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ کفر کی منصوبہ بند نسل کشی کے بعد ان حاملین حق کے گروہ کا چند برسوں سے زیادہ اس سرزمین پر باقی رہنا مشکل ہے۔ لیکن ان واضح حقائق کے باوجود ان کے درمیان جب ایک ایسا شخص پیدا ہوا جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹ سکے اور جب موسیٰ نے

بنی اسرائیل کو ذلت کا طوق گلے سے اتار پھینکنے کی دعوت دی تو کیا قوم کے بڑے بوڑھوں نے یہ بات نہیں کہی کہ موسیٰ ہماری موجودہ پریشانیوں میں مزید اضافہ کیے دیتے ہیں، وہ ہم کرب کے ماروں کو مزید آزمائشات کی دلدل میں گھسیٹ رہے ہیں۔ لیکن بنی اسرائیل کے ان بزدل رہنماؤں کی ایک نہ چلی اور بالآخر قوم کے غیور افراد نے انبیائی انقلابی حکمت عملی کے ذریعہ مدتوں طویل غلامی کی زنجیریں کاٹ پھینکیں۔ کیا کچھ ایسے ہی نازک حالات اس ملک کے نہیں ہیں؟ کیا اپنی نسل کشی کے مظاہرے تمہیں آئے دن اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی نہیں دیتے؟ کیا پوری امت اسلامیہ ہند کو قتل وخون کے مسلسل مناظر سے خوف کی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا نہیں کر دیا گیا ہے؟ اور کیا حالات کی تبدیلی کے لیے کسی انقلابی لائحہ عمل اور انبیائی طریقۂ کار کا نام سن کر تمہارے بڑے بوڑھوں کی زبانوں سے ویسی ہی خوف زدہ نصائح کے دفتر نہیں کھل جاتے؟ اب قوم کے غیور نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ بزدلانہ نصائح سے مکمل صرف نظر کرتے ہوئے انقلابی انبیائی طریقۂ کار کے ذریعہ اسلامیانِ ہند کی نئی تاریخ رقم کریں۔

انبیائی مشن کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میں امت مسلمہ کی ہند کے غیور افراد کو ایک زندہ زندگی کی بشارت دیتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ہمارے نوجوان مستقبل کی تعمیر نو کے لیے آہوں اور آنسوؤں کی ذلیل اور بے بس زندگی پر اپنی گردنوں کے بیش قیمت نذرانوں کو ترجیح دیں گے کہ دنیا میں قوموں کے عروج کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ وہ اپنے مستقبل پر اپنے حال کو قربان کر دے۔

نجات کی راہ

میں امت اسلامیہ ہند کے غیور افراد کو آواز دیتا ہوں کہ جو وقت خوف وغفلت میں گزرا سو گزرا، اب وہ خوف کے طلسم کو توڑ دیں۔ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کی کیفیت سے سرشار ہو کر ملک کے سیاسی دھارے کو اپنے رخ پر موڑ دیں، انہیں نہ صرف اپنا تحفظ کرنا ہے بلکہ ملک کی ڈوبتی کشتی کو کفر و مادیت کے بھنور سے نکالنا بھی ان کی ہی ذمہ داری ہے۔ اس عمل کا پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ وہ روٹی کی سیاست سے یکسر کنارہ کشی اختیار کریں اور خود کو انبیائی مقام پر پھر سے بحال کرنے کی تیاری کریں وہ کسی سیاسی اتحاد میں شرکت یا کسی غیر مسلم سیاسی قوت کا آلۂ کار بننے کے بجائے اس ملک میں ایمانی سیاست کے علمبردار کی

حیثیت سے سامنے آئیں۔ اس اخلاق باختہ سیاسی نظام کو ایمانی سیاست کی شدید ضرورت ہے۔

ایمانی سیاست کا مفہوم

ملی اور ربانی وفاداری کے تعامل سے جو انقلابی رویہ وجود میں آتا ہے یہی دراصل ایمانی سیاست کی بنیادی روح ہے۔ اور بذات خود ملی وفاداری چونکہ ربانی وفاداری کے نتیجے میں ہی پیدا ہوتی ہے اس لیے ایمانی سیاست کا علمبردار ہمہ وقت اس بات کے لیے آمادہ ہوتا ہے کہ ربانی وفاداری پر ملی وفاداری کو بلا کسی پس و پیش کے قربان کردے۔ گویا اسے اس بات کی پرواہ کم ہی رہتی ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم کس حال میں ہیں اصل اہمیت اس امر کو حاصل ہوتی ہے کہ اسلام اس ملک میں کس حال میں ہے؟ یہ رویہ امت کو ایک زبردست انقلابی کیفیت سے آشنا کرتا ہے۔ خواہ افرادِ امت کی گردنوں کے ایک ایک قطرے سے یہ سرزمین لالہ زار کیوں نہ ہو جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام اس ملک میں زندہ اور غالب رہے۔

ایمانی سیاست، ملی سیاست سے یکسر مختلف ہوگی کہ آخر الذکر سیاسی رویہ ملت کو بحیثیت قوم دنیا جینے کا فن سکھاتا ہے جب کہ اول الذکر امت مسلمہ کو ایک انقلابی نظریاتی گروہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ملی سیاست دوسری قوموں سے نفرت اور مقابلے کے جذبے سے تقویت پاتی ہے، اس کے استحکام کی بنیاد ہی یہ ہے کہ ملت کے سامنے ہمہ وقت خوفناک مسائل کی ایک طویل فہرست موجود ہو۔ دشمن کی قوت سے خوف و دہشت ہی ملی سیاست کے علمبرداروں کو وقتی طور پر یکجا کر رکھتی ہے اور جوں ہی خطرہ ٹلتا نظر آتا ہے ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے جب کہ ایمانی سیاست کی ایک مستقل فلسفیانہ اساس ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ خوف و دہشت کی نفسیاتی کیفیت سے یکسر پاک، اعتماد سے پر، اپنے لیے کچھ نہیں اور دوسروں کے لیے سب کچھ طلب کرنے کے انبیائی رویہ سے مسلسل غذا حاصل کرتی ہے۔ اس کی بنا کسی مقابل قوم کے لیے نفرت پر نہیں بلکہ اس کے لیے نصح و خیر خواہی اور جذبہ ہمدردی پر رکھی جاتی ہے۔ چونکہ یہ مسلم قوم کے عروج یا غلبہ کی بات نہیں کرتی بلکہ دوسروں کے لیے سب کچھ کر گذرنے اور اس راہ میں زبردست قربانیوں کے بعد داعی امت کو اس قائدانہ مقام پر فائز کرتی ہے۔ اس لیے اس کی دعوت کے لیے دوسرے مسالک و مذاہب کے دل بھی کھلے ہوتے ہیں۔ یہ محض مسلمانوں کے

سیاسی مسئلہ کے حل کے بجائے انسانیت کے سیاسی مسئلہ کی طرف توجہ کرتی ہے اور چونکہ مسلمان اس انقلابی مشن کے دعویدار ہیں اس لیے منطقی طور پر اولین مخاطب اور اولین معاون قرار پاتے ہیں۔

نئی سیاسی پارٹی کا منشور

ضرورت ہے کہ اس اخلاق باختہ ملک کو نئی سیاسی اخلاقیات سے متعارف کرانے کے لیے الٰہی پیغام کے حاملین پر مشتمل ایک ملک گیر سیاسی پارٹی وجود میں آئے۔ انبیائی انقلاب کے علمبرداروں کو چاہیے کہ جہاں وہ لوگوں کے قلوب کی تبدیلی کے لیے دن رات کوشاں ہیں وہیں ملک کی ڈوبتی سیاسی کشتی کو بچانے کے لیے بھی سر توڑ جدوجہد کریں۔ اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں سیاسی بے تدبیریوں کو ختم کرنے، سماجی انصاف قائم کرنے، معاشی استحصال کا خاتمہ کرنے اور ہر قسم کے فتنہ وفساد سے اس ملک کو پاک کرنے کے لیے ایک انقلابی سیاسی جدوجہد کا آغاز کریں۔ نئی سیاسی پارٹی منحرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی نمائندہ ہوگی۔ اس میں منحرف قسم کے نام نہاد مسلمانوں کو قائدانہ حیثیت حاصل نہ ہوگی الا یہ کہ وہ سابقہ روش سے تائب ہوکر اپنے اندر انبیائی مشن کے حاملین کی خصوصیات پیدا کرسکیں۔ اس کے اہداف درج ذیل ہوں گے:

۱- ملک میں قرآن کی سیاسی اخلاقیات کا نظری اور عملی تعارف۔

۲- ملک میں سماجی اور معاشی انصاف کا قیام اور ہر قسم کے ظلم کا خاتمہ۔

۳- ملک کے کارواں کو ایک ایسی راہ پر ڈالنا جو دنیا و آخرت میں کامیابی کا ضامن بن سکے۔

۴- ملک کو موجودہ جمہوریت جو دراصل بہت بڑا فراڈ ہے، سے نجات دلانا اور اس کی جگہ ایک واقعی جمہوریت کا قیام۔

۵- مسلم قومی عصبیت کا خاتمہ اور الٰہی انقلابی پیغام کی اشاعت۔

بعض شکست خوردہ مسلمان اس اندیشے میں دبلے ہوئے جاتے ہیں کہ بھلا جو ملت ایک مدت سے کافرانہ سیاسی ماحول میں پرورش پاتی رہی ہے، جو بہت حد تک اس سیاسی نظام کی خوگر ہوچکی ہے بھلا اس مفلوک الحال امت سے انقلابی قیادت کا اتنا بڑا کام کیسے لیا جاسکتا ہے؟ ان زوال زدہ مسلمانوں کو

چاہیے کہ محض اس راہ کی طوالت اور خطرناکی سے خوف کھانے اور ہمت ہار جانے کے بجائے امت کی صحیح صورتِ حال کے واقعی ادراک کی کوشش کریں۔ یقیناً یہ راستہ انتہائی دشوار ہے، اس راہ کے خطروں سے بھی مجھے انکار نہیں۔ لیکن جن لوگوں کو امت کی ہیئت ترکیبی کا کچھ بھی اندازہ ہے اور جن آنکھوں نے امتِ مرحوم کی خاکستر میں دبی چنگاری کے شعلہ بننے کے مناظر بار بار دیکھی ہیں، وہ یقیناً اس طریقہ عمل کا شاندار مستقبل رنگوں میں مجسم دیکھ رہی ہیں۔ بالخصوص موجودہ سیاسی ماحول میں جب پوری امت خود ہی ایک بہتر لائحہ عمل کی متلاشی ہے اور جب دن رات کے قتل و خون کے مناظر نے اسے بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیا ہے، امت کے کارواں کا رخ انقلابی انبیائی راستے پر موڑ دینا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ماضی قریب میں پوری امت کو ایک اکائی کی حیثیت سے برتنے کا بڑی حد تک کامیاب تجربہ تم کر چکے ہو۔ بابری مسجد اور مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر پوری امت نے قربانیوں اور عزائم کے جو مظاہر پیش کئے ہیں ان میں تمہارے شکستہ دل افراد کی ہمت افزائی کا خاصہ سامان موجود ہے۔ اور جب قومی نوعیت کے دو بڑے مسائل پر یہ مفلوک الحال امت اس عظیمت کا مظاہرہ کر سکتی ہے، جب اس کے عام افراد اللہ کے گھر اور اس کی شریعت کی حفاظت کے واسطے اپنے سروں سے کفن باندھ کر نکل سکتے ہیں تو بھلا ایک واقعی انقلابی انبیائی مشن کی کامیابی کے لیے وہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے۔ اس امت کا یہی وہ دل موہ لینے والا مقدس عمل ہے جو ان کی مساعی میں اللہ کی نصرت و حمایت کی ضمانت دیتا ہے۔ اب اتنی زبردست قوت کی موجودگی کے باوجود کسی کا ذہن اس طریقہ عمل کی کامیابی کے سلسلے میں شبہات کا شکار ہے تو اس کے لیے دلائل کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔

دوسرا اندیشہ جس کا اظہار عام طور پر کیا جاتا رہا ہے یہ ہے کہ اس طریقہ سیاست کی اپیل چونکہ ابتدائی مراحل میں صرف مسلمانوں تک محدود ہوگی اور ابتداءً ایمانی سیاست کے علمبردار صرف اہل ایمان کے ووٹوں پر ہی پارلیامنٹ میں پہنچیں گے اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ طریقہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کا موجودہ سیاسی عمل دخل بھی ختم کر دے۔ اس خیال کے حاملین اس اندیشے کا بڑے زور و شور سے ذکر کرتے ہیں کہ پارلیامنٹ اور چند صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی جو قابلِ ذکر تعداد مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آتی ہے ایمانی سیاست مسلمانوں کو اس سے بھی محروم کر دے گی۔ ان

اندیشوں کے گرفتار شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مسلم اراکین پارلیامنٹ اور اسمبلی کی خاصی بڑی تعداد اغیار کے ووٹ پر غیر مسلم پارٹیوں کے ٹکٹ کی وجہ سے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس مفروضے کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں نے الیکشن کمیشن کی رپورٹوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، مختلف حلقوں میں مسلم اور غیر مسلم ووٹوں کا تخمینہ لگایا ہے، ان حلقوں کی مقامی سیاست اور ذات پات کے اثر انگیز عوامل کی تفہیم کی کوشش کی ہے اور اس طویل مطالعے کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ایمانی سیاست تو درکنار اگر مسلمان اپنی سیاست خالص قومی بنیادوں پر بھی استوار کریں جب بھی پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں (استثناء چند نشستوں کے) ان کی نمائندگی میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوگا۔ مجموعی طور پر دو چار نشستوں کے اضافے ہی کا امکان ہے۔ گرچہ مسلم علاقوں کو پارلیمانی حلقوں میں بڑے مضحکہ خیز انداز سے شامل کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک خالص قومی سیاست کامیابی کے نتیجے میں کم از کم اتنی نشستیں تو ضرور حاصل کر سکتی ہے جو اسے اب تک ذلت کی سیاست کے نتیجے میں حاصل ہوتی رہی ہے۔ رہی بات ایمانی سیاست کی، تو اس کی ہیئت ترکیبی ہی کچھ ایسی ہے کہ مظلوم و مقہور اکثریت کے دل اور ووٹ اس کی طرف خود بخود کھنچتے چلے آئیں۔

ایمانی سیاست سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بیس کروڑ مسلمان سیاسی رہنمائی کے لیے کسی اور سمت دیکھنے کے بجائے آسمانی ہدایت کی طرف دیکھیں گے۔ ان کا سیاسی تعطل دور ہوگا، خوف و ہراس کی کیفیت ختم ہوگی اور ایک مشن کی موجودگی اور اس کے قابل عمل ہونے کا یقین انہیں ایک زبردست حرکی قوت سے مالا مال کر دے گا۔ سیاسی اور نظریاتی مشن کا امتزاج ان کے ہر سیاسی عمل کو دعوتی اور ہر دعوتی عمل کو سیاسی بنا دے گا۔ بیس کروڑ کی امت کو ایک الٰہی فلسفۂ حیات کے زیر اثر حرکت میں لے آنے کا واضح مطلب ہوگا کہ اس ملک کو جن مادی اور روحانی خطروں نے آگھیرا تھا، جس ظلم و جبر کی خوفناک سمندر میں ملک کی کشتی کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ خطرہ اب ٹل گیا۔

یہاں کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ایمانی سیاست کو ہمہ گیر اسلامی انقلاب کے متبادل کے طور پر پیش کر رہا ہوں یا یہ کہ میں کسی نام نہاد جمہوری عمل میں شرکت کے ذریعہ واقعی اسلامی انقلاب کا خواب دیکھنے لگا ہوں کہ جس شخص پر انبیائی انقلاب کا طریقۂ کار اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ منکشف

ہوچکا ہو اور جو موجودہ جمہوریت کو فراڈ سے زیادہ کچھ اہمیت نہ دیتا ہو بھلا وہ اس فراڈ سے کوئی انبیائی انقلاب برآمد ہونے کی توقع کیوں کر کرسکتا ہے۔ ایمانی سیاست کا آغاز اور امت مسلمہ کو نئی سیاسی اخلاقیات کے ساتھ متحرک کردینے سے ہمہ گیر انبیائی انقلاب تو برپا نہ ہوگا۔ البتہ یہ عمل دعوت کی راہ کا سنگ میل ضرور ثابت ہوگا اور امت مسلمہ کا نظریاتی احیاء کہ جو اس طرزِ سیاست کی بنیاد ہے، ہمہ گیر انقلاب کے لیے راہ ضرور ہموار کردے گا۔ معترضین کو یہ سمجھنا چاہیے کہ انقلابِ اسلامی کا لائحہ عمل، ماحول، ضرورت اور وقتی عوامل سے ترتیب پاتا ہے۔ اس لیے کسی بھی ایسے لائحہ عمل میں ہمیشہ اس بات کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ بدلتے حالات میں انقلابی روح اور انبیائی طریقہ کار کو برقرار رکھتے ہوئے مسلسل ضروری ترمیم کی جاتی ہے۔[1] پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ مدت سے سیاسی حکمت عملی سے بے بہرہ بیس کروڑ اسلامیانِ ہند کا کارواں جن سیاسی بے تدبیریوں کا شکار رہا ہے۔ سیاسی مسائل میں اپنی نظریاتی شناخت کو جس حد تک مسخ کرچکا ہے اسے بہرحال اغیار اور دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا کہ یہ کوئی عام ملت نہیں الٰہی مشن کی دعویدار آخری رسول ﷺ کی امت ہے۔

پچھلی گفتگو سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہوچکی ہے کہ ایمانی سیاست نہ صرف امتِ مسلمہ ہند کی سیاسی سرگرمیوں کو ایک نظریاتی رخ دے سکتی ہے بلکہ اس کے اندر ملک کی موجودہ سیاست میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرنے کی بھی بڑی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ سیاسی عمل سے بددل اور مایوس، شکست خوردہ ملت کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل موجود ہے جو انہیں صرف زندہ رہنے کی نہیں بلکہ قیادت کے مقام پر سرفراز کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک ایسی انقلابی سیاسی حکمتِ عملی کی طرف امت مسلمہ کا رویہ کیا ہوتا ہے، امت کے مصلحت پسند اصحابِ فکر اور بزدل سیاسی لیڈر کیا روٹی کی سیاست سے مستعفی ہوکر ایک واقعی انقلابی سیاست کے راستے پر اپنے قدم ڈال سکیں گے؟ امت مسلمہ کے غیور افراد کو جلد از جلد ایمانی سیاست کے لیے ایک ملک گیر سیاسی پارٹی تشکیل دینی ہے۔ انہیں اس بات کا عہد کرنا ہے کہ وہ اپنے حال کو مستقبل پر قربان کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔

✡ ✡ ✡

---

1. اسلامی انقلاب کے طریقۂ کار سے متعلق تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے مصنف کی کتاب "اسلامی انقلاب کا طریقۂ کار"

۵

○

جنوری ۱۹۹۶ء میں پٹنہ میں ملی پارلیامنٹ کا سرمائی اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں مسلم سیاسی بل کا مسودہ پیش ہوا۔ اس دستاویز نے ہندوستانی مسلمانوں کے بے راہ رو سیاسی قافلے کو ایک سمت دینے کی کوشش کی۔ اس موقع پر علمائے لکھنؤ کے وفد میں بانگ درا کے مدیر جناب امین الدین شجاع الدین بھی تشریف لائے تھے۔ جنھوں نے اپنے رسالے کے لئے ذیل کا یہ انٹرویو حاصل کیا تھا۔ ہم یہاں اسے بانگ درا کے شکریہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔

موجودہ انتخابی نظام
میں کامیابی کے امکانات

سوال: اپنے سیاسی بل میں آپ نے مسلمانوں کو متحد ہوکر سیاسی پارٹیوں کے نہیں بلکہ مسلمانوں کے حقیقی نمائندوں کو پارلیامنٹ میں نمائندگی دیئے جانے کی بات کہی ہے، اس کی عملی شکل کیا ہوسکتی ہے؟ کیا ملی پارلیامنٹ عملی سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے؟ اگر نہیں تو اس صورت میں کیا سبیل نکل سکتی ہے؟

جواب: ہم نے بہت غور کیا اور اپنے تئیں اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے امکانات تلاش کئے جا سکیں، لیکن ایک طویل غور و فکر کے بعد بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ موجودہ سیاسی نظام میں بحیثیت امت تو کجا بحیثیت ایک عام قوم کے بھی ان کے سیاسی حقوق کا تحفظ ایک مستحکم سیاسی قوت کی حیثیت سے ان کا ابھرنا بعید از امکان ہے۔ بات یہ ہے کہ موجودہ سیاسی ڈھانچہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا کہ اس میں قیامت تک بھی مسلمانوں کو ایک قوت کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔

پھر یہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ سیاسی انصاف کا عین تقاضا ہے کہ ہر مذہبی گروہ کو اپنا نمائندہ منتخب کرنے کے سلسلے میں اسے آزادی ملنی چاہئے۔ موجودہ ڈھانچے میں مسلم نمائندوں کی نامزدگی غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کی ہائی کمان کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ یعنی بنیادی طور پر پارلیامنٹ میں پہنچنے والا ہر مسلمان (استثناء چند مسلم جماعتوں اور آزاد امیدواروں کے) غیر مسلموں کا نامزد کردہ نمائندہ ہوتا ہے جنہیں غیر مسلم سیاسی پارٹیاں اپنے مفادات کے میزانئے کی روشنی میں نامزد کرتی ہیں۔ اب عامۃ المسلمین سے یہ کہا جاتا ہے کہ انہی مختلف نامزد کردہ امیدواروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو۔ بات بہت سادہ سی ہے کفار کے ذریعہ نامزد کردہ لوگ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں۔

مسلم سیاسی بل میں ہم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جانا چاہئے جس کے لئے جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر متناسب نمائندگی کی بات کہی گئی ہے۔ گویا ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوک سبھا کی ۱۱۹ نشستوں پر ملک گیر سطح پر رائے شماری کے ذریعہ مسلمان اپنے حقیقی نمائندے منتخب کرسکیں۔ مسلم سیاسی بل سیاسی انصاف کے قیام کی ایک کوشش ہے۔ گزشتہ پچاس سال کی سیاسی تاریخ چونکہ بدترین سیاسی ناانصافی کی تاریخ ہے جس میں مسلمانوں کو ان کے تناسب کے اعتبار سے کبھی نمائندگی نہیں مل سکی۔ اب بھلا جو نظام حکومت نصف صدی تک سیاسی انصاف دینے میں ناکام رہا ہو اس کے مزید جاری رکھنے کا کیا جواز ہے۔ ہم جبر بھری اس صورت حال کو یکسر تبدیل کردینا چاہتے ہیں۔

رہی عملی سیاست کی بات تو ہم اس میں اس وقت تک کیسے حصہ لے سکتے ہیں جب تک کہ کھیل کے بنیادی اصول پھر سے طے نہ کر لیے جائیں۔ موجودہ صورت حال میں الیکشن کے نظام کو بدلے بغیر اس میں حصہ لینا ہمیں کسی کامیابی سے ہمکنار نہیں کرسکتا۔

سوال: یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ متفق نہیں ہوں گے، اس صورت میں آپ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک ایک ووٹ ایک ہی جھولی میں پڑے گا؟

جواب: ہمیں یہ ہرگز توقع نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کا ایک ایک ووٹ ایک ہی جھولی میں ڈلوانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور نہ اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ووٹ کو بٹور کر مشرک سیاسی پارٹیوں میں سے ہی کسی ایک کی جھولی میں ڈال دیں۔ بلکہ ہم تو ایک ایسی جھولی کی تلاش میں ہیں جس میں ووٹ ڈالنا ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا سبب بنے۔ ہم مسلمانوں کے لئے کافر پارٹیوں میں سے ہی کسی ایک کو ووٹ دینا ہو، ہمارے لئے یہ امر قطعاً بے معنی ہے۔ ان کا ووٹ منتشر ہو یا متحد، اس جھولی میں پڑے یا اس جھولی میں۔ یاد رکھئے اگر ہمارے ووٹ سے نظام کفر کو مزید تقویت ملتی ہے اور موجودہ صورتحال مزید برقرار رہنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں تو در اصل ہم اپنے ہر ووٹ سے خدا اور اس کے رسول ﷺ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

سوال: آپ کی جانب سے آویزاں پوسٹرز اور دعوت ناموں سے یہ تاثر قائم کیا جارہا ہے کہ آپ علماء بیزار ہیں۔ اس جملہ کو علماء طبقہ پر حملہ سے تعبیر کیا جارہا ہے کہ ”علماء نے جوتیاں سیدھی کی ہیں“ علماء

کے حلقے کی ناراضگی کو مول لے کر کیا ملت کا کوئی کام خصوصاً اتحاد و اتفاق کا کام ممکن ہو سکتا ہے؟ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا رشتہ علماء سے منقطع کرنے کی منصوبہ بند کوشش ہو رہی ہیں۔

جواب: میرے خیال میں یہ تاثر صحیح نہیں کہ ہم علماء بے زار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود ملی پارلیامنٹ میں علماء اور فارغین مدارس کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے قال اللہ اور قال الرسول کے حوالے سے بدترین قسم کی دنیاداری کی مثالیں قائم کی ہیں اور جن کی چلت پھرت کا مقصد نظام کفر سے چند مراعات کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہم ان بازاری اور سرکاری علماء سے یقیناً بے زار ہیں۔ البتہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان خدا بے زار علماء کی ناراضگی مول لے کر امت کی احیاء کا کام نہیں کیا جا سکتا تو ایسا سمجھنا غلط ہے۔ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کی موجودگی کے بعد کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں کو اللہ کے کلمے کی بلندی سے روک سکے یا نظام کفر کی تابعداری پر زیادہ دنوں تک مطمئن رکھ سکے۔ خواہ اس نے اپنا نام حضرت مولانا ہی کیوں نہ رکھ چھوڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں سواد اعظم نے علمائے سوء کے خلاف بغاوت کی ہے۔ رہے وہ مسند نشیں جو اپنی خالص مادی دوڑ دھوپ اور حصول دنیا کی کوشش کو روحانی حوالے سے آج بھی مستند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جو اعلائے کلمۃ الحق کی ہر کوشش کو علماء کے خلاف منصوبہ بند سازش بتانے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں اس سازش پر تفصیل سے روشنی ڈالنی چاہیے۔ رہی یہ بات کہ ملی پارلیامنٹ طبقہ علماء سے مسلمانوں کا رشتہ منقطع کرنا چاہتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ہم ان علماء سے مسلمانوں کا رشتہ منقطع کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اپنا رشتہ خدا اور اسکے رسول سے منقطع کر کے کافر مشرک حکمرانوں سے بنا رکھا ہے۔

سوال: ہندوستان میں ملی مفادات کے لئے کام کرنے والی مختلف سیاسی و نیم سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں۔ کیا آپ کو ان میں سے کسی ایک سے بھی اتفاق نہیں ہے؟ ان ساری تنظیموں کی موجودگی میں ایک نئی تنظیم بنانے کی آپ کو کیوں ضرورت پیش آئی؟

جواب: ہندوستان میں اسلام کی سربلندی کے لئے جو جماعتیں سرگرم ہیں ان میں سے ہر ایک سے کسی نہ کسی سطح پر اتفاق ضرور ہے کہ ہم ان کے کاموں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، البتہ ان ساری تنظیموں کی موجودگی کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس ملک میں اللہ کا دین مغلوب اور اس کے ماننے

والے مجبور و بے بس ہیں جس سے اس بات کا جواز فراہم ہوتا ہے کہ محض موجودہ تنظیموں کے کاموں کو نگاہ تحسین سے دیکھنا کافی نہیں ہے۔ ملی پارلیامنٹ کا مختصر سا قافلہ اسی ضرورت کے پیش نظر وجود میں آیا ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ روز اول سے ہم نے ملی پارلیامنٹ کو ایک تنظیم بنانے سے گریز کیا ہے اس کے برعکس ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک متحدہ فورم تشکیل دے سکیں۔ ایک ایسا ایوان تشکیل دیں جسے عامۃ المسلمین اپنی پارلیامنٹ کا نام دے سکیں۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہاں مختلف مسالک اور جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ بوڑھے بھی ہیں جوان بھی، عمر رسیدہ خواتین بھی ہیں اور کمسن لڑکیاں بھی، جدید دانش گاہوں سے فارغ لوگ بھی ہیں اور سکہ بند علماء بھی۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس دائرہ کار کو وسیع کرنے میں اور امت کو ایک وحدت کے طور پر برتنے میں ہمیں حوصلہ افزا تجربات ہوئے ہیں۔

سوال: ملی پارلیامنٹ کے قیام سے لے کر اب تک اس کی نمایاں خدمات کون سی ہیں؟ اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ آپ کے پوسٹر میں بوسینا اور چیچنیا میں مہم جوئی کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں ہم خصوصیات کے ساتھ جاننا چاہیں گے کہ وہاں آپ کی خدمات کس نوعیت کی رہیں اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

جواب: ملی پارلیامنٹ نے اب تک اپنی کارگزاریوں کی کوئی رپورٹ شائع نہیں کی ہے اور نہ ہی اس طریقۂ کار کو ہم اپنے مزاج سے ہم آہنگ سمجھتے ہیں۔ اگر گاہے بہ گاہے کہیں کسی مہم جوئی کا تذکرہ آگیا تو صرف اس لئے کہ عامۃ الناس کو یہ یقین دلایا جاسکے کہ صرف تاریخ کی کتابوں میں نہیں بلکہ واقعات کی موجودہ دنیا میں بھی مختصر سے گروہ کی کوششوں کو اللہ نے اپنی نصرت سے نوازا ہے۔ اس بارے میں کوئی تفصیلی تبصرہ ہم فی الوقت مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اندرون ملک ہمارا یہ احساس ہے کہ مسلمانوں کو ایک نئے انداز سے دعوت فکر دینے کے سلسلے میں قدرے پیش رفت ہوئی ہے اور مضطرب دلوں میں عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ موجودہ نظام جبر کو الٹ پھینکنا نا ممکن نہیں۔

سوال: کفار و مشرکین جیسی اصطلاحات استعمال کرنے سے کیا امتِ دعوت اور مدعو قوموں میں بعد نہیں پیدا ہوگا اور اپنے اس رویہ سے کیا ہم اپنے لئے دعوت کے امکانات کو ختم نہیں کر دیں گے؟

جواب: کفار و مشرکین اصطلاح قرآنی اصطلاح ہے۔ قرآن نے معاشرے کو امت کفر اور امت اسلام

میں بانٹا ہے البتہ امت کفر کے لئے ہمیشہ اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ وہ اپنے کفر سے تائب ہو کر اللہ کی بندگی میں داخل ہو جائے۔ قبول اسلام کے بعد سابق کافر مستند مسلمان ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے عہد میں بھی ایسا ہی ہوا۔ کفار و مشرکین کی اصطلاح جب بھی استعمال کی گئی، اس سے دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں آئی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ کفار و مشرکین کو یہ احساس ہو گیا کہ ہم کوئی اور نہیں ربّ کائنات کے باغی ہیں۔

سوال: تجربات یہ بتاتے ہیں کہ جذباتیت نے نہ صرف یہ کہ ان مخلص افراد کی توانائیوں کو ضائع کر دیا بلکہ ملت کی کوششوں کو نقصان بھی پہنچایا۔ ملی پارلیامنٹ کے متعلق بھی اسی قسم کی جذباتیت کی باتیں کی جا رہی ہیں، آپ اس سلسلہ میں کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: نااہل اور بے عمل مسلمانوں کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ وہ کسی انقلابی تحریک کو جذباتی ابال بتا کر اس کی قدر و قیمت کو کم کر دیں۔ اولاً تو جذباتی ہونا ایک منفی پہلو نہیں ہے۔ یعنی اسلام کو مظلوم اور آخری رسول کی امت کی تذلیل دیکھ کر اگر کسی مسلمان کے دل میں اس نظام کو الٹ پھینکنے کے لئے جذبات پیدا نہ ہوتے ہوں تو اسے اپنے ایمان پر شک کرنا چاہئے۔ آپؐ سے زیادہ بردبار اور متحمل شخصیت کس کی ہوگی، لیکن آپ ﷺ کی سیرت میں ایسے بے شمار مواقع ملتے ہیں جب کہ چہرے پر جذبات کی شدت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی دین کو مظلوم دیکھ کر حمیت اسلامی کا عین تقاضا ہے کہ آپ غصہ ہوں اور آپ کے جذبات برانگیختہ ہو جائیں۔ البتہ کسی انقلابی تحریک کے لئے اس حمیت اسلامی کو کمال احتیاط کے ساتھ برتنا ایک کامیابی سے ہمکنار کر دینا ہے۔ رہے وہ لوگ جو خود کو جذباتی نہیں سمجھتے یا اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل پر ان کے جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے اور ان پر ایک پرسکون دانشوری کی فضا طاری رہتی ہے اور پھر بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق اسی امت سے ہے جس میں اسلام کے معمولی استہزائی ریمارک یا رسول کی شان میں کلماتِ تضحیک حضرت عمرؓ کو اپنی تلوار بے نیام کر دینے پر مجبور کر دیتی تھی تو انہیں چاہئے کہ اپنے اس رویے کا ازسرنو جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ رسول اللہ کی نگاہ میں ان کا ٹھنڈا ٹھنڈا دانشورانہ اسلام زیادہ معتبر ہے یا حضرت عمر کا جذباتی اور والہانہ اظہار وارفتگی۔

سوال: آپ کے نزدیک مسلمانوں کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ ان میں آپ کے نزدیک ترجیحی

مسائل کون سے ہیں؟ آزادی کے بعد سے ملت اسلامیہ کی تاریخ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی سطح پر اپنی توانائیوں کو لگانے کے بجائے دینی، معاشی اور تعلیمی محاذوں پر لگانا چاہئیے، اسکے متعلق آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جواب: سیاسی میدان میں سخت پسپائی کے بعد گزشتہ چند سالوں سے ہمارے درمیان یہ رجحان پرورش پاتا رہا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی محاذ پر اپنی قوت صرف کرنے کے بجائے تعلیمی اور معاشی محاذ پر جد و جہد کرنی چاہئے۔ بظاہر اس بات میں بڑا وزن معلوم ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں ایک جزوی حقیقت ہے۔ معاشی اور تعلیمی سرگرمیاں سیاسی دنیا سے بے تعلق نہیں رہ سکتیں اور محض تعلیمی اداروں کا جال بچھانا امت کے لئے نشأۃ ثانیہ کے دروازے نہیں کھول سکتا۔ ہاں البتہ اگر یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہو تو سیاست سے فوری طور پر کنارہ کشی کا مشورہ دیا جاسکتا ہے، خاص طور پر ایک ایسی سیاست سے جو گزشتہ پچاس سالوں میں مسلمانوں سے انہیں کچھ دینے کے بجائے ان سے بہت کچھ چھینتی رہی ہے۔

البتہ امت کی کسی بھی شیرازہ بندی میں آپ کو سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ آپ اس ملک میں امت مسلمہ سے کیا کام لینا چاہئیے؟ پھر امت مسلمہ کے لئے کسی مقام کے تعین کے سلسلے میں آپ کے پیش نظر وہی کچھ ہونا چاہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے اس کے لئے طے کر دیا ہے۔ البتہ موجودہ ہندوستان میں تعلیمی اور معاشی ترقی کا مروجہ نعرہ کسی اسلامی مستقبل کے احساس سے خالی اور یکسر نابلد ہے۔ ہمیں اس بارے میں فکر مند ہونا چاہئے۔

سوال: ملک کے موجودہ نقشہ میں سیاسی سطح کی بات کرنے کو غیر دانشمندی سمجھا جارہا ہے۔ ساتھ ہی ملت کے نام پر اتحاد کی دعوت نے ہم مسلمانوں کو متحد نہیں کیا، البتہ اغیار کو منفی بنیادوں پر ہی سہی متحد ضرور کر دیا۔ ملی پارلیامنٹ کی کوششوں کے رخ کو دیکھتے ہوئے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا جارہا ہے۔

جواب: ملک کو از سرنو ایک نئے سیاسی جغرافیے کی بنیاد پر منظم کرنا دراصل موجودہ سیاسی نظام میں بڑی خامیوں پر قابو پانے کی ایک کوشش ہے۔ اسے علیحدہ پسندی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے ملک کو ۱۴۲ ریاستوں کے وفاق میں تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی ہے تاکہ ہر چھوٹی ریاست زیادہ منظم طریقے

سے ترقیاتی منصوبوں پر عمل کر سکے۔ انتظامی امور کے سلسلے میں بڑے ضلع کو چھوٹے چھوٹے ضلعوں میں منقسم کرنا کوئی نئی سیاسی بدعت نہیں ہے۔ ۱۲۲ تہذیبی ریاستوں کا وفاق جو مستقبل کے ہندوستان کے لئے ہماری تجویز ہے، ہر تہذیبی اکائی کو ریاستی سرپرستی عطا کرتی ہے اور اس طرح متعلقہ ریاستوں میں ہر تہذیب کو پھلنے پھولنے کے وافر امکانات مہیا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی اسکیم ہے جو مختلف چھوٹی تہذیبی اکائیوں میں پرورش پارہے احساس محرومی کو ختم کر سکتی ہے۔

یہ عجیب مذاق ہے کہ دانش مندی کی ہر اسکیم کو ہمارے نام نہاد دانشمند غیر دانشمندی سمجھتے ہیں اور ظلم و جبر کی موجودہ صورت حال میں گھٹ گھٹ کر جیئے جانے کو عین کار دانشمندی سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی عجب دلیل ہے کہ ہم اس لئے اتحاد کی کوشش نہ کریں یا اپنی صفوں کو درست نہ کریں کہ ہمارے اس عمل سے دشمن متحد ہو جائیں گے۔ جو لوگ ملی پارلیامنٹ کی انقلابی دعوت سے اندیشوں کے شکار ہیں انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خطرات سے ہی امکانات کا ظہور ہوتا ہے، بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب موجودہ نظام جبر ہر لمحے آپ کے گرد اپنا گھیرا سخت کرتا جارہا ہو محض خاموش بیٹھے رہنا یا اندیشوں کا اظہار کرنا آپ کو کب تک زندگی کی مہلت دے سکتا ہے۔

سوال: ملک کے علماء ملی قائدین، برادران وطن اور پریس نے آپ کے پٹنہ اجلاس اور خود ملی پارلیامنٹ کے وجود و قیام کو کن نگاہوں سے دیکھا ہے؟

جواب: علماء، قائدین، کفار و مشرکین اور ہندو پریس ملی پارلیامنٹ کے انقلابی ایجنڈے سے قدرے متوحش ہیں۔ ملی قیامت جو رسول اللہ کے پیغام سے نابلد نہیں وہ اس بات سے انکار تو نہیں کرتی کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں البتہ ان کے دل و دماغ ابھی اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ آخر ان باتوں کو اس ملک میں کیسے برتا جاسکے گا۔ کفار و مشرکین غضبناک ہیں اور سیاسی بازیگر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو ان کی اصل حیثیت کا احساس دلایا گیا تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ کچھ اسی رویے کا اظہار ہندو پریس نے کیا ہے۔ انگریزی کے قومی اخبارات میں اسی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ البتہ ہم ابھی تک عام لوگوں کو یہ باور نہیں کرا پائے ہیں کہ ملی پارلیامنٹ کا سیاسی ایجنڈا عام باشندگان ملک کے لئے بھی نظام رحمت ثابت ہو گا اور وہ تمام لوگ جو موجودہ نظام کفر کی فتنہ سامانیوں کے شکار ہیں ان کے لئے ہمارے

پاس علاج موجود ہے۔ ہمیں یہ احساس بھی عام کرنا ہے کہ ہم کسی مخصوص قوم کے خلاف نہیں اور یہ کہ ہماری تحریک ہندو مخالف نہیں ہے۔ ہم تو صرف ایک پیغام لے کر اٹھے ہیں جس میں ہر ذی روح کے لئے سکون ورحمت کا سامان موجود ہے۔ میرے خیال میں ہمارے پیغام کا یہ پہلو ابھی بہت تشنہ ہے۔

✡ ✡ ✡

٢

دین کو سمجھنے سمجھانے اور مختلف مسائل حاضرہ پر رہنمائی کے لئے ملک اور بیرونِ ملک سے مضطرب مسلمانوں کے استفسارات پر مشتمل خطوط و وفود کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کبھی یہ سوالات تحریری شکل میں آتے ہیں اور کبھی زبانی طور پر یہ گفتگو علمی مجالس کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ملی ٹائمز اور مکاتیب و مجالس کے استفسارات سے ہم نے ان سوالات کو یہاں منتخب کیا ہے جو عام طور پر ہر سوچنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ توقع ہے ذیل کے استفسارات میں اہل فکر اپنی تسکین کا سامان پائیں گے۔ مصنف کا اندازِ بیان عالمانہ اور محاکمانہ ہونے کے بجائے عام گفتگو اور بحث و تمحیص کا ہے جس میں قاری کو ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی بلند منبر سے کوئی ایسا خطبہ سن رہا ہے جس پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا۔

—— مدیرہ

استفسارات

محض رسمی عبادات یا استخلاف فی الأرض
غایت دین کیا ہے؟

سوال: آپ کی تقریروں اور تحریروں میں سارا زور اس بات پر ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام قائم ہو۔ گذشتہ سال اندور آمد کے موقع پر عوامی جلسے میں آپ نے مسلمانوں کا مقصد زندگی عالمی نظام عدل کا قیام قرار دیا تھا۔ ہمارے ایک دوست نے اس وقت بھی یہ سوال آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اب خاصے دنوں کے بعد پھر آپ کی توجہ دلا رہا ہوں کہ میری معلومات کی حد تک "وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْن" ہی دراصل مقصد زندگی ہے۔ یعنی خالق سے بندے کا تعلق، پھر آپ قیام خلافت یا نظام عدل کے قیام کی ذمہ داری ہم کمزور مسلمانوں پر کیوں ڈال دینا چاہتے ہیں خاص طور پر ہندوستان کے ماحول میں جہاں ہمارے لئے اپنا ایمان اور آبرو بچانا ہی مشکل ہو رہا ہے۔ کیا ایک کمزور اقلیت سے اضافی کاموں کے مطالبے میں آپ حق بجانب ہیں؟

جواب: آپ کے سوال میں کئی سوالات ایک دوسرے سے خلط ملط ہو گئے ہیں اوّلاً غایت دین کیا ہے؟ اللہ کا بندوں سے کیا مطالبہ ہے؟ کیا نجات کے لئے مخصوص قسم کی عبادتیں ہی کافی ہیں؟ اور آپ کے خیال میں جب قرآن مسلمانوں سے نظام عدل کے قیام کا مطالبہ کرتا ہی نہیں تو ان پر ذمہ داری کیوں ڈالی جائے؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ عبادت کا اصل مفہوم ہے کیا؟ یہ سوال کہ غایت دین کیا ہے؟ رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد کیا تھا اور یہ کہ آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں امت مسلمہ کا مقصد زندگی کیا ہو سکتا ہے۔ بنیادی نوعیت کا سوال ہے۔ جس کے جواب پر ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا

رخ متعین ہوسکتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں قرآن کی یہ آیت ملاحظہ کیجئے۔ " هُوَالَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْكَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" (الصف:۹) گویا دین حق کا دوسرے تمام ادیان باطلہ پر غلبہ ہی وہ کار بعثت ہے جس کے لئے اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا۔ اسی آیت میں اس امر کا ذکر بھی موجود ہے کہ ایسا کرنا مشرکوں پر انتہائی گراں گذرے گا یعنی دین کے غلبے کا کام دشمنوں کی مزاحمت کے بغیر تکمیل کو نہ پہنچے گا۔ دوسری جگہ یہ بھی فرمایا" وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُواً مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ" (الفرقان:۳۱) ہم نے ہر نبی کے واسطے مجرموں میں سے دشمن پیدا کردیئے ہیں گویا اظہار دین اور غلبۂ دین کی کوئی مہم دشمنوں کی مخالفت اور ان کی مزاحمت کے بغیر انجام نہ پائے گی۔ جو لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے نماز روزے اور وظائف کے ذریعہ نجات کے طلب گار ہیں وہ دراصل اس قرآنی کلیے سے ناآشنا ہیں کہ اللہ سے تعلق اور اس پر انحصار کے لئے ضروری ہے کہ آپ ایک ایسی راہ پر چل نکلے ہوں جہاں قدم قدم پر اس کی نصرت کی طلب کی آپ ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ جہاں دشمنوں کے مقابلے میں آپ کو ہر لحہ اللہ کی مدد کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ "وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" (البقرہ:۴۵) یہ آیت اسی کلیے کی وضاحت کرتی ہے۔ عبادت اور اس کے رسوم فی نفسہ مقصود نہیں۔ بلکہ مقصود تو اللہ کا قرب اور اس کی رضا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مقصد کے حصول میں عبادات ہماری رہنمائی کرتی ہین۔ آپ نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں بھی دراصل اس نکتے پر زور ہے کہ جن وانس کا مقصد بعثت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ رب کائنات کی عبادت اور اس کے احکام کو بجالانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیں۔ البتہ بندوں میں عبودیت کی یہ شان کیسے پیدا ہوا، وہ کس طرح اپنی بندگی کو معتبر بنائیں اور قرب الٰہی یا راہِ مستقیم تک ان کی رسائی کس طرح ہو اس سوال کا جواب بھی قرآن مجید اور رسول اللہؐ کی سنت میں تلاش کرنا ہوگا۔

بندہ ہدایت کی تلاش میں سورہ فاتحہ میں جو سوال اپنے رب کے سامنے رکھتا ہے پورا قرآن دراصل اسی سوال کا جواب ہے۔ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا جواب " هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" سے دیا جاتا ہے۔ دعا جسے عبادت کی روح قرار دیا گیا ہے اور جس کے بغیر عبادت محض بے جان رسوم بن کررہ جاتی ہے، اس میں وہ شان اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب مانگنے والے کے سامنے مقصد بھی اتنا ہی بڑا ہو۔

قرآن نے امت مسلمہ کو استخلاف فی الارض کے منصب پر فائز کیا ہے اور رسول کو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ جھوٹے ادیان کو مٹا کر دین حق کو قائم کر دے۔ اتنے بڑے ایجنڈے کے لئے کمزور مسلمانوں کو نصرت الٰہی کی طلبی اور تائید غیبی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا۔ ایک طرف منظم کفر اور دوسری طرف مٹھی بھر کمزور مسلمان جن سے مطالبہ ہے کہ وہ صبر اور نماز سے قوت حاصل کریں۔ گویا مومنوں کی عبادت میں ایک ایسی شان پیدا کر دی گئی ہے کہ ہر لمحہ ان کے دل آسمانوں پر اٹکے ہوں۔ اور انہیں اپنی سرگرمیوں میں زندہ اور متحرک خدا کی تائید کا اشارہ ملتا ہو۔

اسلام اور مسلمانوں کی حالیہ بے بسی نے عام مسلمانوں کے ذہنوں میں مستقبل کے سلسلے میں مایوسی پیدا کر دی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب بہت سی تحریکوں اور تنظیموں کے کرنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے، دنیا کے مختلف حصوں میں ہماری جانی اور مالی قربانی رنگ نہیں لا رہی ہے تو کیوں نہ ہم نماز روزے کی حد تک اپنے آپ کو محدود رکھیں قرب الٰہی کے دوسرے طریقے، اوراد و وظائف کو اختیار کریں۔ ان حضرات کے نزدیک دین پر چلنے اور قائم رہنے کا مفہوم یہ ہے کہ رسوم عبادت مثلاً روایتی انداز سے نماز روزے کی پابندی کی جائے، پھر جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ نمازیں پڑھنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا بلکہ حالات مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں تو پھر ان کے اندر نماز کی افادیت کے بارے میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس نعرے کے بارے میں شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اللہ کے راستے پر چلو تو تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔

بات دراصل یہ ہے کہ قرآن میں نتائج پیدا کرنے کے لئے جو اصول بتائے گئے ہیں ان پر ہم مسلمان کاربند ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ عبادت میں جان پیدا کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم دعاؤں کی لذت سے آشنا ہوں۔ ان دیکھے خدا کی مدد پر یقین کامل رکھتے ہوں۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم دین حق کے قیام کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ اس راہ میں آنے والی ہر مزاحمت دراصل ہمیں مقصد سے قریب کرے گی کہ جب تک مزاحمت نہ ہو کوئی چیز آگے نہیں بڑھتی۔ غلبۂ دین کی مہم سے کنارہ کشی دنیا میں ہماری بے توقیری کا سبب ہے اور اسی وجہ سے ہماری دعائیں اور عبادتیں بھی بے روح ہوگئی ہیں۔ دنیا میں غلبے اور آخرت میں نجات کے لئے لازم ہے کہ ہم استخلاف فی الارض کے چیلنج کو قبول کریں۔

فقہی کانفرنسوں کی فقہی حیثیت کا ایک جائزہ

اجتہاد کا حق کسے ہے؟

سوال: موجودہ دور میں اجتہاد کا حق علماء کو حاصل ہو گا یا پارلیمنٹ کو؟ اسلامی تنظیم کانفرنس نے بھی اپنی نگرانی میں ایک "المجمع الفقهي" بھی بنا رکھا ہے جس کے گاہے بہ گاہے اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں فقہ اکیڈمی اور جمعیۃ العلماء الگ الگ اپنے اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ جہاں مختلف سوالوں کا فقہی جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیا ان فقہی مجلسوں میں طے پانے والے امور اجماع کا درجہ رکھتے ہیں مثال کے طور پر بینک کے سود اور انشورنس کی حرمت کے سلسلے میں اس قسم کی اکیڈمیاں اجماع کا دعویٰ کرتی ہیں۔ جبکہ عامۃ المسلمین اب بھی ہر قسم کے سود کو عملاً ناجائز خیال کرتے ہیں۔ اجماع کے بعد اس فیصلے کی مخالفت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: آپ نے جن فقہی اکیڈمیوں کی بات کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود ان کی فقہی حیثیت مشتبہ ہے پھر یہ دعویٰ ہی باطل ہے کہ کسی مسئلے پر امت کے درمیان اجماع قائم ہو گیا ہے۔ کیا واقعی اجماع بذات خود جواز یا عدم جواز کی دلیل بن سکتا ہے۔ اس بارے میں بھی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ آیئے ہم مرحلہ وار ان سوالوں کے جواب تلاش کریں۔

یہ سوال کہ فی زمانہ اجتہاد کا حق علماء کو حاصل ہو گا یا کسی منتخبہ پارلیمنٹ کو دراصل اجتہاد کے اصل مفہوم کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے اجتہاد کسی نئی شرع کی تشکیل نہیں بلکہ موجودہ شرع میں پائے جانے والے مختلف امکانات کی دریافت کا نام ہے۔ مجتہد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرع کے اندر پائے جانے والے ایک سے زیادہ مستند options میں سے اپنی بصیرت اور فہم کے مطابق کسی ایک کا انتخاب کرے۔ اس کا یہ اجتہاد اسی وقت تک مستند سمجھا جاتا ہے جب تک کہ شرع کے اندر اس کا جواز پایا جاتا ہو۔ گویا کسی بارے میں اگر ایک سے زیادہ طریقۂ کار ممکن ہے تو ان میں سے کسی ایک پر امت کا اتفاق قائم کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ امت کے اصحاب فکر مختلف Options کا تفصیلی جائزہ لیں۔ اس کے اسرار و عواقب کو خود سمجھیں اور جو طریقۂ کار نسبتاً بہتر معلوم ہو اس کے حق میں اپنے

دلائل لائیں تا کہ ان ساری گفتگوؤں کے بعد مشاورت اپنے انجام کو پہنچے اور امیر امت ان مباحث کی روشنی میں، اپنے تفقہ کی بنیاد پر، کسی ایک طریقۂ کار کا انتخاب کرے اس فیصلے کے بعد پوری امت کے لئے صرف اسی فیصلے پر عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اجتہاد کا وہ طریقۂ کار جس کے عملی مظاہر ہمیں آپؐ کی مجلسوں اور آپ کے خلفائے راشدین کی امارتوں میں ملتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ امیر امت جب کئی امکانات میں سے ایک امکان کو امت کے لئے منتخب کرتا ہے تو وہ گویا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس مخصوص صورت حال میں اس کی نظر میں اسی رائے کو اختیار کرنے میں امت کی بہتری ہے۔ اس کا یہ اجتہاد آنے والے زمانے کے لئے حجت نہیں بن سکتا۔ مثال کے طور پر خراجی زمینوں سے متعلق حضرت عمرؓ کے عہد میں پالیسی کی تبدیلی گویا اس بات کا اعلان ہے کہ کئی امکانات میں سے ہر امکان زمانی اور مکانی صورت حال کے لحاظ سے اپنی افادیت رکھتا ہے۔ اس لئے ایک زمانے کا اجماع دوسرے زمانے کے لئے حتمی حیثیت نہیں رکھ سکتا۔

اب یہ بات کہ اجتہاد کا حق کسے حاصل ہے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ دراصل اجتہاد شرع کے اندر ہی امکانات کی تلاش کی کوشش ہے تو پھر اس کا حق فطری طور پر امت کے انہی اہل فکر کو ملے گا جو غایت دین سے واقف ہوں اور جنہیں عصر حاضر کی بصیرت بھی حاصل ہو۔ البتہ یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ کسی بھی شخص کا اجتہاد امت کے لئے اسی وقت قابل قبول ہو گا جب اسے خلیفۂ وقت یا امیر المسلمین کی توثیق حاصل ہوگئی ہو۔ ورنہ اگر افراد یا اکیڈمیوں کو اپنے طور پر اجتہاد کا حق دے دیا گیا تو امت آراء کے اختلاف اور فتنوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ ہر شخص اپنی اکیڈمی اور اپنے مولوی کی رائے کو معتبر گردانے گا۔ اور ہر فقہی کانفرنس زیادہ سے زیادہ بھیڑ اکٹھا کر کے اپنی حمایت میں اجماع کے انعقاد کا دعوی کرے گی۔ کہیں بنک کا سود حلال ہوگا تو کہیں حرام۔ عام مسلمانوں کے لئے اس قسم کے اجماع اور اجتہاد سے مزید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین کے غیاب میں نہ کوئی اجتہاد معتبر ہے اور نہ ہی کسی اجماع کے انعقاد کا دعوی کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی اکیڈمیاں یا جلسے دراصل خلیفہ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے اختیارات پر تصرف کر رہی ہیں۔ یہ ہما شما کا کام ہی نہیں ہے کہ وہ کسی مسئلے پر اجماع کے انعقاد کی جسارت

کرے۔ ہم واقعی اگر یہ چاہتے ہیں کہ امت کے اندر پائے جانے والے اختلافات کا خاتمہ ہو اور مختلف امور پر ہم وحدت کے ساتھ سوچ سکیں تو ہمیں چاہئے کہ فوری طور پر منصب خلافت کے قیام کی کوشش کریں۔ تاکہ امت کا انتشار دور ہو اور اس قسم کے اجتہادی کاموں کو اعتبار مل سکے۔ بھلا جو فقہی کانفرنسیں امیر امت کے مرکزی رول کو نظر انداز کئے دیتی ہوں اور جو امیر المسلمین کے غیاب میں اجماع کے قیام کی دعویدار ہوں ان کے بارے میں اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات دراصل فقہ اسلامی کے بنیادی ابجد سے ناواقف ہیں۔ انہیں نہ تو اسلام کی اجتماعی زندگی کا کوئی شعور ہے اور نہ ہی اس بات کا احساس کہ جب ان کی گردنیں امیر المسلمین کی بیعت سے خالی ہیں تو ایسی صورت میں یہ سب کے سب اس حالت میں موت کی طرف اپنے قدم بڑھا رہے ہیں جسے آپؐ نے جاہلیت کی موت سے تعبیر کیا ہے۔ فقہی اعتبار سے جن حضرات کی زندگی غیر فقہی اور غیر اسلامی ہو انہیں سب سے پہلے تو یہ چاہئے کہ اپنی زندگی میں پائے جانے والے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کریں اور اس منصب خلافت کی فی الفور تنصیب عمل میں لے آئیں جس کے بغیر ہمارا مرنا اور جینا غیر معتبر اور جس کے بغیر اجماع اور اجتہاد کو اعتبار ملنا ممکن نہیں۔

قضیہ بامیان مجسموں کے انہدام کا

سوال: بامیان مجسمے کے انہدام کے بعد طالبان کے حوالے سے عالمی پیمانے پر ایک ہنگامہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلسل کئی روز تک یہ خبر عالمی میڈیا میں شہ سرخیوں میں رہی۔ مسلم و غیر مسلم تنظیموں نے کھل کر طالبان کے اس اقدام کو غیر اسلامی قرار دیا۔ ہمارے بعض قائدین نے تو انہیں دائرہ اسلام ہی سے خارج قرار دیدیا۔ طالبان کی شدت پسندی اور ان کا بے لچک اسلامی رویہ کتاب و سنت سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ ذرا وضاحت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

جواب: جس طرح سلمان رشدی کی شیطانی آیات نے عاشقان رسولؐ اور دشمنان رسول کے درمیان خط فاصل کھینچ دی تھی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہوگیا تھا۔ اسی طرح بامیان مجسمے کے انہدام نے ایک ایسا موقع فراہم کیا کہ وقت کے آذر وقت کے ابراہیم سے الگ نظر آئیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ تو مغربی پروپیگنڈے کے زیر اثر اور کچھ مسلمانوں میں سیکولرزم کے رواج پاجانے سے بہت سے مسلمان نام

اور بعض معتبر دینی شخصیتیں بھی خیمہ آذری میں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض کو جلد ہی اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا۔ البتہ بعض اب بھی اپنے غلط موقف کی تائید میں طرح طرح کی تاویلیں پیش کر رہے ہیں۔

امارت اسلامی افغانستان جس کی قیادت اس وقت ملا عمر کے ہاتھوں میں ہے۔ گو کہ شرعی اعتبار سے ایک خالصتاً دینی ریاست نہیں ہے۔ البتہ وہ اس وقت مسلم دنیا میں اسلام کے تئیں اپنی وفاداری اور قربانیوں کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یہ بات کہ طالبان کی حکومت خالصتاً اسلامی بنیادوں پر قائم نہیں ہے میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ طالبان اب بھی اقوام متحدہ کے ادارے سے خود کو تسلیم کرانے پر مصر ہیں اور اس کی رکنیت کے خواہش مند بھی۔ اصولی طور پر کسی اسلامی ریاست کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ نظام کفر کا حصہ بننے کی خواہش رکھے۔ ثانیاً دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کی طرح طالبان بھی افغان نیشلزم پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ان کے یہاں بھی شہریت کا پیمانہ افغانی ہوتا ہے جو کہ اسلام کے بین الاقوامی شہری تصور کی تردید کرتا ہے۔ ثالثاً ملا عمر کی امارت فقہی اعتبار سے اسی وقت معتبر ہو سکتی ہے جب کہ اسے خلیفۂ وقت کی تائید حاصل ہو۔ یا پھر وہ امیر افغانستان کے بجائے عالمی سطح پر خود کو امیر المؤمنین کی حیثیت سے پیش کریں۔ اور اس منصب کے لئے اہل ایمان سے بیعت کے طلب گار ہوں۔ جب تک یہ تین بنیادی موانع دور نہیں ہوتے طالبان کی اسلامی حیثیت مستحکم نہیں ہوتی۔

اب آیئے مجسموں کے انہدام سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ طالبان کے مطابق مجسموں کے انہدام کا معاملہ افغانستان کے علماء کا متفقہ فیصلہ تھا۔ ایسی رپورٹیں ملتی رہی تھیں کہ بعض سیاح اب بھی ان مجسموں کی پرستش کے خیال سے جاتے ہیں۔ اب جب اللہ تعالی نے انہیں اقتدار سے نوازا تھا انہوں نے اس کا انہدام مناسب جانا۔ یہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں تھا جس کی سند کتاب و سنت میں نہ پائی جاتی ہو۔ سنت ابراہیمی اور سنت محمدیؐ اس کے حق میں تھی۔ اس قسم کی انہدامی کاروائی دینی تاریخ میں کوئی نیا واقعہ نہ تھا جس پر ہنگامہ کھڑا کیا جاتا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کے اہل دانش بھی آثار قدیمہ کے حوالے سے ان کی حفاظت کے لئے میدان میں آگئے۔ خود آثار قدیمہ کی حفاظت کا موقف یا تہذیبی میراث کی حفاظت کا مسئلہ ایسے اجنبی ایجنڈے ہیں جن کے لئے مغرب کی سیکولر شریعت سے تو دلیل لائی جاسکتی ہے کتاب و سنت سے اس کی حمایت میں دلیل فراہم کرنا ممکن

نہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ بعض علماء نے مغل بادشاہوں کی رواداری کو سند کی حیثیت سے پیش کیا، اور بعض نے اہرام مصر کی موجودگی سے یہ دلیل لانے کی کوشش کی کہ طالبان کا قدم کتاب و سنت سے متصادم ہے۔ اور یہ کہ ان کے اس عمل سے اسلام کی تصویر مسخ ہوگئی ہے۔ حالانکہ اسلام کی تصویر مسخ کرنے کا سہرا تو ان لوگوں کے سر ہے جنہوں نے علی الاعلان انتہائی بے شرمی سے بتوں کی حفاظت اور حمایت میں نعرے بلند کئے۔

عالم اسلام میں علامہ یوسف القرضاوی کے موقف نے مزید کنفیوژن پیدا کیا مفتی مصر اور بعض دوسرے عرب علماء کے ساتھ قرضاوی صاحب نے مجسموں کی حفاظت کی خاطر افغانستان تک سفر کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ بت شکنی کے لئے مناسب وقت نہیں ہے لیکن افغانستان کے مطلع پر جب ان کا طیارہ طلوع ہوا اور اسے کئی بار اترنے کے لئے زبردست طوفان کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اپنی زندگی سے مایوسی ہونے لگی تب شاید علماء کے اس وفد کو احساس ہوا کہ وہ ایک غلط موقف کی حمایت میں کس کیمپ میں جا پہنچے ہیں اس وقت مجسمے کے انہدام کا عمل جاری تھا یہ حضرات اپنے موقف سے اتنے بددل ہوئے کہ انہوں نے جائے واردات پر جانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ حکومتی نمائندوں سے مل ملا کر واپس آگئے۔

ہمارے خیال میں قرضاوی ہوں یا کوئی اور، انسان کی حیثیت سے غلطیوں کا سرزد ہو جانا عین فطری ہے۔ ہمیں محض بڑے ناموں کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حق یقیناً ان کے ساتھ ہوگا۔ حق کا میعار کتاب و سنت کی تعلیمات ہیں جو کم از کم مذکورہ مسئلے میں طالبان کی حمایت کرتی ہیں ان کے مخالفین کی نہیں۔

جو لوگ اس عمل کی مخالفت میں کتاب و سنت کی واضح تعلیمات کا خیال نہیں کرتے انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کی آواز میں آواز ملانے والے لوگ کون ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جن لوگوں نے بت شکنی کی مخالفت کی ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگئے ہیں۔ البتہ یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مدت سے ہمارے اندرون لبرلزم اور سیکولرزم کی جو آندھی چل رہی ہے، اور جس ذلت و بے بسی کو ہمارے علماء و دانشوروں نے بہ خوشی قبول کر رکھا ہے۔ اور جس صورت حال کے خلاف انہوں نے سکوت اختیار کیا ہوا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم بعض بنیادی تعلیمات کے سلسلے میں بھی ابہام کا شکار ہوگئے

ہیں۔ یہ ایک الارمنگ صورت حال ہے ہمیں اس صورت حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

معتدل مسلمان یا انتہا پسند جنگجو

امتِ وسط سے کیا مراد ہے؟

سوال: اس وقت مسلم علماء واضح طور پر دو کیمپوں میں بٹ گئے ہیں ایک خود کو معتدل کہتا ہے اور پرامن جمہوری طریقے سے غلبۂ اسلام کا راستہ دکھاتا ہے دوسرا گروہ قوت کے استعمال کو واحد لائحۂ عمل سمجھتا ہے اور جہاد کے بغیر کسی تبدیلی کو ناممکن باور کراتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ہی قرآن اور ایک ہی رسول کی تعلیمات سے دو بالکل مختلف نظریے کیسے پیدا ہو گئے ہم جیسے مسلمانوں کے لئے جن کا دین کا علم چند کتابوں تک محدود ہے۔ یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ آخر حق کس کے ساتھ ہے۔ اگر آپ اس بارے میں میری تسلی کر سکیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

جواب: ہمارے خیال میں مسلمانوں کو معتدل یا متشدد کے خانوں میں بانٹنا، کسی کو پرامن قرار دینا اور کسی پر جہادی کا لیبل لگا دینا اسلام دشمنوں کا وطیرہ تو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کا نہیں۔ اسلام دشمن طاقتیں دراصل مسلمانوں کو تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار کر دینا چاہتی ہیں۔ وہ ایک گروہ کو لبرل اور معتدل باور کراتی ہیں اور ان کے ساتھ مفاہمت کا عندیہ دیتی ہیں جب کہ دوسرے گروہ کو متشدد، جہادی اور فنڈا منٹلسٹ کا نام دے کر ان کے خلاف محاذ کھول دیتی ہیں۔ بے چارہ لبرل مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ دشمن دراصل فنڈامنٹلزم اور انتہا پسندی کے خلاف ہے۔ اور یہ کہ معتدل قسم کے مسلمان افہام و تفہیم کے ذریعہ پرامن بقائے باہم کی صورت حال پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ تو رہی وہ معروف اسٹریٹجی جو فی زمانہ اسلام دشمن طاقتوں نے مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق پر نقب لگانے کے لئے اپنائی ہوئی ہے۔ رہی یہ بات کہ اسلام کے غلبہ کا راستہ پرامن جمہوری راستے سے ہو کر گزرتا ہے یا نہیں اور یہ سوال کہ کیا فی زمانہ قوت اسلامی کا نیا میزانیہ تشکیل دینے کے لئے افہام و تفہیم یا پرامن طریقۂ تبلیغ کے ذریعہ جمہوری انداز سے موجودہ نظام کفر کو تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ تو اس

سوال پر کتاب و سنت اور انسانی تاریخ و تجربے کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بھلا رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے زیادہ امن کا مبلغ اور کون ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مکہ کی پرامن ٹھہری ہوئی سوسائٹی میں جب آپؐ نے لاالہ کا نعرہ بلند کیا اور لوگوں پر یہ بات واضح کردی کہ وہ مروجہ نظام زندگی کی بساط لپیٹ کر الٰہی خطوط پر معاشرے کی ازسرنو تشکیل چاہتے ہیں۔ تو اس دعوت نے گویا ایک ہنگامی صورت حال پیدا کردی۔ پھر وہ مرحلہ بھی آیا جب خود آپ کو مسلح جدو جہد کی کمان سنبھالنی پڑی یہاں تک کہ قرآن کے اس حکم کی آپ نے تکمیل کردی "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ" (الصف:۸) جو لوگ رسول اکرمؐ کے منہج انقلاب سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بوسیدہ نظام کفر کے ڈھانچے کو منہدم کئے بغیر اسلام کا نظام عدل قائم نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کہ نظام کی تبدیلی کا یہ عمل پرامن جمہوری اور دستوری طریقے سے نہ تو دنیا میں کہیں اب تک ممکن ہو پایا ہے اور نہ ہی رسول اکرمؐ کے منہج انقلاب میں اس طریقے کی کوئی جھلک ملتی ہے۔ نظامِ عدل کے قیام کی دعوت دینا خود اس بات کا اعلان ہے کہ آپ موجودہ نظام سے سخت بے زار ہیں اس کی جگہ ایک نئے نظام کو قائم کرنا آپ ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ کی یہ دعوت بنیادی طور پر مروجہ نظام کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ اب اگر مروجہ نظام آپ کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا یا آپ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ آپ بلا سوچے سمجھے ایک ایسا نعرہ لگارہے ہوں جس کی حیثیت بے جان عقائد کی ہو اور جسے عملی طور پر برتنا آپ کے پروگرام میں شامل نہ ہو۔ آج مساجد و مدارس سے بلند ہونے والی صدائے لاالہ کا اگر نظامِ کفر سنجیدگی سے نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ نہ کہنے والوں کو اس بات کا شعور ہے کہ وہ کتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں اور نہ ہی سننے والے اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ یہ سب کچھ نظام کفر کے خاتمے کا اعلان ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اسی ایک نعرے پر تو مکہ میں ہنگامی صورت حال کا اعلان ہو جائے، اہل ایمان ہجرت پر مجبور ہو جائیں لیکن اسی نعرے سے ہمارے زمانے میں نظام کفر کوئی خطرہ محسوس نہ کرے۔

ہمارے خیال میں پرامن طریقۂ تبلیغ سے شروع ہونے والا سفر بالآخر مسلح جدو جہد اور پھر نظامِ

عدل کے قیام پر منتج ہو گا یہ سب ایک ہی سفر میں پیش آنے والی مختلف منزلیں ہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غلبۂ اسلام کا راستہ نہ تو صرف پرامن طریقۂ تبلیغ سے وابستہ ہے اور نہ ہی صرف جہادی طرزِ فکر کے ذریعہ نظامِ عدل قائم ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے منہج انقلاب میں ہمیں ان دو انتہاؤں کی بہترین آمیزش ملتی ہے۔ مسلمان نہ تو جہادی طرز فکر خیرباد کہہ سکتا ہے اور نہ ہی پرامن اور پرحکمت طریقہ تبلیغ سے اپنا تعلق توڑ سکتا ہے۔ یہی ہے وہ راہ اعتدال جو غلبۂ اسلام کے آرزو مندوں کو اپنانا چاہئے۔

قرآن میں مسلمانوں کو امت وسط سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مغرب جس عمل کو انتہا پسندی گردانتا ہے خود اسلام میں وہ ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو اعتدال کا راستہ اپنانا چاہئے۔ حالانکہ اعتدل یا معتدل سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ہر صورت میں عدل پر قائم رہیں۔ جہاں مجرموں کو متعین سزا دینے کی بات کی گئی ہے وہیں یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ کسی پر ظلم نہ کیا جائے یعنی متعینہ حدود سے مسلمان تجاوز نہ کریں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان اپنی غیرت ایمانی کو خیرباد کہہ کر دشمن کی نظروں میں معتدل، لبرل یا easy قرار پائیں۔ یا یہ کہ ان آیات قرآنی کے پیش کرنے سے باز رہیں جن سے ان پر انتہا پسند ہونے کا الزام لگتا ہو اور جن میں نظامِ عدل کے قیام کے لئے تمام دنیا کی مخالفت مول لینے کی بات کی گئی ہو یا اس قسم کی آیات جن میں کفار و مشرکین کی حیثیت "صاغرون" کی متعین کی گئی ہو۔ اس لئے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ کہ اس کا پیغام بغیر کسی کمی وبیشی کے دنیا والوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ رسول اکرم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے "یَآاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ...... الآیة" (المائدۃ:٦٧)

فی زمانہ جہادی اور پرامن دونوں طریقۂ تبلیغ کے نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں طریقۂ تبلیغ کے حامیوں نے اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم نے رسول اکرمؐ کے منہج کو کلی طور پر برتنے کے بجائے اس کے بعض اجزاء کو اپنی سرگرمیوں کا ماحصل قرار دے رکھا ہے۔ جو لوگ جمہوری طریقۂ تبلیغ سے نظام کی تبدیلی کے خواہاں ہیں انہیں مصر، پاکستان اور الجزائر میں جمہوری طریقۂ کار کے انتہائی مایوس کن نتائج سے صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔

نظام کفر کے بارے میں یہ خوش فہمی صحیح نہیں کہ وہ پرامن طریقے سے آپ کے لئے جگہ خالی کردے گا۔ رہے وہ لوگ جو مغرب کی معروف اصطلاحوں میں جدید دنیا کی تفہیم کے ذریعہ ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ہر معاشرہ دوسرے پر انحصار کے لئے مجبور ہے۔ اور یہ کہ Plural Society کے اس دور میں خلافتِ اسلامی کے قیام کے بجائے مسلمانوں کو افہام و تفہیم اور نظری و فکری مناقشے کے ذریعہ نظام کی تبدیلی کی کوشش کرنی چاہئے یا جو لوگ اس التباس کے شکار ہوگئے ہیں کہ موجودہ ہندوستان جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں دراصل ایک دار الدعوۃ ہے جہاں مسلمانوں کو صرف پرامن تبلیغ پر قانع رہنا چاہئے، اسلامی نظام کے قیام کی بات یہاں مناسب نہیں، تو دراصل اس قسم کے خلط مبحث کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو رسول اکرمؐ کے منہج انقلاب سے نہ کوئی واقفیت ہے اور نہ ہی انہیں کبھی اپنے دل و دماغ کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا موقع ملا ہے۔ ورنہ انہیں یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ مسلمانوں کے لئے انسانی تاریخ کا ہر معاشرہ اور دنیا کا ہر خِطّہ دراصل دار الدعوۃ کا سماں پیش کرتا ہے۔ حتی کہ خود اسلامی نظامِ عدل کے اندر رجوع اِلی اللہ کا کام بند نہیں ہو جاتا۔ دنیا کا ہر معاشرہ بنیادی طور پر ایک مخلوط معاشرہ ہوتا ہے، جہاں بھانت بھانت کے خیال وافکار رکھنے والے لوگ، قبائل وشعوب، مذہبی، لسانی اور دوسری بنیادوں پر پہچانے جاتے ہیں۔ ہر گروہ کے اندر اقلیت در اقلیت موجود ہوتی ہے اور معاشرتی طور پر ایک گروہ دوسرے پر انحصار کے لئے مجبور بھی ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کہیں کم اور کہیں زیادہ تو ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جدید ٹکنالوجی کی موجودہ دنیا میں یہ انحصار پہلے کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہو۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نہیں بھلانا چاہئے کہ ٹکنالوجی کی ترقیوں نے جتنے مواقع ایک گروہ کو فراہم کئے ہیں اتنے ہی مواقع مقابل گروہ کے لئے بھی موجود ہیں۔ اس لئے صورت حال کی بظاہر تبدیلی سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ فی زمانہ نظام کی تبدیلی منہج نبوی کے علاوہ کسی اور طریقے سے ہوسکتی ہے۔ کہ دوسرے طریقہ ہائے تبدیلی سے کوئی اور نظام تو قائم ہو سکتا ہے، اسلامی نظام نہیں۔

نظامِ کفر میں شرعی امارتیں

سوال: ہمارے یہاں صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کے نام سے ایک اسلامی نظام قائم ہے۔ جسے

رؤیت ہلال جیسے مسئلوں پر معتبر سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ یہاں نکاح وطلاق کے مسائل بھی قاضی شریعت کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ اگر کچھ اسی طرح کا نظام ملک گیر سطح پر قائم ہو جائے تو مسلمانوں کے لئے اسلامی زندگی جینے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سی مقامی تنظیمیں اور ملک گیر سطح کی دینی جماعتیں امارت شرعیہ سے بھرپور تعاون نہیں کرتیں۔ رؤیت ہلال کے مسئلے پر دوسرے اداروں کے اعلانات بھی بعض اوقات بڑے مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب امارت شرعیہ اور کسی دوسرے مسلم ادارے میں راست ٹکراؤ نظر آتا ہو تو شرعی طور پر ہمیں کس کے فیصلے کو قبول کرنا چاہئے کیا آپ کتاب وسنت کی روشنی میں اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

جواب: ہمارے خیال میں آپ کو ساری غلط فہمی دراصل اس وجہ سے ہوئی ہے کہ آپ نے امارت شرعیہ کو واقعتاً اسلامی نظام کا ہم معنی سمجھ رکھا ہے جبکہ دوسری دینی جماعتوں اور امارت شرعیہ میں فرق صرف اتنا ہے کہ ان بے چاروں نے اپنی جماعت یا ادارے کو شرعی امارت کا نام دینے کے بجائے اسلامی، تبلیغی، دیوبندی، بریلوی، یا اہل حدیث جماعت کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ جس طرح وزیر یا بادشاہ جیسا نام رکھ لینے سے کوئی شخص فی الواقع مسند وزارت یا شہنشاہیت پر فائز نہیں ہو جاتا اسی طرح محض کسی ادارے کا نام شرعی امارت رکھ لینے سے اس کی مذکورہ حیثیت مستحکم نہیں ہو جاتی۔ اگر موجودہ ہندوستان میں کوئی شخص اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کہلاتا ہو تو آپ اس کی دماغی حالت کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ اسلامی امارت خواہ اسے خلافت اسلامی کہا جائے یا امارتِ شرعی، دراصل اس کا وجود قوت تنفیذ سے عبارت ہے۔ قوت نافذہ کے بغیر اگر چند افراد کا کوئی مجموعہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے امیر المومنین، قاضی القضاۃ، قاضی شریعت، امیر الہند یا امیر شریعت جیسی اصطلاحیں استعمال کرتا ہو تو اس پر کسی تمثیلی ڈرامے کا گمان تو ہو سکتا ہے حقیقت کا نہیں۔

ہمیں اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جب عین نظام کفر کے اندر مسلمانوں کی شرعی امارتیں کام کر رہی ہوں۔ جو لوگ عین نظام کفر میں نظام اسلامی کے قیام کے دعویدار ہوں، یا جنہیں اس بات پر اصرار ہو کہ ان کی قائم کردہ امارت کو شرعی امارت قرار دیا جائے، ان سے پوچھنا چاہئے کہ آخر اس بات کے حق میں ان کے پاس کتاب وسنت سے کیا دلیل ہے۔ رہی موجودہ امارتِ

شرعیہ جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ایسے افراد کی انجمن ہے جو بہانگ دہل ملک کے موجودہ غیر اسلامی نظام کے ہاتھوں بیعت کر چکے ہیں۔ سیکولر ڈیموکریسی کو انہوں نے برضا و رغبت قبول کر رکھا ہے بلکہ اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر ان کے قلم اور زبان سے مروجہ سیکولرزم کی تعریف و حمایت میں شب و روز بیانات وارد ہوتے ہیں۔ تمام سیکولر اداروں کی طرح وہاں بھی قومی علامتوں کو وہی تقدس حاصل ہے اور اسی جوش و خروش کے ساتھ وہاں بھی قومی دن اور قومی جھنڈے کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ ڈھکے چھپے نہیں بلکہ کھلم کھلا شرعی تقاضے کے طور پر انجام پاتا ہے جس کی تفصیلی رپورٹ خود اسی ادارے سے شائع ہونے والے جرائد کے ذریعہ ہم تک پہنچتی رہتی ہے۔ کسی عام سیکولر ادارے میں جس انداز سے زندگی کا کاروبار چل رہا ہے اور اجتماعی زندگی کے سلسلے میں جو نقطۂ نظر پایا جاتا ہے وہ سب کچھ امارتِ شرعیہ کے کیمپس میں بھی انجام پاتا ہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ادارے کو شرعی اور دوسرے کو غیر شرعی کیوں قرار دیا جائے۔

دوسری بات جو ہر خاص و عام پر عیاں ہے وہ یہ کہ مذکورہ امارتِ شرعیہ عملی طور پر ملک کے اسی دستور اور اسی نظام کی پابند ہے جس کی پابندی دوسرے ادارے اور جماعتیں کرنے پر مجبور ہیں۔ اس اعتبار سے اسے موجودہ نظام کفر کا تتمہ یا توسیعہ (Extension) کہنا چاہئے۔ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ کوئی نظام جو عملی طور پر نظام کفر کا ہی حصہ ہو اور اس کی ماتحتی میں کام کرنے پر مجبور ہو، بھلا وہ خود کو اسلامی نظام یا شرعی امارت کیسے کہہ سکتا ہے۔ ہاں اس طرح کے ناموں سے عام مسلمانوں کو یہ دھوکہ ضرور ہوتا ہے کہ شاید عین نظام کفر کے اندر اسلامی زندگی جینے کا امکان موجود ہے۔ یہ ایک اضافی نقصان ہے کہ اس طرح کی امارتوں کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ "مالایدرك كله لايترك جله" جو کتاب و سنت سے اخذ کیا ہوا اصول نہیں بلکہ عام سفہاء کے درمیان معروف ضرب المثل ہے اور جو شرع اسلامی کے مسلّم اصول "اُدْخِلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّة" (البقرہ:۲۰۸) کی عین ضد ہے۔ اس طرح کے ادارے اپنے حق میں یہ دلیل لاتے ہیں کہ دین کا جو حصہ قابل عمل ہو اور جس پر فی زمانہ عمل ممکن ہو اس پر عمل کرنے کے لئے ایک شرعی نظام ترتیب دے لیا جائے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کل کے حصول میں جز بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ قرآن اس رویے کی سخت الفاظ

میں گرفت کرتا ہے۔"أَفَتُؤمِنُوْنَ بِبَعضِ الْکِتابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعض...... الآية" (البقرہ:۸۵)دراصل دین کے اسی خود ساختہ ایڈیشن کے بارے میں تنبیہہ ہے۔ان شرعی امارتوں کے ذریعہ دین پر عمل تو کیا ہوتا دین کا ایک تحریف شدہ ایڈیشن وجود میں آگیا ہے۔ایک ایسا دین جو صرف نکاح وطلاق اور وراثت کے مسائل میں اپنے ماننے والوں کی رہنمائی کرتا ہے اور زندگی کے دوسرے اہم ترین اجتماعی امور کفارو مشرکین کے حوالے کر دینے میں تکلف محسوس نہیں کرتا۔ایک ایسے امیرالمومنین یاامیر شریعت کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے جو کہنے کو تو خلیفۃ الرسولؐ ہے لیکن اس بے چارے کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ نظام کفر کا ایک معمولی ہرکارہ بھی اس کے گریباں سے کھیل سکتا ہے۔یوں تو وہ مسند قضا پر بیٹھ کر بڑے بڑے فیصلے لیتا ہے لیکن اس بے چارے کے پاس کوئی ایسی قوت نافذہ نہیں ہوتی جو ان فیصلوں کا بھرم قائم رکھ سکے۔بے بسی اور کسمپرسی کی سراپا تصویر اگر کہیں نظر آتی ہے تو ہمارے اسی امیرالہند یاامیر شریعت میں۔اگر اس نظام کے اندر اس کی تھوڑی بہت توقیر کا کوئی منظر نظر بھی آتا ہے تو اس کا سارا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ موجودہ نظام کفر سے اس کے مراسم کیسے ہیں۔سیاسی پارٹیوں یا وزراء اور گورنروں سے اس کی راہ ورسم کتنی مضبوط ہے۔گویا شرعی امارتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ نظام کفر سے ہی اپنے مطلوبہ احترام واعتبار کی طلب گار ہوتی ہیں۔ بعض لوگ مکی زندگی اور مہاجرین حبشہ سے اس طرح کی امارتوں کا جواز لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں صورت حال کسی ایسی امارت کے جواز میں کوئی دلیل فراہم نہیں کرتی۔اولاً مکی زندگی میں آپؐ نے نظام کفر کو ایک مسلط حقیقت کے طور پر قبول نہیں کیا۔روز اول سے نظام کفر کی طرف آپؐ کا رویہ متحاربانہ اور چیلنج کا تھا۔دین کی دعوت بنیادی طور پر مروجہ نظام کو الٹ پھینکنے اور اس کی جگہ اسلامی نظام عدل کے قیام سے عبارت رہی۔ کئی بار ایسے مواقع بھی آئے جب مسلمانوں کو اپنے خدا کی عبادت اور اپنی پسند کی شریعت پر عمل کی آزادی دینے کی بات کی گئی بشرطیکہ وہ مروجہ نظام کے خلاف اپنی زبان نہ کھولیں اور دوسروں کے لئے ان کی پسندیدہ شریعت پر عمل آوری میں مخل نہ ہوں۔ لیکن رسول اللہؐ نے اسلام کے علاوہ کسی اور نظم اجتماعی کے امکان کو ہی سرے سے رد کر دیا۔کہ آپ کا مشن دراصل "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ" سے عبارت تھا۔

اب آیئے مہاجرین حبشہ کی اجتماعی زندگی پر ایک نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ اس سے مسلمانوں

کے لئے موجودہ نظام کفر میں پر امن بقائے باہم کا جواز فراہم ہوتا ہے یا نہیں اور یہ کہ ہمارے یہاں بھی وقت کے جعفر بن طیار اگر ملک کے مختلف گوشوں میں شرعی امارتیں سنبھالے ہوئے ہیں تو کیوں نہ ہم بھی اس متبرک گروہ میں شامل ہو جائیں۔ لیکن کون ہے ہم میں جو جعفر بن طیار کی سی جرأت کے ساتھ حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں اسلام کی صداقت کا یقین دلا سکے۔ کم از کم ان لوگوں سے تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی جنہوں نے پہلے ہی مرحلے میں موجودہ نظام کو برضا و رغبت قبول کر رکھا ہو اور جو اس کے استحکام کے لئے اپنے زبان و قلم کو مسلسل حرکت میں رکھتے ہوں۔ حبشہ میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے سلسلے میں ہمیں جو تفصیلات ملتی ہیں اس میں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اہل ایمان کے اس گروہ کو پہلے ہی مرحلے میں نجاشی کی ذاتی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ حبشہ میں انہیں ایک طرح کی سیاسی پناہ ملی تھی۔ اہل ایمان جانتے تھے کہ مہاجرت کی یہ زندگی ایک عبوری مرحلہ ہے۔ جلد ہی جزیرۃ العرب کے حالات بدلیں گے اور دوبارہ انہیں اپنے محبوب قائد اور رسولؐ کی معیت میں معرکہ آرائی کا موقع ملے گا۔ پھر یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ خود آپؐ کی ذات گرامی یعنی امت مسلمہ کا مرکز و محور مسلمانوں کا امیر سیاسی پناہ گزینی کے اس مرکز سے دور اپنی افرادی قوت کو مکہ میں بیٹھ کر منظم کرتا رہا۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ تذکرہ بھی موجود ہے کہ نجاشی دراصل پوشیدہ طور پر ایمان لے آیا تھا اور یہ کہ اس کی موت پر آپؐ نے مسلمانوں کے ساتھ غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی۔ اس لئے واقعہ حبشہ سے یہ دلیل لانا کہ مسلمان کسی غیر اسلامی نظام میں ایک مطمئن اقلیت کی حیثیت سے زندگی گذار سکتے ہیں صحیح موقف نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ہمیں کسی ایسی صورت حال کا بیان نہیں ملتا جب مسلمانوں کے لئے نظام کفر کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے عین اس کی سرپرستی میں شرعی امارتیں قائم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ قرآن میں شریعت سے مراد وہ شریعت ہے جو نظام کفر کی بساط لپیٹ کر اس کے کھنڈر پر اپنی عمارت تعمیر کرتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کیسی شرعی امارتیں ہیں جسے نظام کفر نے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا ہوا ہے۔ اسلام اور کفر کی مثال آگ اور پانی کی ہے۔ دونوں ایک برتن میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک کی زندگی دوسرے کیلئے موت کا پیام ہے۔ رہی یہ بات کہ جہاں ہر لحہ ایک نئی قیادت کا ظہور ہو رہا

ہے اور جہاں ہر گلی نکڑ سے امیر المومنین، امیر الہند، امیر شریعت، قائم الزماں، خلیفۃ العصر، قاضی شریعت ابلے پڑتے ہوں وہاں ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے کہ کون معتبر ہے اور کون غیر معتبر۔ البتہ اسلامی شرع کی رو سے یہ ضرور ہے کہ امت میں بیک وقت ایک ہی امیر، قائد یا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ قیادت کی ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ ایک امارت کے قیام کے بعد اٹھنے والی دوسری آوازیں بغاوت پر محمول کی جاتی ہیں جس کے لئے شریعت نے بڑی دردناک سزا تجویز کی ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کی امارتوں کی توسیع سے اسلام اور مسلمانوں کا کچھ بھلا نہ ہو گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دین کے اس ایڈیشن کو منظر عام پر لایا جائے جو نظام کفر کی بساطِ لپیٹ کر حقیقی معنوں میں شرعی امارت قائم کرتا ہے۔ جسے آپؐ نے مدینے میں قائم کیا اور جس کی نگہبانی کا فریضہ آپؐ کے خلفائے راشدین نے انجام دیا، ہمیں چاہئے کہ اسی شرعی امارت کے از سر نو قیام کو اپنی جدو جہد کا محور بنائیں۔

اتحاد کے ممکنہ قرآنی طریقۂ کار کا ایک اجمالی تعارف

شیعہ سنی اختلاف کا مسئلہ

سوال: شیعہ سنی فسادات کا سلسلہ اب لکھنؤ سے نکل کر مبارکپور جیسے چھوٹے قصبات تک آپہنچا ہے ادھر پاکستان میں سپاہ صحابہ اور فقہ جعفریہ کے درمیان چل رہی مسلسل جنگ سے بھی آپ واقف ہوں گے۔ ایرانی انقلاب کے بعد ہم لوگ خاصے پر امید ہو گئے تھے کہ شاید صدیوں پرانی شیعہ سنی منافرت اب لا شیعہ لا سنیہ، اسلامیہ اسلامیہ کے نعرے میں بدل جائے گی۔ لیکن افسوس کہ ایسا کچھ نہ ہو سکا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان دونوں فرقوں کا اختلاف محض سیاسی نوعیت کا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں فرقوں کے درمیان دیرپا اتحاد قائم ہو سکتا ہے؟ خود سنیوں کے مختلف دھڑے وہابی، دیوبندی، بریلوی اور جماعتی آپس میں دست بہ گریباں رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک گروہ دوسرے کو کافر قرار دینے میں بھی کچھ حرج نہیں سمجھتا۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان غیر مسلموں کے عتاب کا شکار ہیں آپسی اختلافات کے خاتمے کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ کیا کتاب و سنت میں کوئی ایسا طریقہ کار پایا جاتا ہے؟

جواب: یہ سچ ہے کہ شیعہ سنی اختلاف کے پیچھے ایک طویل تاریخ ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دونوں فرقوں کے دردمند اور مخلص افراد کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہ اختلافات نہ صرف قائم ہیں بلکہ بعض خطوں میں تو اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ پڑوسی ملک پاکستان میں نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ عین مسجد کے اندر بحالت نماز ایک فرقہ دوسرے فرقے پر گولیاں چلاتا ہے اور نمازیوں کو شہید کرنے میں اسے کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا۔ اس طرح کی وحشیانہ کاروائیوں کو صرف بیرونی دہشت گردی کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کہیں نہ کہیں ایسی بات ضرور ہے جو ایک خدا ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان لانے والے ان دونوں فرقوں کو حالت امن میں بھی باہم شیر و شکر ہونے سے روکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس اختلاف کو کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ تو اس بارے میں قرآن میں جو اصول بتایا گیا ہے میرے خیال میں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لیکن یہ راستہ ہے بہت دشوار گذار، اس لئے کہ اس راہ میں دونوں فرقوں کو ان توہمات اور مفروضہ حقائق کو خیرباد کہنا ہوگا جن کی حیثیت فی الاصل ہے تو تاریخ کی لیکن ہم نے اسے عقائد کا مسئلہ بنا رکھا ہے۔

اب آیئے قرآن کی اس آیت کی طرف "وَمَاكَانَ النَّاسُ اِلا امة واحدة فاختلفوا...... الآیة" (یونس:۱۹) ابتداء میں ساری امتیں ایک تھیں کہ الٰہی پیغام ایک ہی خدا کی بندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات کی دعوت دیتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اس پیغام پر تاریخ کی گرد پڑتی گئی اور لوگوں نے پیغام کی فی نفسہ تفہیم کے بجائے قیل و قال کے ذریعہ اس کی مختلف تشریحات گھڑلیں تو اس صورت حال نے اختلافات کو جنم دیا اور مختلف مفروضہ حقائق کی بنیاد پر فرقے وجود میں آگئے۔ اب اگر امت مسلمہ کے مختلف فرقے اس بات کے خواہش مند ہوں کہ ان اختلافات کی بساط لپیٹ دی جائے تو اس کا منطقی طریقۂ کار یہ ہوگا کہ وہ پیغام الٰہی کی اپنی اپنی من گھڑت تشریحات سے دست بردار ہو کر نفس پیغام کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ مسئلہ کچھ اتنا آسان نہیں اتحاد سے افتراق اور توحید خالص سے شرک کے سفر میں قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس پس منظر میں مذکورہ مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔ واقعہ یوں ہے: ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا جب موسیٰ بنی اسرائیل کو ہارون کی تولیت میں دے کر وادی سینا سے رخصت ہوئے تھے۔ لیکن اس قلیل عرصے میں ان کی قوم نے الہ واحد کی بندگی

چھوڑ کر اپنی خواہشات کا ایک بچھڑا برآمد کرلیا۔ ان کی ایک قابل ذکر آبادی اب اس وہم کا شکار ہوگئی کہ بچھڑے سے نکلنے والی آواز الوہیت سے عبارت ہے۔ موسیٰ نے جب واپس آکر یہ صورت حال دیکھی تو انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ ہارون علیہ السلام سے باز پرس کی جن کا جواب یہ تھا کہ انہوں نے اس صریح گمرہی کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانے سے صرف اس لئے گریز کیا کہ ان کا یہ قدم بنی اسرائیل کو دو گرہوں میں نہ بانٹ دے۔ کہ ان میں جو لوگ بچھڑے کی پر اسراریت اور الوہیت کے قائل تھے ان کے لئے بچھڑے سے دست برداری کچھ آسان نہ تھی۔ ایسی صورت میں توحید پرستوں سے ان کی علیحدگی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس واقعہ میں اتحاد سے افتراق کا سفر، اوہام و خرافات میں مبتلا ہونے اور پھر اپنے خود ساختہ عقائد کی پرستش میں لگ جانے سے عبارت ہے۔ آج اگر شیعہ اور سنی اہل قبلہ ہونے کے باوجود خود کو قطبین کے فاصلے پر پاتے ہیں اور انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر لمحے نظری اور فکری طور پر باہم متحارب ہیں تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہر دو فرقے نے اپنی مفروضہ تاریخ اور مفروضہ خواہشات کا ایک بچھڑا بنا رکھا ہے جس کی عبادت سے وہ دست برداری کے لئے تیار نہیں۔ دونوں فرقوں کے اہل نظر اس بات کا احساس تو کرتے ہیں کہ ان کے ہاں غیر مستند تاریخ نے عقائد کا سا اعتبار حاصل کرلیا ہے اور شاید ان دونوں فرقوں کے خدا ترس اہل فکر اس بات کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے درمیان پائے جانے والے سامریوں کی ترکیبوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔ لیکن زوال زدہ بنی اسرائیل کی نفسیات ان پر حاوی ہے کہ جب ان سے گائے کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے مطالبے کو ٹالنے کے لئے اس نوعیت کے تکنیکی سوالات اٹھادیئے کہ گائے کس نوع کی ہو، اس کا رنگ کیسا ہو وغیرہ وغیرہ۔ شیعہ اور سنی ہی پر کیا موقوف ہے واقعہ یہ ہے کہ آج امت کا مختلف گروہوں میں بٹ جانا، خود سنی فکر کے اندر دیوبندیت، بریلویت کا معرض وجود میں آنا، مقلد اور غیر مقلد کے نام پر مسلمانوں کا مختلف خیموں میں بٹ جانا، دین کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں کا آپس میں متحارب ہونا، یہ سب اس لئے ہوا ہے کہ ہر فرقے، گروہ اور جماعت نے اپنے اپنے حضرت، پیر صاحب اور امیر جماعت کا ایک بچھڑا تشکیل دے رکھا ہے۔ جذباتی طور پر یہ بچھڑا انہیں اتنا عزیز ہے کہ وہ اس سے دست بردار ہونے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ امت کو جب تک ہم یہ یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہوتے کہ

ہمارے اندر کا سارا انتشار دراصل انہی بچھڑوں کی وجہ سے پایا جاتا ہے اور جب تک ہر گروہ اپنے اپنے بچھڑے کی قربانی دے کر ربِ موسیٰ وہارون کی طرف نہیں لوٹتا اس وقت تک اس میں انتشار در انتشار، تفرقہ در تفرقہ پیدا ہوتا جائے گا اور احیائے اسلام کے نام پر اٹھنے والی ہر تحریک اور غلبۂ دین کے نام پر سامنے آنے والی ہر قیادت ایک نئے بچھڑے کی تشکیل پر منتج ہوگی۔ قرآن کی نظر میں انتشار سے اتحاد اور شرک سے توحید کی طرف لوٹنے کا راستہ صرف اور صرف یہی ہے کہ ہم اپنے عہد کے سامریوں سے ہوشیار رہیں۔ ضروری نہیں کہ ہمارے عہد کا سامری بھی سونے کا مجسم بچھڑا ہی بنائے اور یہاں بھی "جسداً له خوار" کی کیفیت پائی جاتی ہو۔ ہمیں عہد جدید کے سامری، ان کے نئے تراشیدہ بت اور ان کے اندر سے نکلنے والی پر اسرار آوازوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔

رہی یہ بات کہ شیعہ اور سنی یا خود سنیوں اور شیعوں میں پائے جانے والے مختلف متحارب گروپ اپنے اپنے مقدس بچھڑوں کی قربانیاں کس طرح پیش کریں تو اس بارے میں بھی قرآن نے رہنمائی دی ہے۔ "وَمَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًا وَلَانَصْرَانِيًا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفاً مُّسْلِماً..........." (آل عمران:٦٧)
پیغام الٰہی سے دور ہٹ جانے والی قومیں اپنے مفروضہ عقائد کی صحت کے لیے متقدمین کی شخصیت کا سہارا لیتی ہیں۔ وہ لوگ جو الٰہی پیغام کے ابراہیمی سلسلے سے واقف تھے اور جن کے لئے آخری رسول ﷺ کی بعثت کے بعد اپنے انحراف پر قائم رہنا مشکل ہو گیا تھا انہوں نے اسی میں عافیت جانی کہ وہ اس سلسلے کے برگزیدہ پیغمبروں سے اپنے مفروضہ عقائد کی سند لائیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر کہ ابراہیم نہ تو یہودی تھا اور نہ عیسائی بلکہ وہ دین حنیف کا سچا پیرو تھا، اس دلیل کا ابطال کیا ہے کہ اہل کتاب کو ان برگزیدہ پیغمبروں سے کوئی نسبت نہیں۔ شیعوں اور سنیوں کے اکابر جن کی اتباع کو یہ دونوں گروہ عقائد کا مسئلہ بنا بیٹھے ہیں نہ تو شیعہ تھے اور نہ ہی سنی۔ اس قسم کی اصطلاحوں سے ان کے کان قطعی نا آشنا تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ خلفائے اربعہ کے تاریخی عقیدے سے نا آشنا تھے۔ اور حضرت علیؓ کو بارہ اماموں کے سلسلے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ بلکہ تاریخ تو اس بات پر شاہد ہے کہ شیعوں کے چھٹے امام حضرت جعفر صادق تک شیعہ سنی باقاعدہ علیحدہ فرقوں کی حیثیت سے وجود میں نہ آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد تک شیعہ اور سنی بزرگوں کا آپس میں شیر و شکر ہونا، ایک دوسرے کے خیالات سے استفادہ کرنا اور ایک امت کی

حیثیت سے باہم زندگی برتنا، تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہے۔ نہ تو حضرت ابوبکرؓ خود کو اہل سنت والجماعت کہتے تھے اور نہ ہی حضرت علیؓ کا کلمہ ابوبکرؓ کے کلمے سے مختلف تھا۔ یقیناً حضرت علی "علی وصی اللہ" کا کلمہ نہیں پڑھتے تھے جو آج شیعہ شناخت کا جز بن گیا ہے۔ یہ کبار صحابہ کرام ایک ہی رسولؐ کے تربیت یافتہ تھے اور انہیں ایک ہی دین اور ایک ہی کتاب ورثے میں ملی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ یہ بہت بعد کا قصہ ہے جب امت میں سامریوں کو اپنا کرتب دکھانے کا موقع ملا اور انہوں نے مسلم دنیا کے مختلف حصوں میں لوگوں کے مزاج اور ذہنی مناسبت کو دیکھ کر ان کے لئے تاریخ و عقائد کے مختلف بچھڑے بنا ڈالے۔ تب سے اب تک بچھڑوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ شیعہ اور سنی ہر دو گروہ کے اندر نہ جانے کتنے فرقے وجود میں آگئے۔ ایسی وضعی حدیثیں عام کی گئیں جن سے اختلاف و انتشار کو ہوا ملے اور وقت کے سامریوں کے لئے اپنے اپنے بچھڑوں کی حفاظت کرنا آسان ہو جائے۔ امت کا اختلاف جسے قرآن توحید سے ہٹ جانے کی وجہ بتاتا ہے اسے وضعی روایتوں میں "إِخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحمَةٌ" سے تعبیر کیا گیا۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو گمراہ ثابت کرنے کے لئے اس قسم کی وضعی حدیثوں کا سہارا لیتا رہا جس میں امت کے تہتر فرقوں میں بٹ جانے اور صرف ایک فرقے کے ناجی ہونے کی بات کہی گئی تھی۔ پھر اہل قبلہ کا خون حلال کرنے کے لئے ایسی حدیثیں بھی تراشی گئیں جن میں یہ بتایا گیا کہ ابلیس یا اس کے کارندے عین مسلمانوں کی شکل و صورت بنائے، چہروں پر سجدوں کا داغ سجائے، مسجد کی صفوں میں کھڑے نظر آئیں گے۔ ایسی صورت میں ان کے قتل سے ہی امت کو فتنے سے نجات دلایا جاسکے گا۔ اس طرح کی وضعی حدیثیں جو اپنے زبان و بیان، نفس کلام اور رجال کی گوناگوں کمزوریوں کے باعث خود اپنے جھوٹی ہونے کا اعلان کرتی ہیں، افسوس کہ مختلف فرقے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ انتہائی ضعیف احادیث ہیں جنہیں سرے سے حدیث کہنا ہی جسارت ہے۔ اپنے جماعتی اور گروہی لٹریچر میں کثرت سے ان کا استعمال کرتے ہیں تاکہ دوسرے گروہ کو گمراہ ثابت کیا جاسکے اور اس طرح ان کے اپنے مفروضہ عقائد اور قیادت کا بچھڑا محفوظ رہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سنی اور شیعی فکر از سر نو اپنا احتساب کرے۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں امام ابو حنیفہ، امام جعفر صادق، امام شافعی وغیرہم جیسے افراد کی ایک فہرست ہمیں ملتی ہے۔ اسلامی

تہذیب نے فقہ کے میدان میں صرف چار جلیل القدر افراد پیدا نہیں کئے بلکہ اسی درجے کے کوئی چھتیس، سینتیس لوگوں کا بیان ہمیں تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ان میں سے بعض فقہا کو نسبتاً کہیں زیادہ حمایتی زماں و مکاں اور ریاستی سرپرستی میسر آگئی بعض کی کتابیں تاریخ کی نذر ہو گئی اور بعض کی شہرت مسلسل پھیلتی رہی۔ ان میں سے صرف چار کو ائمہ اربعہ قرار دینا اور بقیہ کے علمی سرمائے کو نظرانداز کر دینا نہ تو تاریخ کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ہی علم کے ساتھ۔ رسول اکرم ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں امت سے الوداعی خطاب کیا تھا تب یہ آسمانی بشارت بھی آگئی تھی کہ اب دین کامل ہو چکا۔ وہ بنیادیں جن پر اس دین کو قائم کیا گیا ہے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہیں۔ کتاب و سنت کی تلقین کے ساتھ اس خطبے میں نہ تو کہیں خلفائے اربعہ کے عقیدے کی بات تھی اور نہ ہی فقہائے اربعہ کی تقلید کی تلقین اور نہ ہی ائمہ اثنا عشر کی طرف کوئی اشارہ۔ پھر ان باتوں کو دین میں عقیدے کی سی اہمیت دے کر ہم نے اختلافات کی دیواریں کیوں کھڑی کر رکھی ہیں؟ اسی طرح آج جو علمائے کرام قاسمیت، وہابیت یا بریلویت کی حمایت میں اپنا زور صرف کر رہے ہیں یا جو حضرات اپنی اپنی جماعتوں کے شیوخ کو سب سے بڑا خادم اسلام باور کرانے پر مصر ہیں یا جنھیں اس بات پر اصرار ہے کہ اس ملک میں ان کی محبوب جماعت یا محبوب شخصیت کے دم سے ہی اسلام قائم ہے، انہیں یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی کہ وہ عہد جدید کے سامریوں کی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہیں نہ تو ان ورثوں اور ان جماعتوں کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا اور نہ ہی فیصلے کے دن ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے امام ابو حنیفہ کے مذہب کو دوسرے مذہب سے افضل ثابت کیا یا نہیں۔ حلقۂ دیوبند کے علماء کی برتری دوسرے طبقۂ علماء پر ثابت کی یا نہیں۔ آخر دوسرے ائمہ فقہ اور خادمین اسلام نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ اپنی ساری توانائی اپنی پسندیدہ شخصیات کے مقابلے میں ان کو کم تر ثابت کرنے میں جھونکے دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں امت کی مختلف جماعتوں، فقہی مسالک بشمول شیعہ اور سنی کو، اس عہد میں لوٹنا ہو گا جہاں ہماری اجتماعی تاریخ ایک نکتہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہے عہد رسولؐ۔ ہمیں اپنی اصل حیثیت کو پہچاننا ہو گا کہ ہم کوئی اور نہیں بلکہ وارثین نبوت ہیں۔ ہمارے لئے تو صرف اور صرف ایک ہی کام تجویز کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اپنے محبوب رسول کے نائب کی حیثیت سے اس کے پیغام کو اس عہد میں برتنے اور اسے دنیا

کے دوسرے ادیان پر غالب کرنے کی کوشش کریں۔ ہم سے پہلے جن لوگوں نے اس دین مبین کی خدمت کی اس کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ الآیة"...... (البقرۃ:۱۳۴) علمائے دیوبند ہوں یا مشائخ بریلی یہ بھی ہماری ہی طرح خادمین اسلام تھے 'ھم رجال ونحن رجال'۔ ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم نائبین رسول کار نبوت چھوڑ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کی برتری اور عظمت ثابت کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

کیا اسلامائیزیشن کے راستے غلبۂ اسلام کا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے؟

سوال: احیائے اسلام کے سلسلے میں جہاں مختلف سیاسی اور انقلابی تحریکیں دنیا بھر میں چل رہی ہیں وہیں علمی دنیا میں علوم کے اسلامیانے اور اسلامک اکانومکس، اسلامک بینکنگ جیسی اصطلاحوں کا غلغلہ بلند ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آج جو قوم علمی دنیا میں اپنا سکہ جمالے گی اسے ہی دنیا کی قیادت مل جائے گی۔ مسلم دنیا میں اس قسم کی علمی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلی صرف عوامی نوعیت کی سیاسی تحریکوں کے ذریعہ آئے گی یا اسلامائیزیشن کے ذریعہ بھی یہ معرکہ سر کیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ اب اسلامک بینکنگ ایک معروف اور مقبول خیال ہے۔ دنیا بھر میں اس کے کامیاب تجربے ہو چکے ہیں۔ حتی کہ بعض سودی بینکوں نے بھی اسلامک ونڈو (Islamic Window) قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ اس طرح اسلامی نظام آہستہ آہستہ خاموشی سے اپنی جگہ بنا رہا ہے پھر آپ کے یہاں سیاسی نوعیت کی تبدیلی پر اتنا زور کیوں ہے؟

جواب: فی زمانہ علوم کے اسلامیانے اور مختلف موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھنے لکھانے، غور و فکر کرنے کا جو سلسلہ جاری ہے وہ یقیناً افادیت سے خالی نہیں۔ یہ بات فی نفسہ قابل قدر ہے کہ کچھ لوگ موجودہ سودی نظام سے بے زار ہو کر اسلامک بینکنگ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں یا کچھ لوگوں میں اسلام کی طرف واپسی کا خیال انہیں مغرب کے علمی سرمائے کو سمجھنے اور اس کے اسلامیانے کی طرف لے گیا ہے۔ یا کچھ لوگ موجودہ دنیا میں اسلامی نظام کو قابل عمل باور کرانے کے لئے اسلام کے نظام معیشت یا امور سیاست پر مستقل کتابیں تصنیف کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہے کہ ان

سرگرمیوں کے نتیجے میں قوت اسلامی کا دوبارہ احیاء ہوسکتا ہے یا کوئی شخص اگر یہ سمجھتا ہے کہ عالمی نظامِ عدل کے قیام کا راستہ اس قسم کی بے ضرر تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہموار ہوسکتا ہے تو وہ یقیناً رسول اکرمؐ کے منہج انقلاب سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے۔ اسلام صرف ایک انقلابی پیغام نہیں بلکہ ایک طریقۂ کار بھی ہے۔ رسول اکرمؐ نے امت کو صرف ایک پیغام نہیں دیا بلکہ ایک مؤثر عملی اسٹریٹجی بھی عطا کی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے معاشرے کو دوبارہ اپنی نگاہوں کے سامنے ابھرتا دیکھے اور عالمی نظام خلافت کی بشارت میں خود اس کا اپنا عملی حصہ بھی ہو تو اسے چاہئے کہ اس نظام کے قیام کے لئے رسول اکرمؐ کے منہج انقلاب کو بکمال برتنے کی کوشش کرے۔

مسلم دنیا میں اس وقت بہت سی تحریکیں ایسی ہیں جو یقیناً نظامِ اسلامی کی آرزو ضرور رکھتی ہیں لیکن اصل منہج سے دور ہوجانے کی وجہ سے ان کی ساری توانائی کار لایعنی میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ علوم کے اسلامیانے کی مہم یا اسلامک بینکنگ جیسے داعیات بھی اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ دراصل پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں مسلم دنیا میں ایک نئی صبح کے طلوع کی جو زبردست امید پیدا ہوگئی تھی اس نے بعض ایسی تحریکوں کو جنم دیا جو انتہائی عجلت سے معاشرے کے موجودہ غیر اسلامی ڈھانچے کو منہدم کئے بغیر اس کے اندر بعض جزوی اصلاح کے ذریعہ فوری طور پر مسلمانوں کا کوئی مضبوط بلاک بنالینا چاہتی تھیں۔ لہٰذا یہ مان کر کہ اب خلافت کے ادارے کا ازسرِنو احیاء ایک ناممکن العمل خیال ہے، موجودہ قومی ریاستوں کے ڈھانچے کے اندر ہی قوت اسلامی کا نیا میزانیہ تشکیل دینے کی کوشش کی گئی۔ تنظیم اسلامی کانفرنس کی تاسیس اور اس کے ذیلی اداروں میں اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کے قیام کے پیچھے دراصل یہی محرک کارفرما تھا کہ کسی طرح مسلمان بھی عالمی منظر نامے پر اپنی کوئی شناخت قائم کرسکیں۔ ہمارے خیال میں ربع صدی گذرنے کے باوجود اسلامی بلاک کی تشکیل اب بھی ایک موہوم خواب ہے اور اسلامی بینک اب بھی عالمی یہودی نظام معیشت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ امت اسلامی کی نظری قوت ختم ہوچکی ہے یا اسلام کے معاشی نظام میں برگ و بار لانے کی اب صلاحیت باقی نہیں رہی بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اسلامی اداروں کو مناسب سیاسی سرپرستی نہ ملے اور جب تک ایک بھرپور اسلامی نظام اس کی پشت پر کھڑا نہ ہو اسلامی اداروں کی صحیح کارکردگی سامنے نہیں آسکتی۔ نظام کفر کے استحصالی

معاشرے میں اور سود کی عالمی معیشت کے چنگل میں اگر آپ ایک تقویٰ پرور معاشی نظام عدل قائم کرنا چاہیں تو یہ ہرگز ممکن نہ ہو سکے گا۔ جب تک کسی مشین کا ایک حصہ دوسرے ماڈل کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو وہ اس کی کارکردگی میں مثبت رول ادا نہیں کرسکتا۔ اسلامک بینکنگ کے سارے تجربوں کی مثال کچھ ایسی ہی ہے کہ جیسے مرسڈیز کاروں میں جیٹ ہوائی جہاز کا انجن فٹ کر دیا جائے۔ اب آیئے ہم اس مسئلے کا کسی قدر تفصیلی بیان کرتے ہیں۔

علوم کے اسلامیانے سے کیا مراد ہے؟ غالب قومیں یا نظری اعتبار سے ترقی یافتہ قومیں بالعموم دوسری قوموں کے علمی سرمائے سے کچھ اس انداز سے استفادہ کرتی ہیں کہ اولاً ان کی ترقی کو ان علوم سے مہمیز ملے، ثانیاً یہ علوم ان کی نظری چھلنی میں کچھ اس طرح فلٹر ہو جاتے ہیں کہ غیر قوموں کی تہذیبی کثافت ان کے اپنے تہذیبی اور علمی سرچشمے کو گدلا نہیں کرتی۔ ثالثاً اس عمل میں بہر حال خطرات تو موجود ہوتے ہیں کہ علوم کی حیثیت تہذیبی سرمائے کی بھی ہے اور تہذیبی عناصر کو پوری طرح فلٹر کیا جانا بالعموم ممکن نہیں ہوتا۔ عہد عباسی میں یونانی علوم کے استفادے نے مسلم دنیا کو جس ذہنی انتشار سے دوچار کیا یہ واقعہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔ علوم کی طرف اسلام کا رویہ انتہائی مثبت اور ہمدردانہ ہے علم کی روشنی جہاں سے بھی آئے اس کا استقبال کیا جائے لیکن یہ بات نگاہوں میں ہمیشہ مستحضر رہے کہ حصول علم کوئی بے ضرر علمی مشغلہ نہیں ہے بلکہ اسے نظامِ عدل کی خدمت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی افادیت اسی بنیاد پر طے ہوتی ہے کہ وہ اسلامی نظامِ عدل کو سہارا دینے اور اس کی توسیع و اشاعت میں کس حد تک ممد و معاون ہے۔ اس کے برعکس اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ محض ذہنی ورزش کے طور پر لوگ علوم و فلسفہ کی مجلس جمائیں یا اسلام کو ہی فن کی حیثیت سے پڑھا اور پڑھایا جائے بلکہ اس کے نزدیک اسلامک اسٹڈیز کا موجودہ تصور جس میں اسلام کا مطالعہ ایک مرحوم مذہبی تہذیب کی حیثیت سے کیا جاتا ہے ناقابل قبول ہے۔ کہ اسلام رہتی دنیا تک کے لئے ایک ابدی منشور ہے اور اسے اسی حیثیت سے برتے جانے پر اصرار ہے۔

علوم کے اسلامیانے کا خیال اس حد تک تو ایک صحت مند رویہ ہے کہ مغرب کے علمی سرمائے میں جو باتیں اسلامی عقائد سے براہ راست ٹکراتی ہیں ان کے بارے میں مسلم طلباء اور نوجوانوں کو متنبہ کیا

جائے اور علمی نقطۂ نظر سے ان خیالات کا بھرپور ابطال کیا جائے۔ البتہ یہ سمجھنا کہ مستقبل کے اسلامی معاشرے یا اسلامی حکومت کے لئے مختلف میدانوں میں ماہر رجال کار تیار کرنے کا کام اس طرح کی علمی تحریکیں انجام دے سکتی ہیں تو ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ پھر یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ نئے دل و دماغ کی تیاری کے لئے اسلامائزیشن کے مبلغین جو نصاب وضع کرنا چاہتے ہیں اسے برتنے کے لئے کون سی سرزمین استعمال کی جائے گی۔ اس لئے کہ موجودہ مسلم دنیا بڑی حد تک مغرب کے سیاسی شکنجے میں کسی ہوئی ہے۔ وہاں کسی ایسے نصاب کو داخلہ نہیں مل سکتا جس سے واقعی انقلابی دل و دماغ پیدا ہونے کا ادنی سا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ علوم کے اسلامیانے کی مہم یا اسلامی معیشت و اسلامی بینکنگ کی جملہ سرگرمیاں مسلم دنیا کی گوناگوں سیاسی مصلحتوں کی تابع مہمل ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان حضرات نے مختلف عنوانات پر کتابوں کا انبار تو ضرور تیار کر دیا ہے جن کے عناوین میں اسلام لاحقے یا سابقے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ہزاروں صفحات پر مشتمل اس لٹریچر میں ایک پیراگراف بھی ایسا نہیں ملتا جس سے اسلام کی غیر مصالحتی دعوت انقلاب کا اظہار ہوتا ہو یا جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ ان حاملین قرآن کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں جس کی ایک ایک آیت نظامِ کہن کو اکھاڑ پھینکنے اور نئی صبح کے قیام کی دعوت دیتی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ان سرگرمیوں کو فی نفسہ کار لایعنی قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ ہمارے بعض ذہین افراد کے اس قسم کی مہم میں جذب ہو جانے سے یہ نقصان ہوا ہے کہ امت کے بعض مخلص اور ذہین افراد جن سے نظام کفر کی جڑوں پر براہ راست تیشہ لگانے کی امید تھی وہ کام سے لگ گئے۔ دوسری طرف انہیں یہ غلط فہمی بھی رہی کہ وہ آرام دہ خدمت گاہوں میں دراصل اسلامی نظام کے قیام کے لئے کام کر رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے لئے کام کرنے والی تحریکیں منہج رسول کی روشنی میں اپنی قدر و قیمت اور افادیت متعین کریں۔

رہی یہ خوش فہمی کہ اب اسلامک بینکنگ نے گویا میدان مار لیا ہے اور یہ کہ بعض مسلم ممالک اور یورپ کے بعض مسلم آبادی والے شہروں میں سودی بینک بھی اب اسلامک ونڈوز قائم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو ہمارے خیال میں مسئلہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے۔ اسلامی بینکنگ کے نام سے دنیا میں جہاں کہیں بھی جو کچھ تجربہ ہوا ہے اس کی کامیابی کا سہرا دراصل ان طریقۂ کار کو اپنانے میں ہے جو اسی انداز

سے سودی بینکوں میں بھی رائج اور منافع بخش ہے۔ شرکت اور مضاربت جو اسلامی معیشت یا بینکنگ کا طرۂ امتیاز ہے اسے ابھی تک ان بینکوں میں بہت کم برتا گیا ہے۔ مروجہ اسلامی بینکوں کا اسّی فیصد انحصار مرابحہ، بیع سلم، پٹے داری اور سروس چارج جیسی چیزوں پر ہے۔ جو بالکل اسی انداز سے سودی بینکوں میں بھی رائج ہے۔ دیکھا جائے تو آمدنی کے یہ ذرائع دراصل اسلامی نقطہ نظر سے اسلامی بینکنگ کے حاشیہ (periphery) پر ہونی چاہئے تھی جبکہ عملاً اسے مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ فقہاء نے بعض مخصوص حالات میں لین دین کے بعض طریقوں کے لئے جو گنجائش نکالی تھی اسے موجودہ اسلامی بینکنگ میں عام اصول کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ہی چیز اسلامی اور غیر اسلامی بینکوں میں لب ولہجہ اور طریقۂ کار کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ رائج ہو تو ایک کو غیر اسلامی اور دوسرے کو اسلامی کیوں کر کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر یوروپ میں رہائشی مکان خریدنے کے لئے mortgage کا سلسلہ سکہ رائج الوقت ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ بینک آپ کے لئے اس شرط پر مکان خرید دیتا ہے کہ آپ اصل قیمت سے زیادہ مقررہ اور طے شدہ منافع یا سود کے ساتھ اسے اپنی تنخواہ سے قسط وار مکان کی قیمت ادا کرتے رہیں۔ اس طرح ایک لاکھ پونڈ کا مکان بینک کے توسط سے ہوسکتا ہے آپ ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ میں خرید پائیں۔ اب جو لوگ اس طریقۂ کار میں سودی نظام سے نجات کا امکان پاتے ہوں تو وہ دراصل دانستہ طور پر حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ سود سے نجات کے اس طریقہ کار کی بنیاد قرآنی تصور حیات کے بجائے فقہاء کے حیل شرعی میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بیع مؤجل جو اسلامی بینکوں میں ایک معروف طریقۂ کار ہے اور جس کے جواز میں بعض فقہاء کی رائے کو کافی سمجھا گیا ہے۔ دراصل نوعیت کے اعتبار سے سودی قرضوں کا ہی ایک متبادل ہے بجائے اس کے کہ قدیم فقہاء کی بعض آراء پر نظر ثانی کی جاتی اسے موجودہ صورت حال میں بیع مؤجل کے۔ جواز کے لئے کافی سمجھا گیا۔ جب یہ مسئلہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے آیا تو کونسل نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ اس طریقۂ کار کو احتیاط سے استعمال کیا جائے ورنہ پچھلے دروازوں سے سود کے در آنے کا اندیشہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی بینکنگ کے کامیاب تجربوں کا انحصار دراصل اسی تلخ حقیقت پر ہے کہ وہاں سود کی آمیزش صدر دروازوں سے نہیں بلکہ پچھلے دروازے سے ہوتی ہے۔

اسلامک بینکنگ کے پرزور وکیل بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اسلامی بینکوں کے قیام سے وہ موجودہ عہد میں اسلامی نظام معیشت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ معاشی عدل، غربت کا خاتمہ، دولت کی منصفانہ تقسیم اور معیشت کے دوسرے اعلیٰ اسلامی مقاصد اسلامی بینکوں کے منشور کا سرے سے حصہ نہیں ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ ان بینکوں کے قیام سے ہم کسی نئے معاشی نظام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز بات ہے کہ عین سودی بینکوں کے اندر اسلامی کھڑکیاں کھل گئی ہیں جو متقیوں کے لئے سود سے پاک صاف معیشت کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بات خوش ہونے کی نہیں بلکہ افسوس کا مقام ہے کہ اسلامی نظام معیشت کی اب حیثیت یہ ہے کہ وہ نظام کفر کی معیشت کی ایک مختصر سی کھڑکی میں سماجاتا ہے اور فٹ بیٹھتا ہے۔ اہل ایمان کے لئے اس میں اطمینان کا نہیں بلکہ اضطراب کا سامان ہے۔

بین المذاہب مکالمے

سوال: یہاں برطانیہ میں مسلم عیسائی مفاہمت کے حوالے سے گاہے بہ گاہے کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں بعض دینی حلقے اس طرح کی سرگرمیوں میں خاصا پرجوش رول ادا کر رہے ہیں۔ گذشتہ سال ایک مؤقر اسلامی ادارے کے سربراہ کو ملکۂ برطانیہ کے ہاتھوں اس سلسلے کی بہترین خدمات کے لئے تمغۂ افتخار (MBE) بھی عطا کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد عام مسلمانوں کے ذہن میں اس سوال نے اہمیت اختیار کرلی ہے کہ کیا عیسائی مسلم مکالمے یا بین المذاہب قسم کے فورم کی تشکیل دینی نقطہ نظر سے جائز ہے۔ براہِ کرم اس بارے میں ہمیں اپنی رائے سے نوازیں۔

جواب: اہل کتاب سے مکالمہ یا گفت وشنید کی اجازت قرآن نے صریح الفاظ میں دی ہے "قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا" (آل عمران: ۶۴) ان قرآنی بنیادوں پر اہل کتاب سے گفت وشنید کا دروازہ تا قیامت کھلا رہے گا۔ البتہ اس آیت سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن ان تین مذاہب کا کوئی متحدہ محاذ بنانا چاہتا ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں وہ اہل کتاب کو اپنی دعوت کا خصوصی مستحق سمجھتا

ہے اور نسبتاً کہیں زیادہ توقع رکھتا ہے کہ وہ پیغام الٰہی کو قبول کرنے میں دوسروں پر سبقت لے جائیں گے۔ ایسا اس لئے کہ وہ اسی دین براہیمی کی اتباع کے دعویدار ہیں اور اپنے مذہبی ورثے کی بنیاد پر ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کا سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ البتہ جو لوگ اس دعوتِ حق کے نتیجے میں اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتے، آباء پرستی انھیں دین مبین میں داخلے سے روکے دیتی ہے، ان کا معاملہ منکرین حق سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ایک شرعی موقف ہے جو اس قرآنی آیت کی روشنی میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اہل کتاب کے تعاون سے الحاد و مادیت کے خلاف کوئی مشترکہ محاذ تشکیل دیا جائے تو ایسی کوئی ہدایت نہ تو قرآن میں موجود ہے اور نہ ہی رسول اکرم کے اسوۂ حسنہ سے کسی ایسے عمل کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو یہ غلطی فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ عیسائی مسلم مشترکہ فورم کے انعقاد یا ان کے درمیان تعلقات کی بہتری کی کوشش سے وہ کوئی دینی فریضہ انجام دے رہا ہے۔ ہمیں جو ہدایت ملی ہے وہ یہ کہ "اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" (النحل:۱۲۵) البتہ موعظت حسنہ سے یہ ہرگز مراد نہیں لیا جاسکتا کہ ہم دین حق کے قیام کے سلسلے میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں، خواہ وہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں، سے کسی بھی قسم کا کوئی compromise کر سکتے ہیں۔ نہ ہی کسی کو افہام و تفہیم، گفت و شنید اور مروجہ قسم کے کرسچین مسلم ڈائیلاگ سے یہ خوش فہمی ہونی چاہئے کہ وہ اس عمل سے نظام عدل کے قیام کا معرکہ سر کرلے گا اور نہ ہی ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونا چاہئے کہ ہم بہ حیثیت مسلمان کبھی بھی اہل کتاب یا اہل کفر کی نظروں میں مقبول و محبوب ہوسکتے ہیں کہ اس بارے میں قرآن کا بیان بہت واضح ہے "وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" (البقرہ:۱۲۰)

اب آیئے مروجہ عیسائی مسلم مفاہمت یا مکالمے کا جائزہ لیا جائے۔ تاریخی اعتبار سے بین المذہبی مکالمے Interfaith dialogue خالصتاً بیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ان کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب خلافت عثمانیہ کا شیرازہ پوری طرح منتشر ہوگیا، صلیبی استعمار نے مسلم دنیا کو ٹکڑوں میں بانٹ ڈالا، انتہائی گہری مایوسی عالم اسلام پر چھاگئی تب فاتح مغرب نے نئے قالب میں مسلم دانشوروں سے اپنی راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔ یہ باور کرایا گیا کہ اب صلیبی جنگوں یا مسلح جدو جہد کا زمانہ ختم ہوا۔ اب

ضرورت اس بات کی ہے کہ عیسائیت، یہودیت اور اسلام کے ماننے والے آپس میں مشترکہ امور دریافت کریں تاکہ مستقبل میں ایک پرامن دنیا کی تعمیر ممکن ہو سکے۔ یہ بات خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے کہ عیسائی مسلم مفاہمت کے سلسلے میں پہلی باضابطہ تصنیف A Guide to Dialogue between Muslims & Christians ۱۹۶۹ میں پاپائے روم کی طرف سے شائع کی گئی تھی گویا روز اول سے اس مکالمے کا ہدف ایک عیسائی ایجنڈا رہا ہے۔ ابتداء میں مسلمانوں نے اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہ کی۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کی شمولیت سے اس عمل کو اعتبار ملتا گیا۔ بالخصوص ستر اور اسّی کی دہائی میں بلجیئم اور اسپین میں چند بڑی کانفرنسوں کے انعقاد اور اس میں مسلم دانشوروں کی شرکت نے اس عمل کو مذہبی اعتبار فراہم کر دیا۔ یہاں تک کہ تیونس، عمان اور سوڈان میں بھی اس طرح کی کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ اس قبیل کا ایک بڑا اجتماع پارلیامنٹ آف ورلڈر یلیجنس کے نام سے صدی تقریب کے طور پر شکاگو میں منعقد کیا گیا۔ جس میں بعض نیم داعی قسم کے مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ شرکت کی بلکہ اس فورم کے سرگرم رکن کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس طرح اب تک جو توانائی صرف دین مبین کی اشاعت کے لئے وقف تھی وہ مختلف مذاہب کے مابین مشترکہ بنیادوں کی تلاش میں صرف ہونے لگی۔

ہمارے خیال میں بین المذہبی مکالمے کا جواز ان فورمس پر اپنی معقول، مدلل، واضح اور uncompromising انداز سے رکھنے کی حد تک ہے اور بس۔ اگر ان فورمس پر مسلمان اسلام کے سفیر کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنے کا دل گردہ رکھتا ہے تو یقیناً ہمیں ایسے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ رہی اہل کتاب کے ساتھ مکالمے کی بات تو ہم انہیں آج بھی اپنی دعوت کا خصوصی مستحق سمجھتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ قبول حق میں دوسروں سے سبقت لے جائیں گے البتہ مروجہ بین المذاہب فورمس پر ہمارے داعیوں کا جو حشر ہوا ہے، اس کے پیش نظر ہم مسلمانوں کو اس سلسلے میں محتاط ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱- ڈائیلاگ اپنے معروف معنوں میں ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں دونوں فریق یہ مان کر چلتے ہیں کہ ان کا مقصد مقابل فریق کو تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ کرنا نہیں بلکہ محض دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کی بہتر فضا پیدا کرنا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دعوت کو ڈائیلاگ کی سطح تک محدود

نہیں کیا جاسکتا۔

۲- مذاہب کی کانفرنسوں میں جھوٹے سچے مذاہب کے ساتھ اسلام کو برابر کی سطح پر رکھنا اور بہت سے مذاہب کی طرح اسے بھی ایک مذہب قرار دینا ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

۳- جن آسمانی مذاہب کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے یا جن لوگوں کو اہل کتاب قرار دیا ہے۔ ان کا بھی معاملہ یہ ہے کہ وہ مذاہب سابقہ کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں اب ہدایت کے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم معزول مذاہب کے حاملین تک اپنی دعوت پہنچانے پر مامور تو ضرور ہیں البتہ ان کے ساتھ نظری اور فکری طور پر برابری کا کوئی معاملہ نہیں کرسکتے۔ ایسا کرنا اسلام کی حتمی حیثیت پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

۴- جو لوگ مغرب کی دانش گاہوں میں عیسائی مسلم مفاہمت کے نام پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں وہ علی الاعلان مسلمانوں میں بنیاد پرست اور جہادی عناصر کے خلاف سخت موقف رکھتے ہیں۔ وہ اگر افہام و تفہیم کے طلب گار ہیں تو صرف ان سے جو مغرب کی موجودہ حیثیت کو ایک اٹل حقیقت مان کر اس میں تبدیلی کا خواہش مند نہ ہو۔ ایسے ٹھنڈے اور شیریں مسلمانوں سے انہیں افہام و تفہیم کی توقع ہے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ ٹھنڈے میٹھے مسلمان اپنے آپ کو بنیاد پرست عناصر سے علیحدہ رکھیں اور ان کی مخالفت اور مذمت میں ان کے زبان وقلم چلتے رہیں۔

۵- موجودہ عالمی صورت حال جہاں صلیبی قوتوں کو Capitalism اور Secularism کے بھیس میں کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے، ایک ایسی صورت حال میں قیام امن کی ہر بات اور افہام و تفہیم کا ہر نعرہ گویا اس امر کا اعلان ہے کہ ہم اس صورت حال سے مطمئن ہیں اور اسے باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ اسی صورت حال میں افہام و تفہیم کے ذریعہ نسبتاً بہتر ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایجنڈا فاتح قوموں کا تو ہو سکتا ہے کسی مضطرب اہل ایمان کا نہیں۔

اب اگر کوئی شخص خدمت افہام و تفہیم کے نتیجے میں ملکہ برطانیہ سے تمغۂ امتیاز پاتا ہے تو اسے یہ سوچنا چاہئے کہ یقیناً اس نے کوئی ایسا کام انجام دیا ہے جس سے مخالف کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ورنہ آخر کیا بات ہے کہ قرآن تو علی الاعلان یہ کہتا ہو کہ تم سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہیں ہوسکتے جب

تک تم ان کی اتباع اختیار نہ کرو۔ اور آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ ہر تمغۂ امتیاز جو ملکہ برطانیہ اپنے ہاتھوں سے ہمارے سینے پر سجارہی ہے وہ دراصل ہماری خدمت اسلامی کا اعتراف ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ یہ دلیل لائیں کہ ہم نے خواہ مخواہ برطانیہ کو عیسائیت کا نمائندہ قرار دیا ہوا ہے۔ کہ عیسائیت تو اب مغرب سے رخصت ہو چکی ہے۔ وہاں اب صرف دین سرمایہ داری اور سیکولرزم کا غلبہ ہے۔ اس لئے اس آیت کا اطلاق اس صورت حال پر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ دلیل صحیح مان لی جائے کہ کرسچن مسلم مفاہمت کے عیسائی شارکین مذہبی اعتبار سے اب عیسائی نہیں بلکہ سیکولرزم کے علمبردار ہیں تو پھر مکالمے کی وہ بنیاد از خود منہدم ہو جاتی ہے۔

لبرل چاکلیٹ مسلمان یا راسخ العقیدہ مجاہدین
اسلام کو کیا مطلوب ہے؟

سوال: یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ اسلام مذہب اعتدال ہے ہم نوجوانوں کو بعض جماعتوں کے بزرگ اکثر یہ کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ انتہا پسندی سے دامن بچانا اور جذباتیت سے دور رہنا ہی دراصل صحیح اسلامی تعلیم ہے اس لئے کسی قومی ملی مسئلے پر قدم اٹھاتے وقت اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہئے۔ اگر یہ صحیح اسلامی موقف ہے تو پھر اسلام کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا وقت کب آئے گا؟

جواب: اس سوال میں کئی سوالات باہم خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اس تصور اعتدال کا عام طور پر غلط مفہوم لے لیا گیا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص بیچ کی راہ چلنے سے یہ مفہوم مراد لے کہ اسے لازماً راستے کے بیچ میں ہی چلنا چاہئے کہ یہی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ بعض اوقات الفاظ پر جم جانے یا مخصوص مفاہیم کو غلط سیاق و سباق میں استعمال کرنے سے بھی بڑی گمراہیاں جنم لیتی ہیں۔ مفروضہ اسلامی راہ اعتدال بھی انہی تصورات میں سے ایک ہے جس نے فی زمانہ بہت سے اہل فکر کی راہ گم کر دی ہے۔

قرآن میں امت مسلمہ کو "امت وسط" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے جس سے معتدل امت کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ قرآنی لفظیات کی معمولی شد بد بھی رکھتے ہیں وہ آیات کے سیاق و سباق سے بآسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "امت وسط" دراصل معتدل کے معنوں میں نہیں بلکہ امت عدل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ایسی امت جس کا کام دنیا میں نظام عدل کا قیام ہے، جو نیابت رسولؐ کے منصب پر فائز ہو کر لوگوں کے درمیان فریضۂ رسالت انجام دے رہی ہے۔ دوسری جگہوں پر اس امت سے یہ مطالبہ بھی ہے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے "لاتَظْلِمُوْنَ وَ لَاتُظْلَمُوْنَ" (البقرہ:۲۷۹) اور اسی امتِ عدل سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدود کے نفاذ میں اسے نہ تو سزاؤں کے کم کرنے کا اختیار ہے اور نہ ہی اس پر کسی قسم کے اضافے کا، کہ اس کا کام تو ان حدود کو پورا کا پورا نافذ کر دینا ہے۔ یہی ہے وہ امتِ عدل جو اپنے ہاتھوں میں اقتدار آنے کے بعد اللہ کے عطا کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔

جو آیت دراصل اس بات کے لئے نازل ہوئی ہے کہ وہ مؤمنین کو فریضۂ قیام عدل کی یاددہانی کرائے، بدقسمتی سے اسی آیت سے ایک ایسی امت کا تصور برآمد کر لیا گیا ہے جو کفر کے مقابلے میں نرم رویہ رکھتی ہو اور کفر کے خلاف کسی بھی قسم کے اقدام کو انتہا پسندی تصور کرتی ہو گویا نظام کفر کے لئے نوالہ تر اور کمزور تر موقف رکھنے والے بیٹھے بیٹھے، لبرل اور بے ضرر قسم کے مسلمانوں میں امت وسط کی صفت ڈھونڈ نکالی گئی۔ پھر یہ مطالبہ عام ہوا کہ درمیانہ روی اختیار کی جائے، خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو کے نعرے اصل اسلامی موقف کا اظہار بن گئے اور اسے ہی دین کی معتبر تشریح کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس تصور کو قبولیت عامہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو لوگ نظام کفر سے اعراض کئے بغیر اعتدال کی راہ پر گامزن تھے ان کی ذاتی زندگی میں نماز روزے کے مظاہر اور اَوراد و وظائف کے شغل بکثرت نظر آتے تھے۔ اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگیاں نظام کفر کو چیلنج کئے بغیر بلکہ بسا اوقات عین نظام کفر کی سرپرستی میں خالصتاً اسلامی انداز سے گذر رہی ہیں۔

مسلمانوں میں مروجہ اس مقبول عام میانہ روی کا جائزہ اگر کتاب و سنت کی روشنی میں لیا جائے تو اس کی صحیح حقیقت ہمارے سامنے آسکتی ہے اولاً: قرآن جس راہ اعتدال کی بات کرتا ہے وہ دراصل

مسلمانوں کو معاشی مسئلے میں افراط و تفریط سے بچانے کی دعوت ہے "وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قِوَاماً" (فرقان:٦٧) مال اللہ کی امانت ہے اسے نہ تو اللّے تللّے خرچ کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اس طرح جمع کرنے کی کہ اس کے فوائد سے معاشرہ محروم رہ جائے۔ بلکہ ان دوانتہاؤں کے درمیان ایک راہ اعتدال کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ رہی پیغام رسالت کے انجام دینے کی بات تو اس بارے میں کسی بھی قسم کی مداہنت سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اپنے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے "فمابلغت رسالته......" رسول کو نہ اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اس پیغام میں تبدیلی کرے اور نہ ہی یہ اختیار کہ وہ اس پیغام کو کسی کی خاطر tone down کر سکے۔ ابتداء میں ہم نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ ......الآية" (البقرہ:١٤٣) گو کہ یہ صیغۂ اخبار میں وارد ہوئی ہے۔ البتہ یہ امت مسلمہ پر ڈالی جانے والی عظیم ذمہ داری کی وضاحت کرتی ہے، جس کی انجام دہی کے بغیر امت اپنے فریضہ منصبی پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ پیامِ ربانی کے سلسلے میں مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ بلا کسی کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچائیں یہاں تک کہ اظہار حق کی صورت حال پیدا ہو جائے۔ اس کی پروا کئے بغیر کہ یہ بات کفار و مشرکین کو کتنی ناگوار گذر رہی ہے: "وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ"۔ خواہ ایسا کرنے سے ہمارے اوپر بنیاد پرستی کا الزام لگتا ہو یا ہمیں انتہا پسند گردانا جاتا ہو۔

ہم آج جس میانہ روی کو اپنی بزدلی اور کاہلی کے سبب عین اسلام سمجھ بیٹھے ہیں اس کا اس اسلام سے کوئی تعلق نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اور جس پر عمل کر کے انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں شہادت حق کا ثبوت دیا ہے ذرا غور کیجئے حضرت ابراہیم کو بت شکنی پر کس چیز نے آمادہ کیا تھا قرآن میں ابراہیم کی بت شکنی کا واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیم نے اپنے سوال و جواب سے بت پرستوں کو مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر سوال ان کے مسلمہ عقائد پر ضرب لگاتا اور ان کے موقف کی کمزوری کا اعلان کرتا یہاں تک کہ مشرکین اس مکالمے سے جھنجھلا اٹھے۔ دیکھا جائے تو حضرت ابراہیم نے بیٹھے بٹھائے نظام کفر کو مبارزت کی دعوت دی تھی۔ آج کے عقلمند مسلمانوں کی اصطلاح میں اگر کہا جائے تو یہ بعینہ وہی صورت حال تھی جسے ہم کہتے ہیں

آبیل مجھے مار۔ اگر ان کے اندر ذرا بھی اعتدال اور میانہ روی ہوتی تو وہ اس چھیڑ چھاڑ اور انتہا پسندی سے اپنا دامن بچاتے۔ خود ساختہ معبودوں کو ان کے پرستاروں کے رحم و کرم پر چھوڑتے اور خود اپنے لئے توحید کا راستہ الگ کر لیتے۔ لیکن آپ نے قصداً جان بوجھ کر ان بتوں کی تباہی کا بیڑا اٹھایا تاکہ اہل دنیا پر یہ واضح کر سکیں کہ ان کا موقف کتنا کمزور ہے اور یہ کہ ان کی دعوتِ توحید اس مذہبِ آذری کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آج کے عاقل اور معتدل مسلمان اس وقت موجود ہوتے تو انہوں نے حضرت ابراہیم کی شدت پسندی اور انتہا پسندی پر ضرور واویلا مچایا ہوتا۔ اور ان کا رویہ شاید یہ ہوتا کہ ان بتوں کو بھی برقرار رہنے دیں اور ہم اپنے طریقے سے اپنے معبود کی عبادت جاری رکھیں۔ یعنی شرک و توحید کا پرامن بقائے باہم۔ اسی سنتِ ابراہیمی کو محمد ﷺ نے اس وقت زندہ کیا جب فتح مکہ کے موقع پر سب سے پہلا کام کعبے کے بتوں کا انہدام قرار پایا۔ وہاں نہ تو کسی نے اسے آثار قدیمہ کی حیثیت سے محفوظ کرنا ضروری سمجھا اور نہ ہی اس عمل پر شدت پسندی، جذباتیت یا انتہا پسندی کا لیبل لگانے کی کسی کو جرأت ہوئی۔ آج اگر ہم میں بعض لوگ اسی قسم کے عمل کو انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کس عمل کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اور ایسا کرنے کے بعد وہ حزب ابراہیمی اور حزب محمدی سے نکل کر کہاں جا پہنچے ہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معتدل مسلمان نظام کفر کے اندر رفتہ رفتہ ایسی سہولتیں حاصل کر سکتے ہیں جو ٹکراؤ کے نتیجے میں انہیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس طرز فکر کے حاملین یہ سمجھتے ہیں کہ نظامِ کفر کے خلاف علی الاعلان تبرّا کہنے کے بجائے اس سے تعاون کرتے ہوئے اسلامی مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ لہذا نظام کفر اگر مسلمانوں کو اقتدار میں شرکت کی دعوت دیتا ہو یا بعض پارٹیاں مسلم ووٹوں کی قیمت پر مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا یقین دلاتی ہوں تو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کچھ حرج نہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے مغالطے کفر اور اسلام کی اصل ماہیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جو لوگ نظامِ کفر کی تباہی کے علمبردار ہوں اور جو ہر قیمت پر اسے اکھاڑ پھینکنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوں وہ اگر تاریخ کے کسی مرحلے میں اس مخالفت سے منہ موڑ کر نظامِ کفر کے حواریوں میں شامل ہو جائیں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ آنے والے دنوں میں وہ خود کو کسی فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار کر سکیں گے۔ اولاً: نظامِ کفر کی مخالفت سے دست بردار ہونا گویا آپ کا اصل ایجنڈے سے کنارہ کشی کے

مترادف ہوگا۔ ثانیاً: نظامِ کفر کے حلیف کی حیثیت سے آپ کا ہر عمل، آپ کی نظری اور روحانی زندگی کو ایک غیر محسوس، سست اور خاموش موت سے دوچار کر دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ مکے میں جب آپ ﷺ کو اقتدار میں شرکت کی دعوت پیش کی گئی تو آپ نے اسے قبول نہ کیا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ایک بار قریش کے عمائدین کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت آپ ﷺ حرمِ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ عمائدین قریش نے یہ پیش کش رکھی کہ تم اگر ہمارے خداؤں کو مان لو تو ہم بھی تمہارے خدا کو ماننے کے لئے تیار ہیں۔ طبری نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ پیش کش کی کہ اگر تم ایک سال ہمارے خداؤں کی پرستش کرو تو دوسرے سال ہم تمہارے خدا کی پرستش کریں گے۔ لیکن وقت کے رسولؐ کو نہ کسی ایسی مصالحتی تجویز قبول کرنے کی اجازت تھی اور نہ ہی ایک عقل و فہم والا شخص ایسا کر سکتا تھا کہ اللہ واحد کی بندگی کے دعویدار شرک میں مبتلا ہو کر اپنے علاحدہ وجود کا گویا خود ہی انکار کر دیتے۔ آج جو لوگ نظام کفر کی سیاسی پارٹیوں میں اس لئے شریک ہوتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کر سکیں وہ گویا اپنے وجود کی خود ہی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ نیا دور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں پتھر کے بت نہیں بناتا اور نہ ہی ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہمارے تراشے ہوئے لات و منات کے آگے سجدہ کرو۔ نئے دور کے بت وہ انسانی قوانین ہیں، وہ غیر الٰہی نظام زندگی ہے جس میں سیکولرزم اور جمہوریت کے بت کی تعظیم و تقدیس کا سلسلہ جاری ہے۔ اب اگر ہم نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ان بتوں کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں تو گویا ہم نے اپنے توحیدی اور اسلامی وجود کا خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیا۔ پھر اس کے بعد ہم یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارا تعلق "**ملة ابراهيم حنيفا**" سے ہے اور ہم آخری رسول ﷺ کی امانت کے حاملین میں سے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس مفروضہ 'راہ اعتدال' نے راہ ہدایت سے دور کر دیا ہے۔ ہم اولوالعزم پیغمبروں کی مثالوں سے نہیں بلکہ جاہ پرست اور ابن الوقت قسم کے بزدلوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شرک جس کی فطرت میں یہ بات موجود ہے کہ وہ ہر رطب و یابس کو اپنے اندر قبول کر لیتا ہے اور جسے پرامن بقائے باہم کا فن خوب خوب آتا ہے بدقسمتی سے وہی ہمارے لئے بھی اسوہ بن گیا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ عبادت کے سارے طریقے ایک ہی خدا کی طرف لے جاتے ہیں یا یہ کہ

سارے راستے ایک ہی منزل کو جاتے ہیں ان کے لئے ان تمام راستوں پر چل نکلنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہو سکتی، کہ جس کا راستہ کھویا گیا ہے وہ اگر مزید غلط راستے پر چل نکلے تو اس کا کچھ بھی نہ بگڑے گا۔ لیکن جو لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ آخری رسالت کے امین وہی ہیں اور یہ کہ صرف یہی راستہ برحق ہے تو ان کے لئے اصل موقف سے دست برداری کے بغیر دوسرے راستوں کا اختیار کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ آج جو لوگ امت میں میانہ روی کی دعوت دے رہے ہیں وہ دراصل ڈھکے چھپے ارتداد کی تبلیغ میں مشغول ہیں۔ جب اللہ کا رسول دعوت حق کو پیش کرنے میں کسی نرمی کو جائز نہیں سمجھتا اور جب لیڈران قریش سے مصالحت کی پیش کش وہ یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ "وَاللّٰہِ لَوْ وَضَعُوْا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيَ عَلٰىٓ اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الأَمْرَ مَاتَرَكْتُ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أو اَهْلِكُ فِيْهِ ...... الحديث" (ابن ہشام ج:۱ ص:۸۹م) تو ہمیں کیسے یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم نظامِ کفر کے تئیں اپنے آپ کو معتدل اور نرم رو بنا کر پیش کر سکیں۔ ہم تو یہ بھی نہیں کر سکتے کہ جب اللہ ہمیں اقتدار دے تو ہم اسے کسی انسانی شرائط کا تابع بنائیں۔ نظامِ کفر کو جوں کا توں برقرار رکھیں یا اس اقتدار میں غیر اسلامی قوتوں کو شریک کریں کہ اللہ کا فرمان ہے: "وَلَايُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهِ أحداً" (الکہف:۲۶)۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہئے کہ آج اگر ہمارے ہاتھوں نظام عدل قائم ہوتا ہے اور اگر اللہ ہمیں اس سرزمین میں اقتدار دیتا ہے تو ہم اس کی مطلوبہ شریعت کو جوں کا توں نافذ کریں گے۔ خواہ ایسا کرنے سے ہمارے اوپر انتہا پسندی، دقیانوسیت یا بنیاد پرستی کا لیبل کیوں نہ لگے، کہ ہمارا کام دراصل عدل کا قیام ہے' معتدل، بے ضرر اور میٹھے میٹھے مسلمانوں کی آبیاری کا نہیں جو نظام کفر کے لئے نوالہ تر ثابت ہوں۔

جب علماء و مشائخ کو خدا بنالیا جائے

سوال: میں آپ کی چیزیں دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں لیکن معاف کیجئے گا آپ کی تحریروں اور ملی پارلیامنٹ کے بعض غیر دانشمندانہ اقدام سے مجھے آپ کی طرف سے مایوسی ہوئی ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں آپ جس انداز سے اسلام کو برتنے کی دعوت دے رہے ہیں، وہ فی نفسہ شاید غلط نہ ہو لیکن ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ آپ نہ تو ملک کے حالات سے واقف ہیں اور نہ ہی مصالح امت کو سمجھتے ہیں۔ اگر کفار و مشرکین سے برأت اور موجودہ سیکولر ڈیموکریسی سے اجتناب عین مطالبہٴ اسلام ہے تو پھر آپ کے نقطہٴ نظر سے بڑے بڑے علمائے اسلام کی فہم پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ آپ نے اسلام کی کوئی خدمت کی ہو یا نہیں البتہ اتنا ضرور کیا ہے کہ جن باتوں پر مسلمانوں میں تقریباً اتحاد و اتفاق ہونے لگا تھا یا اتحاد کے ساتھ مسلمان اپنے ووٹ کو جس طرح استعمال کرنے کے لائق ہو گئے تھے اس میں آپ نے پھوٹ ڈال دیا اور عام مسلم ذہن میں مسلم علماء اور قائدین کے سیاسی موقف کے سلسلے میں زبردست شبہات پیدا ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ امت کے مجموعی مفاد کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ آخر جو لوگ اس وقت سیاسی اور مذہبی محاذ پر امت کی قیادت کر رہے ہیں کیا انہیں شریعت کا علم نہیں؟ یا وہ قرآن کے مطالبات سے واقف نہیں ہیں؟ صرف یہ بات کہہ دینا کہ قرآن میں یوں آیا ہے اور حدیث میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کافی نہیں۔ اس لئے کہ قرآن و حدیث کا اصل فہم علماء اور فقہاء کو ہی حاصل ہے اگر وہ ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی یا اجتماعی مسئلے میں کوئی رہنمائی دیتے ہیں تو وہ کتاب و سنت کے مطالبے سے الگ کیسے ہو سکتا ہے۔

جواب: یہ مسئلہ صرف آپ کے ساتھ نہیں بلکہ بہت سے حساس، دردمند اور اہل فکر مسلمان اس کشمکش کے شکار ہیں کہ وہ کسے سچا مانیں۔ قرآن و سنت کی ان نصوص کو جو انتہائی واضح اور روشن انداز سے ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں یا علماء کے ان فتاویٰ اور اپیلوں کو جن میں بالعموم قرآن و سنت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی جاتی بلکہ بھاری بھرکم القاب و آداب والے ناموں کو ہی سند کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے الیکشن کے موقع پر مسلم قائدین کے جس اتحاد کا ذکر کیا ہے اور جس کے بارے میں آپ یہ سمجھتے ہیں کہ متفقہ نوعیت کی سیاسی اپیلوں اور کفار و مشرکین میں سے ہی کسی خاص کافر یا مشرک کو بہ رضا و رغبت اقتدار سونپ کر مسلمان اس ملک میں سرخ رو ہو سکتے ہیں اور جس کے بارے میں آپ کو شکوہ ہے کہ ملی پارلیامنٹ کی بعض سرگرمیوں سے اس اتحاد میں رخنہ پڑا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں تو اس بارے میں خود ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ جو اتحاد و اتفاق آپ حضرات کو حاصل ہو گیا ہے اس میں میں بھی شامل ہو جاؤں۔ کاش کہ مجھے بھی آپ کی طرح شرح صدر

حاصل ہو جائے۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ میں مسلمان کی حیثیت سے صرف کتاب و سنت کی ہدایت کو ہی اس لائق سمجھتا ہوں کہ اس پر عمل کیا جائے خواہ یہ راستہ کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو۔ رہے علماء و فقہا کے فتاوے تو انہیں صرف اس وقت اعتبار مل سکتا ہے جب یہ نصوص قرآنی کی اتباع کرتے ہوں۔

قرآن کی مشہور آیت ہے جو یقیناً آپ کی نظر سے گذری ہوگی "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہ" (التوبۃ:۳۱) اس آیت میں سابقہ امتوں کی اس گمرہی کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ کس طرح الہی ہدایات کے مقابلے میں مذہبی پیشواؤں کو اپنا رب بنا لیتے ہیں اور زندگی کے مسائل میں یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کا مطالبہ کیا ہے، اس کی شریعت کیا کہتی ہے بلکہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہر بات کو بغیر کسی تحقیق و تجزیے کے آخری لفظ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قرآن اس رویے کی نہ صرف یہ کہ پرزور مذمت کرتا ہے بلکہ اسے امم سابقہ کے زوال اور گمرہی کی وجہ بھی قرار دیتا ہے۔ پچھلی امتوں بالخصوص یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی تاریخ میں یہ حادثہ ہو چکا ہے اس لئے قرآن خاص طور پر اس غیر اجتہادی رویے کی سرکوبی کرتا ہے۔ مذکورہ آیت کی تفسیر میں مفسرین نے سلمان فارسی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جنہیں عیسائی علماء کی صحبت میں رہنے کا خاص طور پر موقع ملا تھا اور جنہوں نے اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ سے یہ استفسار کیا کہ اہل کتاب کا اپنے علماء و مشائخ کو مسند خدائی پر فائز کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ "کیا ایسا نہیں کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی من گھڑت حلت و حرمت کو بلا چوں و چراں مانے لیتے ہیں" گویا وہ انسانوں کے فیصلے نہ ہوں بلکہ آسمانی وحی ہو (ہم نے اس واقعہ کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے)

قرآن امم سابقہ کا تذکرہ بار بار اس لئے کرتا ہے کہ مسلمان ان غلطیوں سے اپنا دامن بچائیں اور ان خطرات سے ہوشیار رہیں جس میں پچھلی امتیں تباہ ہوئیں۔ چونکہ امت مسلمہ آخری امت ہے اور اسے رہتی دنیا تک رہنمائی کے لئے منتخب کیا گیا ہے اس لئے اسے ان غیر صحتمندانہ رویوں سے بچانا اور خطرات سے آگاہ کرنا ایک فطری تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں اہل یہود کا کثرت سے تذکرہ صرف تاریخی حوالے کے طور پر نہیں بلکہ ایک برگزیدہ امت پر پیش آنے والے حادثات کا عبرت انگیز بیان ہے کہ کس طرح اللہ کی رحمت سے نکل کر ایک منتخب قوم پے در پے ایسے حادثات کا شکار ہو جاتی ہے کہ اسے

دنیا میں کہیں بھی جائے پناہ نہیں ملتی۔ اسے نہ صرف یہ کہ منصبِ سیاست سے معزول کر دیا جاتا ہے بلکہ بے بسی اور ذلت اسے اس طرح آلیتی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے رہتی دنیا تک وجہ عبرت بنادی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ کے ایک ایسے مرحلے سے گذر رہے ہیں جہاں ان کے درمیان نئی صبح کے طلوع کی ہر کوشش، علماء و فقہاء کے بھاری بھرکم اقوال میں دب کر رہ جاتی ہے۔ اس مسئلے کو قدرے تفصیل سے سمجھنے کے لئے ہم اہل یہود کی مذہبی تاریخ سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ہمیں کسی قدر اندازہ ہوسکے کہ آج اگر ہم کتاب و سنت کے صریح احکام کو اپنا منشور بنانے سے خود کو گریزاں پاتے ہیں اور آج اگر علماء و مشائخ کی باتیں اور ملی قائدین کی اپیل کا پلڑا کتاب و سنت کے مقابلے میں بھاری محسوس ہوتا ہے تو یہ رویہ ہمیں کہاں لے جاسکتا ہے۔ اہل یہود کی مثال ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ اولاً: قرآن بار بار ان کی غلطیوں اور تضادات فکری کا تذکرہ کرتا ہے، ثانیاً: علماء و مشائخ کی قیل و قال کی تاریخ ہمیں بآسانی یہ بات سمجھا سکتی ہے کہ اگر ہم نے اپنا راستہ درست نہ کیا اور سابقہ امتوں کے راستوں پر چل نکلے تو ہمارا انجام کیا ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ امت کے مصالح طے کرنا ہمارا اور آپ کا کام نہیں بلکہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس بات سے زیادہ واقف ہے کہ کن باتوں سے امت کے مصالح وابستہ ہیں' کون سی چیز امت کے لئے موت ہے اور کن باتوں میں اس کی زندگی کا سامان پوشیدہ ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا ایقان ہے کہ کتاب و سنت کے مطالبات کو بروئے کار لانا اور اس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ترتیب دینے میں ہی ہماری زندگی کا سامان ہے۔ خواہ ایسا کرنے میں بظاہر ہر لحہ ہمیں خطرات سے کیوں نہ نبرد آزما ہونا پڑے۔ اللہ کے رسولؐ نے اپنے فدائین کی بیش قیمت جانیں اور اپنے عزیز و اقارب کی زندگیاں دے کر اور خود ایک انتہائی جاں گسل جدوجہد کے نتیجے میں الہی پیغام کو عملی طور پر برت کر دکھادیا کہ یہ سب کچھ امت کے مصالح میں تھا۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ آنے والی نسلوں پر اور مستقبل کے مسلمانوں پر اس الہی مشن کی ذمہ داری ڈال دی گئی اور قرآن کے ابدی پیغام کے ذریعے جسے **حجة من بعد الرسل** کی حیثیت حاصل ہے' اس عظیم مشن کو جاری رکھنے اور اسے اس کے منطقی اختتام تک پہنچانے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ڈال دی گئی۔ اب اگر کوئی شخص قرآن کے کسی حکم یا اس کے کسی مطالبے کو صرف اس

لئے منجمد کر دینا چاہتا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی عقل سے ایک نیا منشور وضع کرتا ہے اور مسلمانوں کو یہ باور کراتا پھرتا ہے کہ اس کی وضع کردہ ترکیبوں میں ہی امت کے مصالح پوشیدہ ہیں تو ایسا شخص دراصل خود کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو ہمارے درمیان اعتبار مل جاتا ہے تو پھر کوئی قوت ہمیں گمرہی سے نہیں بچاسکتی ہے۔ اہل یہود کے زوال کی وجہ یہی ہوئی کہ انہوں نے اپنی زندگی کو تورات کے مطابق برتنے کے بجائے خود تورات کو اپنی خواہشات کا تابع کرلیا۔ تورات کی نئی تعبیر کے لئے انہوں نے یہ اصول وضع کیا کہ کسی خاص قانون کے بارے میں نفس قانون کی اتباع کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں عمومی رجحان کیا ہے اور یہ کہ جب اکثریت اس خاص مسئلے پر راضی ہو جائے تو اسے ہی قابل عمل حکم سمجھا جائے۔ اس طرح تورات کی تشریح کے لئے یہ مضحکہ خیز اصول وضع کیا گیا جسے وہ fortynine points pro and forty nine points contra سے تعبیر کرتے ہیں۔

شریعت کی تشریح و تعبیر میں علمائے یہود نے اپنے آپ کو پیغمبرانہ منصب پر فائز سمجھا۔ تورات کے شارحین نے یہ اصول وضع کیا کہ انھیں شریعت کی تشریح و تعبیر کا وہی حق حاصل ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حاصل تھا۔ علماء نے اپنے اس خصوصی حق کا جواز اس تورات میں ڈھونڈھ نکالا جسے انہوں نے تحریری تورات سے الگ زبانی تورات کا نام دے رکھا تھا۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ موسیٰ اور ہارون حاملین وحی تھے، ان کا تعلق آسمانوں سے قائم تھا، ان کی باتیں دراصل احکامِ الٰہی پر مشتمل ہوتی تھیں، مہبط وحی کے مقابلے میں ان کی حیثیت محض ایک عام دانشمند کی تھی جس کا کام ان احکام و فرامین کی بجا آوری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ لیکن علمائے یہود نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو موسیٰ، ہارون اور سموئیل نبی کے منصب پر فائز کرلیا کہ ہر دور میں مذہبی پیشوائی کو وہی قطعیت حاصل ہوگی جو کبھی ان انبیاء کو اپنے زمانے میں ہوا کرتی تھی جن لوگوں کی تلمود کے ارتقاء پر نظر ہے وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ علمائے یہود نے کس طرح تشریح و تعبیر اور من مانی تاویلات کے ذریعہ اپنی قوم کو تورات کے جبر اور اس کی سخت گیری سے آزادی دلائی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تورات کی مذمت میں علمائے یہود نے کبھی کوئی کلمہ زبان سے نکالا ہو۔ زبانی طور پر تو وہ تورات کے سخت گیر قوانین کو رحمتِ

الٰہی بتاتے رہے۔ لیکن عملی طور پر تورات کی ہر تاویل اصل تعلیمات سے اتنی دور جاتی رہی کہ اہلِ یہود تورات کے مقابلے میں تلمودی علماء کو کہیں زیادہ باعثِ رحمت گردانننے لگے جن کی لبرل تشریحات نے ان کے لئے تورات پر عمل کرنا آسان بنادیا تھا۔

علمائے یہود تورات کو اس لئے ناقابل عمل سمجھنے لگے تھے کہ سلطنت کی تباہی کے بعد جب اہلِ یہود مختلف قسم کے ایمانی اور اعتقادی ضعف میں مبتلا ہو گئے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حالات کی سخت گیری کے آگے وہ یہودیت کا دامن ترک کردیں گے۔ ایسی صورت میں علمائے یہود نے ایک ایسا دین وضع کرنے کی کوشش کی جسے عام یہودی بآسانی قابل عمل سمجھ کر قبول کر سکے۔ جس میں زندگی کا چیلنج بھی نہ ہو، جو الٰہی پیغام کے لئے جان و مال کی قربانی نہ طلب کرتا ہو اور جہاں ٹھنڈے ہولے ہولے نجات کا سامان موجود ہو۔ لہٰذا اسی دور میں تلمودی لٹریچر تورات کے سخت گیر قوانین کے مقابلے میں متبادل کے طور پر سامنے آیا اور ایسی دعائیں بھی تیار کی گئیں جن کا جپنا قربانیوں سے بھی زیادہ متبرک اور معتبر قرار پایا۔

علمائے یہود کی دلیل یہ تھی کہ اگر تورات کی تعلیمات کو حالات کے دباؤ کے تحت نرم نہ بنایا گیا اور اگر مخصوص دعاؤں کے ثواب کو وجہ نجات نہ بتایا گیا تو اہل یہود جو اس وقت انتہائی پراگندہ حال تھے اور جن کا ضعف ایمانی اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا وہ دینِ موسوی سے کب کے دست بردار ہو چکے ہوتے۔ یہ محض تلمودی لٹریچر اور علمائے یہود کا کارنامہ ہے کہ تاریخ کے ایک نازک مرحلے میں انہوں نے اپنی قوم کو ختم ہونے سے بچالیا۔ ہمارے خیال میں کچھ اس قسم کے تحفظ کی نفسیات ہمارے موجودہ مسلم قائدین اور مشائخ کے دل و دماغ پر حاوی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فی زمانہ یہ مسلمان پراگندہ حال ہیں۔ ابھی انھیں قرآنی منشور کے لئے کام کرنے کی دعوت دینا اور اس مقصدِ عظیم کے لئے قربانیوں کی طلب ایک بے جا مطالبہ ہوگا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر اسلام کے uncompromising massege کو قرن اول کی طرح پیش کیا گیا تو ایک ایسے اسلام میں عام مسلمانوں کی کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ لہٰذا وہ اپنی فہم سے ایک ایسا اسلامی منشور وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مسلمانوں کا تعلق جذباتی طور پر تو کتاب وسنت سے باقی رکھے البتہ عملی زندگی میں پیغمبرانہ مشن اور اس راہ کی دشواریوں سے ان کے دامن بچے

رہیں۔ اہل یہود کے یہاں تلمود کا ارتقاء اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کس طرح عہد غلامی کے لئے ایک مستقل فقہ تیار کر لیتی ہے اور پھر وہ اس فقہ کو الٰہی تعلیمات سمجھ کر کچھ اس طرح برتنے لگتی ہے کہ اس کے اندر اپنی عظمت رفتہ کو لوٹانے اور اصل پیغام کو اپنی زندگی میں برتنے کا داعیہ دم توڑ دیتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ اہل یہود کی ملی اور مذہبی تاریخ میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ آج ہمارے قائدین اگر قرآن کے انقلابی پیغام کو موجودہ دنیا میں جوں کا توں قابلِ عمل نہیں سمجھتے اور اگر انہیں یہ خوف پریشان کرتا ہے کہ قرآنی منشور کو فی الحال پیش کرنا ایک بڑے خطرے کو دعوت دینا ہے یا یہ کہ اس وقت امت کو بچالے جانا، ان کی رہی سہی مذہبی شناخت کو تحفظ عطا کرنا ہی اس وقت کا سب سے بڑا کام ہے اور اپنے اس نقطہ نظر کی صحت کے لئے وہ مصالح امت کا سہارا لیتے ہیں یا جو لوگ عہدِ غلامی کے لئے ایک مستقل فقہ کی تدوین و ترتیب کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں یا جو لوگ معروف محرمات کو موجودہ حالات میں حلال کئے دیتے ہیں، جو نصوص قطعی کے برخلاف کفار و مشرکین کی اتباع اور نظامِ کفر کو برضا و رغبت قبول کرنے کی دعوت دیتے یا جو اس سے بھی آگے بڑھ کر سیکولرزم اور ڈیموکریسی کے تحفظ و اشاعت کو عین اسلامی منشور بتاتے ہیں اور اپنی اس صریح گمرہی پر پردہ ڈالنے کے لئے دار الحرب یا عہد غلامی کی فقہ کی تشریح و تعبیر میں لگ گئے ہیں۔ تو دراصل ایسے تمام لوگ امتِ مسلمہ کے لئے کتاب و سنت سے الگ ایک نیا تلمود تشکیل دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہیں یہ تلمودی لٹریچر علماء و مشائخ کی سیاسی اپیلوں کی شکل میں نظر آتا ہے تو کہیں فلاں رام اور فلاں سنگھ کی قیادت کو اعتبار بخشنے والے فتاوے کی شکل میں۔ اب یہ امت کے باشعور افراد کا کام ہے کہ وہ مسلمانوں میں فروغ پا رہے ہیں اس غیر اسلامی تلمودی لٹریچر کا سنجیدگی سے نوٹس لیں اور عامۃ المسلمین کو وضاحت سے یہ بات بتائیں کہ کتاب و سنت سے الگ کسی اور شرع کی نہ تو اسلام میں کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی اس راستے سے ان کے تحفظ اور بقا کا سامان ہو سکتا ہے۔ کہ اہل یہود کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انسانوں کی شرع عہد غلامی کو طول دے سکتی ہے اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ علماء نے فقہی لٹریچر کو کچھ اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ جو دین بہت ہی آسان تھا، ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آتا تھا اس پر اصطلاحوں کی ایسی دھند چھا گئی ہے کہ عام مسلمان کے

لئے حلال و حرام جیسے موٹے موٹے مسائل بھی فقہی موشگافیوں میں کھو گئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں اہل یہود کی اس ذہنی کیفیت کا تذکرہ ہوا ہے کہ کس طرح انہوں نے امر ربی سے بچنے کے لئے قیل و قال کا سلسلہ اتنا دراز کر دیا کہ جب ان سے گائے کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے یہ مباحث چھیڑ دیئے کہ پہلے یہ بتاؤ کہ گائے ہو کس طرح کی' اس کا رنگ کیا ہو اور اسے کس کام کے لئے استعمال کیا جاتا ہو۔ اتنے سارے سوالات اور استفسارات میں امر ربی پس پشت چلا گیا۔ حالانکہ عبودیت کا تقاضا یہ تھا کہ جب گائے کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا تھا تو وہ فی الفور اسے عملی طور پر کر دکھاتے۔ جو لوگ اللہ کے فرمانبردار اور منتخب بندوں میں شمار ہوتے ہیں ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ "مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" (الحشر: ۷) جو کچھ اللہ نے حلال کر دیا ہے وہ حلال ہے اور جس چیز سے اس نے روک دیا ہے اس کی طرف بڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' خواہ حالات کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہوتی ہے وہ احکامِ الٰہی کی تشریح و تعبیر کے لئے اصطلاحوں کا سہارا لیتے ہیں جو حرام کو پوری طرح اگر حلال نہ کر سکے تو کم از کم اس کی حرمت کی شدت میں کمی تو کر ہی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر نشہ آور چیزوں کا استعمال اہل اسلام کے نزدیک محرمات میں داخل ہے خواہ یہ نشہ شراب میں ہو یا چرس میں، دھوئیں کے ذریعہ جسم میں داخل ہوتا ہو یا ہیروئن کے انجکشن کی شکل میں اسے رگوں میں پہنچایا گیا ہو۔ محرمات میں سے بعض چیزوں کو قطعی حرام بعض کو مکروہ قرار دینا اور پھر مکروہات میں سے بھی بعض کو مکروہ تنزیہی اور بعض کو مکروہ تحریمی کے خانوں میں بانٹنا یہ سب وہ فقہی ترکیبیں ہیں جن سے محرمات اگر حلال نہیں قرار پاتیں تو کم از کم ان کی شدت میں اتنی کمی آجاتی ہے کہ لوگ بآسانی انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پان کا تمبا کو احناف کے اکثر علماء کے نزدیک مکروہِ تنزیہی ہے تحریمی نہیں اس لئے وہ اسے بصد شوق استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عبودیت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے جس چیز سے روک دیا ہے اس کے قریب بھی نہ جائیں یعنی ان تمام چیزوں سے اجتناب کریں جو کسی بھی درجے میں ہمارے اعمال کا رشتہ ممنوعات اور محرمات سے جوڑ سکتی ہوں' یا جن کی مضرت رسانی اور حرمت کا ہمارے دل و دماغ میں ہلکا سا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ ورنہ اگر ہم نے محرمات میں درجہ بندی کے ذریعہ بعض کو اپنے لئے گوارہ کر لیا تو عملاً ہو گا یہ کہ بظاہر ہلکی سی برائی ہمیں رفتہ رفتہ اس سے

بڑی اور پھر اس سے کہیں بڑی برائی کی طرف لے جائے گی یہاں تک کہ حدود اللہ کا توڑنا اور اللہ سے کئے گئے عہد و پیمان کو یکسر فراموش کر دینا ہمارے لئے آسان ہو جائے گا۔ ہمارے نزدیک "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا" (البقرہ:۱۸۷) کا یہی مفہوم ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم نے احکام الٰہی کو اپنی شہادت کے تابع بنانے کی کوشش کی اور حلت و حرمت کی کیفیت کو اپنے خود ساختہ پیمانوں سے ناپنے لگے تو ہم خواہ تکنیکی طور پر اپنے آپ کو مسلمان کیوں نہ سمجھتے رہیں عملی طور پر عبودیت کی فہرست سے خارج ہو جائیں گے۔ اور ہمارا بھی وہی حشر ہو گا جو اہل یہود کا ہوا۔ ذرا دیکھئے کتنی مماثلت ہے ان فقہی ترکیبوں میں جو حرام کو حلال باور کرانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور ہم اس سیاسی مسئلے کو لیتے ہیں جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے قرآن واضح طور پر کفار کی سیاسی حاکمیت کو چیلنج کرتا ہے "وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا" (النساء:۱۴۱) اس کا مسلمانوں سے مطالبہ ہے کہ وہ دین مبین کو اس سرزمین پر غالب کریں خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو "وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ"۔ وہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ جب کسی بارے میں اللہ کا واضح حکم آجائے تو مسلمان اس کے بعد بھی کسی اور طریقۂ حیات کو اپنے لئے معتبر سمجھیں "وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ...... الآیۃ" (النساء:۱۱۵) گویا قرآنی آیات واضح طریقے سے مسلمانوں کو کفار و مشرکین اور ان کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی کی اتباع سے روکتی ہیں لیکن ان صریح احکام کے باوجود اگر مصالح امت کے نام پر ان احکام کے برعکس عمل جاری ہے، اور دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہیں اور اس لئے اقلیت کی فقہ پر یہ احکام اثرانداز نہیں ہوں گے اور یہ کہ اقلیت کی فقہ کی تشکیل کا حق علماء و مشائخ کو حاصل ہے جو فقہی مباحث سے کہیں زیادہ واقف ہیں تو اسے اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ دراصل علمائے یہود کی طرح سبت کی حرمت کو پامال کرنے کی کوشش ہے۔ تورات میں واضح طور پر منع کر دیا گیا ہے کہ سبت کے دن کسی بھی قسم کا کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہودی علماء نے ان کاموں کی بھی ایک فہرست تیار کر لی جو ممنوعات میں شمار کی جائیں گی۔ رہے اس کے علاوہ دوسرے امور تو اہل یہود کے پاس ان کی انجام دہی کے لئے شرعی حیلوں کی کمی نہ تھی۔ ممنوع کاموں کی جو فہرست بنائی گئی ان میں انتالیس (۳۹) کام شامل کئے گئے

جس میں ایک چیز کا دوسری جگہ منتقل کرنا بھی شامل ہے لطیفہ یہ ہے کہ اب اس مسئلے پر بھی بحث چل نکلی کہ منتقلی کا واقعی مفہوم کیا ہے۔ کن چیزوں پر منتقلی کا اطلاق ہو گا اور کن چیزوں پر نہیں۔ آپ کی دلچسپی کے لئے ہم تلمود سے اس بارے میں مزید تشریحات نقل کرتے ہیں تاکہ کسی قدر اندازہ ہو سکے کہ سیدھے سادے احکام الٰہی پر احبار و رہبان کی تشریح و تعبیر کیا گل کھلاتی ہے اب یہ مسئلہ کہ کسی چیز کی منتقلی پر منتقلی کا واقعی اطلاق ہو گا یا نہیں اسے "مشنات" میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے: اگر کوئی بھکاری اپنا ہاتھ کچھ اس طرح گھر کے اندر داخل کرے کہ وہ خود تو باہر کھڑا ہو اور اس کا ہاتھ اندر ہو اور صاحبِ خانہ اس کے ہاتھ پر کچھ رکھ دے تو ایسی صورت میں بھکاری گنہ گار ہو گا صاحب خانہ نہیں کہ بھکاری دراصل ایک چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا گنہ گار ہے اس کے برعکس اگر بھکاری اپنا ہاتھ باہر رکھے اور صاحب خانہ اپنا ہاتھ کھڑکی سے نکال کر اس کے ہاتھ میں کچھ رکھ دے تو ایسی صورت میں صاحب خانہ گنہ گار سمجھا جائے گا۔ اگر بھکاری گھر کے اندر داخل ہو کر کچھ طلب کرے اور اسے اپنے پاس رکھے تو ایسی صورت میں دونوں گناہ سے بچ جائیں گے۔ اسی طرح اگر صاحب خانہ اپنا ہاتھ گھر سے باہر نکال کر بھکاری کو کچھ دے یا کچھ وصول کرے تو ایسی صورت میں دونوں پر گناہ آئے گا۔ ایک سیدھے سادے الٰہی فرمان کی تشریح و تاویل نے اس بحث کو بھی جنم دیا کہ عورتوں کے لباس میں کون سی چیز لباس کا حصہ سمجھی جائے گی اور کون سی چیز وزن ڈھونے یا چیزوں کو منتقل کرنے کے مترادف سمجھی جائے گی۔ زیورات کا شمار عورت کے لباس میں ہو گا یا اس کے پہننے پر چیزوں کی منتقلی کا الزام آئے گا؟ سبت کے دن کوئی شخص مصنوعی دانت پہن سکتا ہے یا نہیں؟ جب تشریح و تاویل کا سلسلہ اس حد تک دراز ہو جائے تو پھر مختلف فقہی آراء اور باہم متضاد فتاوے بھی سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا بعض یہودی علماء نے سونے کے مصنوعی دانت پہننے کی اجازت دی تو بعض نے اسے انتہائی سختی سے منع کیا۔ حق کے عام متلاشیوں کے لئے یہ بات انتہائی مشکل ہو گئی کہ وہ کس فتوے پر عمل کریں۔ کسے احکام الٰہی کی بجا آوری قرار دیں اور کس فیصلے کو انحراف پر محمول کریں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب حق کے واضح ہو جانے کے بعد اہل ایمان عمل پیرا ہونے کے بجائے اس سے بچنے کی ترکیبیں تلاش کرتے ہیں یا ضعف ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں، قربانیوں سے جی چراتے اور خطرات سے دامن بچاتے ہیں اور اپنی اس بے توفیقی اور بزدلی کو

تاویلات کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو پھر روشن احکامات انتہائی پیچیدہ فقہی مسائل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور پوری امت اختلاف کا شکار ہو جاتی ہے۔ ”کان الناس امة واحدة...... الآیة“ (البقرہ:۲۱۳) میں دراصل قوموں کے زوال کا یہی اصول بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ انتشار اور نااتفاقی کی لعنت نجات حاصل کریں تو ہمیں علمائے یہود کی طرح سبت کے ممنوع کاموں کی فہرست بنانے کے بجائے فی الفور احکام الٰہی انجام دہی کا رویہ پیدا کرنا ہوگا۔ جب اللہ نے کسی بات کا حکم دیا تو اب اس میں کسی ایسے قیل و قال کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد علماء و مشائخ کی خود ساختہ سیاسی اپیلوں میں نہیں بلکہ کتاب وسنت کے احکام و فرامین پر عمل کرنے میں ہے اور یہ ہدایات اتنی واضح ہیں کہ اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ رہی یہ بات کہ کتاب وسنت کا علم یا اصل فہم صرف مخصوص علماء و فقہاء کو حاصل ہے تو کسی ایسی دلیل کی بنیاد ہمیں کم از کم کتاب وسنت میں نہیں ملتی کہ قرآن کا سارا زور احبار و رہبان کے طبقے کو ختم کرنے اور خالق کا براہ راست بندے سے رشتہ جوڑنے پر ہے۔ قرآن مذہبی پیشوائی کے منصب کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ بندوں کی گردنیں اہل کلیسا کے آگے نہ جھکیں اور نہ ہی یہاں کسی برہمنیت کو پنپنے کا موقع ملے، ایک ایسا ماحول پیدا ہو جس میں صرف اور صرف الٰہ واحد کی ربوبیت کے نغمے گائے جائیں۔ یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ حجۃ الوداع کے آخری خطبے میں رسول اکرم ﷺ نے پوری امت پر یہ کہہ کر کارِ نبوت کی ذمہ داری منتقل کردی تھی کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں یا جن لوگوں تک یہ پیغام پہنچ چکا ہے وہ اب اس پیغام کو ان لوگوں تک لے جائیں جن کے کان ابھی اس پیغام سے نا آشنا ہیں آپؐ نے کسی خاص طبقے یا مذہبی گروہ کو اس کام کے لئے مختص نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں پر من حیث الامت کارِ نبوت کی ذمہ داری ڈال دی۔ اس حیثیت سے آخری رسول کی پوری امت آج نیابت رسول کے منصب پر فائز ہے۔ صحت مند رویہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی اس عظیم حیثیت کو پہچانیں اور اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے اپنی تمام قوت و توانائی جھونک دیں اور اسے صرف کسی مخصوص مذہبی گروہ اور جبہ دستار والے حضرات کی ذمہ داری سمجھ کر اپنا دامن بچانے کی کوشش نہ کریں۔

کیا مسلمان انسانی حقوق کے لئے کام کرسکتے ہیں

سوال: ان دنوں ہر طرف انسانی حقوق کا چرچا ہے، امریکہ اور مغرب کی بعض تنظیمیں مسلسل دنیا کے مختلف حصوں، میں بالخصوص مسلم دنیا میں انسانی حقوق کی پامالی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ ادھر چند سالوں سے مسلمانوں کی بعض تنظیمیں مثلاً رابطہ عالم اسلامی نے انسانی حقوق کی بحالی کے سلسلے میں چند بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کی ہیں۔ دریں اثناء مسلم علماء کی طرف سے بعض ایسی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں مروجہ انسانی حقوق کے تصور کو اسلام سے عین ہم آہنگ بتایا گیا ہے۔ اگر انسانی حقوق عین غایت اسلام ہے تو امریکہ اور مغربی طاقتوں کی اس مسئلے میں دلچسپی اور اسے مسلم دنیا میں برتنے پر اتنا زور دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ خدارا یہ بتایئے کہ جب امریکہ اور اس کی حلیف تنظیمیں انسانی حقوق جیسے نعرے بلند کریں تو اس موقع پر ہم مسلمانوں کو "تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" کے اصولی موقف کو کس طرح بروئے کار لانا چاہئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اہل فکر طبقہ اس امریکی نعرے کا سنجیدگی سے جائزہ لیے بغیر اس مہم میں شریک ہوگیا ہے۔ ورنہ آخر کیا بات ہے کہ غیر اسلامی قوتیں امریکہ کی قیادت میں بظاہر ایک دینی اور اخلاقی ایجنڈے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں۔

جواب: انسانی حقوق ایک انتہائی غیر واضح اور مبہم اصطلاح ہے جس کے حدود اربعہ کا تعین ہونا ابھی باقی ہے۔ انسانوں کو انفرادی طور پر کیا حقوق ملنے چاہئیں اور اجتماعیات کے تئیں اس کے فرائض کیا ہیں، اس بارے میں بحث وتمحیص کا جو سلسلہ مغرب میں صدیوں سے جاری ہے یہ بحث اب تک فیصلہ کن مرحلہ میں نہیں داخل ہوسکی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ امریکی پروپیگنڈا مشینری کے زیر اثر انسانی حقوق کو فی زمانہ سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بالخصوص اسے ۱۹۷۷ء میں امریکی خارجہ پالیسی کا جز بن جانے کے بعد عالمی سطح پر یہ تاثر ابھرا ہے گویا امریکہ انسانی حقوق کی پاسداری کے لئے عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہے۔ یہ وہ خوش نما ماسک ہے جسے امریکہ اور اس کے حلیف اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کررہے ہیں۔

بظاہر یہ بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ جن انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کردیا گیا ہو

ان کی حمایت میں کہیں سے بھی اگر کوئی آواز اٹھتی ہے تو اسے خوش آمدید کہنا چاہئے۔ لیکن مسئلہ کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کا جو تصور مغرب میں مقبول ہے وہ دراصل ایک ایسا ایجنڈا ہے جو پوری دنیا پر، بشمول مسلم ممالک، مغرب کی تہذیبی بالادستی قائم کرنے کا اعلامیہ ہے۔ پروپیگنڈے کے زور پر اس اصطلاح نے چونکہ اہل فکر کے درمیان عام قبولیت حاصل کرلی ہے اس لئے دنیا بھر میں اس کی حمایت اور ہمدردی کا عام رجحان پایا جاتا ہے حتی کہ مسلم علماء ودانشور بھی مسئلے کا سنجیدگی سے جائزہ لئے بغیر انسانی حقوق کے مروجہ اور مقبول عام تصور کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ مغلوب قوموں کی یہ نفسیات بن جاتی ہے کہ وہ غالب تہذیب کے خوش نما نعروں کے سلسلے میں عموماً احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ ان نعروں کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، انہیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ بالکل عین یہی نعرہ خود ان کے تہذیبی منشور کا حصہ رہا ہے پھر بھلا اس مشن میں ہم آپ کا ساتھ کیوں نہ دیں۔ حالانکہ انسانی حقوق کے مروجہ تصور کے لئے نہ تو اسلام میں کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی مسلمان کی حیثیت سے ہم انسانی حقوق کے موجودہ تصور کی بحالی کے لئے کام کرنے کی سند کتاب وسنت سے لا سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ انسانی حقوق کا موجودہ تصور اب جس مرحلے میں پہنچا ہے اس کے ارتقاء کے پیچھے مغرب کی تہذیبی تاریخ اور اس تاریخ میں پیش آنے والے مختلف حادثات ہیں۔ اس کا ارتقاء ایک لادینی معاشرے میں مذہبی پیشواؤں اور بادشاہوں کے جبر سے نجات پانے والی تحریک کے نتیجے میں ہوا ہے۔ ایک طرف بادشاہوں نے اپنی شہنشاہیت کے استحکام کے لئے اپنے اختیارات کو الوہی حیثیت دے رکھی تھی تو دوسری طرف مذہبی پیشوائی نے نجات کا حق اپنے پاس محفوظ کر رکھا تھا۔ گویا دنیا پر بادشاہوں کا تسلط تھا تو آخرت پر کلیسا کی حکمرانی۔ یہ وہ صورت حال تھی جس نے مغرب میں اصلاح پسندی کے نام پر مختلف علمی اور سیاسی بغاوتوں کو جنم دیا۔ رفتہ رفتہ مختلف طبقات کے حقوق کا تصور پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں عمومی سماجی بیداری اور انقلاب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ برطانیہ، امریکہ اور فرانس کا معاشرہ اتھل پتھل کا شکار ہو گیا۔ پھر انیسویں صدی میں فرانس کی سماجی اور سیاسی صورت حال نے انسانوں میں حقوق کی بازیابی کا نیا داعیہ پیدا کیا۔ ایک طویل سفر کے بعد دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے ہاتھوں انسانوں پر جو کچھ بیتی اس نے ایک عمومی ضرورت کا احساس دلایا کہ

انسانوں کو زندہ رہنے کا بعض بنیادی اختیار تو یقیناً دیا جانا چاہئے۔ یونیورسل ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس Universal Declaration of Human Rights تک پہنچنے میں دنیا کو دو عظیم جنگیں برداشت کرنی پڑیں۔

دیکھا جائے تو تاریخی اعتبار سے انسانی حقوق ایک مسلسل تغیر پذیر تصور ہے۔ سترہویں صدی سے اب تک، جب اسے نیچرل رائٹس سے موسوم کیا جاتا تھا، اس کے تصور میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ مغرب کے پس منظر میں تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب نے انسانی حقوق کی شکل میں ایک قابل قدر منشور مرتب کرلیا ہے۔ البتہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسانی حقوق کا یہ تصور اپنی تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اور اس پر مزید گفتگو یا بحث و مباحثے کی گنجائش نہیں بلکہ اب صرف اس کے نفاذ کا مسئلہ ہے جس کے نتیجے میں عالمی امن قائم ہوجائے گا۔ اہل مغرب یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے انسانی حقوق کی شکل میں اپنے طور پر اور اپنی دانست میں انسانیت کے لئے اب تک کا بہترین منشور تیار کرلیا ہے۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ کہ اس کی افادیت اسی قدر دوسرے معاشروں کے لئے بھی ہوگی صحیح نہیں اور نہ ہی یہ بات صحیح ہے کہ دوسرے معاشروں میں انسانی حقوق کے اس چارٹر سے بہتر کوئی اور چارٹر موجود نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ امریکی صدر فرینکلن روز ولٹ جنہیں انسانی حقوق کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے، انسانوں کو چار بنیادی آزادی عطا کرنے کے نعرے کے ساتھ سامنے آئے تھے جس میں اظہار خیال کی آزادی، عبادت کی آزادی، بنیادی ضرورتوں سے آزادی اور خوف سے آزادی شامل ہے۔ اس وقت کے امریکی معاشرے میں ان چار آزادیوں کا حصول یقیناً ایک انقلابی تصور تھا۔ لیکن جو لوگ انسانی حقوق کا تصور اپنے دل و دماغ سے وضع نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی تاریخی غلطیوں اور حادثات سے متاثر ہوکر مرتب کرتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد آسمانی احکام و فرامین پر رکھتے ہیں ان کے لئے پہلی ہی جست میں انسانی حقوق کے مکمل منشور تک رسائی کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ مسلمان کی حیثیت سے جب ہم انسانی حقوق کے موجودہ تصور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مغرب کی اس بازیافت پر کسی قدر خوشی تو ضرور ہوتی ہے کہ اہل مغرب نے بعض بنیادی قدروں کی دریافت میں دیر تو ضرور لگائی لیکن وہ اس کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں انسانی ذہن کی نارسائی پر افسوس

بھی ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا مطالعہ کرنے اور اللہ نے انسانوں کو جو حقوق عطا کئے ہیں اسے جوں کا توں اسے دینے کے بجائے اہل مغرب نے اپنی غلطیوں سے نکلنے کا ایک طویل اور لامتناہی سلسلہ چلا رکھا ہے۔ لہٰذا انسانی حقوق کے موجودہ تصور میں بعض ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جو مستقبل کے انسانی معاشرے کے سکون کو درہم برہم کر دیں گی۔ اس بارے میں ہم مزید وضاحت آگے کریں گے یہاں صرف یہ عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ جو تصور ابھی ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہو اور جس کے مالہ وماعلیہ پوری طرح سامنے نہ آسکے ہوں اسے منشور حیات کی حیثیت سے کم از کم وہ لوگ قبول نہیں کر سکتے جن کے پاس انسانی حقوق کا ایک منضبط اور حتمی چارٹر پہلے سے موجود ہے۔

یہ تو انسانی حقوق کے سلسلہ میں ایک نظری اور فلسفیانہ بات تھی، رہی یہ بات کہ خیر کے کاموں میں تعاون کی نیت سے مسلمان Human Rights کے لئے کام کر سکتے ہیں یا نہیں، تو اس بارے میں کوئی فیصلہ لینے سے پہلے اس مسئلے کے سیاسی پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب خلافت یعنی مسلمانوں کا عالمی سیاسی ڈھانچہ اس سرزمین پر موجود تھا۔ مسلمان خود کو اس سرزمین کا وارث سمجھتے تھے اور ان کے اندر یہ احساس عام تھا کہ وہ عالمی قیادت کے منصب پر فائز کئے گئے ہیں اور یہ کہ آخری رسول کی امت کی حیثیت سے سیادت کا فریضہ انہیں ہی انجام دینا ہے۔ یہ بات بھی عام مسلم ذہن میں واضح تھی کہ قرآنی نظامِ عدل کا قیام نظری طور پر ایک انتہائی ترقی یافتہ منشور ہے۔ وہ ایک ایسے پیغام کے حامل ہیں جس کا مقابلہ اس وقت دنیا کی کوئی دوسری امت نہیں کر سکتی۔ لیکن سقوط خلافت کے بعد عالمی منظر نامہ کچھ اس طرح اچانک تبدیل ہوا ہے کہ اب عالمی نظامِ عدل کے قیام کا خواب دیکھنے والی امت کو اپنے اس عالمی ایجنڈے کا خیال بھی نہیں آتا۔ سیادت کے اس منصب پر امریکہ اور اس کے نظری اور تہذیبی حلیف فائز ہو چکے ہیں اور اب وہ انسانی حقوق کا راگ الاپنے کے لئے خود کو آزاد پاتے ہیں۔ اس تناظر میں انسانی حقوق پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق دراصل ایک امریکی منصوبہ ہے۔ امریکہ کے ہاتھوں میں یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ مقابل تہذیبوں بالخصوص مسلم دنیا کا شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی دستاویز میں دفعہ ۲۸ میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بتادی گئی ہے کہ دنیا کا ہر شخص ایک سماجی اور بین الاقوامی نظام میں جینے کا حق رکھتا ہے جس کے اندر

اس منشور میں بیان کئے گئے حقوق کے حصول کا پورا پورا موقع ہو۔ اسی منشور میں اس بات کا اعادہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ منشور دراصل تمام انسانوں کے لئے اور تمام قوموں کے لئے انسانی حقوق کا ایک عمومی معیار متعین کرتا ہے۔ گویا امریکی قیادت میں اقوام متحدہ کی بین الاقوامی حکومت کو عملی طور پر ممکن کر دکھانے کے لئے امریکہ جن خوش نما اصطلاحات کو اپنی خارجہ پالیسی کے ایک اہم ستون کی حیثیت دیتا ہے اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ امریکی اقدار اور امریکی نظریے کی حامل ایک نئی دنیا وجود میں آجائے جس میں دوسری تہذیبوں اور حریف قوتوں کا سانچہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے۔

انسانی حقوق کا مروجہ تصور اسلام سے کس قدر متصادم ہے اس کا بخوبی اندازہ حقوق انسانی کے علمبرداروں کی ان سرگرمیوں سے ہوتا ہے جو وہ مسلم معاشرے کے حوالے سے انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ سال ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے واشنگٹن میں واقع سعودی سفارت خانے کے سامنے جو مظاہرہ کیا گیا اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ سعودی معاشرے میں ہم جنس پرستوں کو اپنے انداز سے زندگی گذارنے کی اجازت دی جائے اور ان کے وہی حقوق تسلیم کئے جائیں جو اقلیتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ اس قبیل کے مطالبات کی ایک طویل فہرست ہے جن کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایمنسٹی انٹرنیشنل نے سعودی عرب کے روایتی مسلم معاشرے کے سلسلے میں اپنی رپورٹ مطبوعہ ۲۰۰۰ میں یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ سعودی معاشرے میں غیر مسلم اقلیت کے حقوق محفوظ نہیں ہیں انہیں عوامی سطح پر اپنی مذہبی تقریبات منعقد کرنے اور عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ انسانی حقوق کے علمبردار یہ دلیل لاتے ہیں کہ جب مغرب کی وسعت ظرفی روم کے مقدس شہر میں مسجد کی تعمیر کو گوارہ کرسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان مکہ میں کلیسا کی تعمیر کی اجازت دینے میں تکلف سے کام لیں۔ انسانی حقوق کی امریکی رپورٹ میں بھی جابہ جا اس طرح کے اشارے موجود ہیں کہ روایتی سعودی معاشرہ عورتوں اور بچوں کو ان کے حقوق نہیں دیتا، مذہب کا جبر انہیں ایک آزاد زندگی جینے میں مانع ہے۔ فروری ۲۰۰۱ کی امریکی رپورٹ میں یہ بات فی نفسہ قابل اعتراض بتائی گئی ہے کہ سعودی عرب میں سیاست اور مذہب ایک دوسرے سے خلط ملط ہیں اس کے نتیجے میں مذہبی جبر کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انسانی حقوق کے علمبرداروں کو اس بات پر بھی سخت اعتراض ہے کہ

سعودی معاشرہ اب تک زمانۂ قدیم کے تعزیزی قوانین پر عمل پیرا ہے، وہاں چوروں کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور قرآنی حدود و قصاص پر عمل کیا جاتا ہے۔ مغرب کو حیرت ہے کہ سولہ اور اٹھارہ سال کے بچے بھی اگر جرم میں ملوث پائے جائیں تو انہیں عام بالغ لوگوں کی طرح سزا سنادی جاتی ہے۔ جب کہ مغرب میں سولہ سال سے کم کو بلوغیت میں شمار نہیں کیا جاتا۔ مغرب کو شکایت ہے کہ بلوغیت کا یہ پیمانہ روایتی مسلم معاشروں میں قابل قبول کیوں نہیں ہے۔ نوجوانوں اور عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال ہیں کہ انہیں سماجی طور پر ایسے لباس پہننے کی اجازت نہیں جن کا دلکش اشتہار ٹیلیویژن کے پردۂ سیمیں پر پیش ہوتا ہے۔ عورتیں محدود اور مختصر لباس میں حسن بے پروا کی بے نقابی کے لئے پبلک میں نہیں آسکتیں۔ عبایا کا استعمال مذہبی اور سرکاری طور پر لازم ہے۔ مملکت میں ہم جنس پرستوں اور جادو ٹونے سیکھنے اور سکھانے والے کو موت کی سزا دیا جانا ریکارڈ پر موجود ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں انسانوں کو اپنے طور پر ہوا و ہوس کی زندگی جینے کا اختیار حاصل نہ ہو ایک ایسے معاشرے کے جبر میں پھنسے ہوئے لوگوں کو آزاد کرانا مغرب اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ انسانی حقوق کی مغربی تنظیمیں امریکی ایجنڈے اور امریکی تہذیب کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے لئے شب و روز سرگرم ہیں۔ اس تہذیبی بالادستی کے قائم کرنے کے عمل کو وہ انسانی حقوق کی پاسداری کا نام دیتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ جن خطوط پر مغرب کا اباحیت زدہ بیمار جنسی معاشرہ قائم ہے انہی خطوط پر ساری دنیا میں زندگی جینے کا رواج عام ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی حقوق کی یہ تنظیمیں فی زمانہ انسانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف ایک منظم مدافعت کی شکل میں سامنے آئی ہیں۔ جابر حکومتوں اور فوجی آمروں کو ان تنظیموں کی رپوٹوں پر تشویش رہتی ہے اس اعتبار سے ان سرگرمیوں کو فال نیک بھی سمجھنا چاہئے۔ لیکن جب تک انسانی حقوق کے تصور کا حدود اربعہ طے نہ ہو جائے اور یہ بات پوری طرح صاف نہ ہو جائے کہ انسانی حقوق شرعی حقوق سے متصادم ہیں یا یہ کہ انسانی حقوق کی تحریک سے مسلم معاشرہ کی تہذیبی اقدار کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس وقت تک اس مہم میں ہمارا تعاون تحفظات سے خالی نہیں ہو سکتا۔

✡ ✡ ✡

ے

ایک ہمہ جہتی مکالمہ

غلبۂ اسلام مصنف کی بالکل ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ ۱۹۸۷ء میں جب پہلی بار یہ کتاب شائع ہوئی تھی، اس نے دینی حلقوں میں غلغلہ بپا کر دیا تھا۔ تب سے اب تک پل تلے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ اس عرصے میں شاید ہی کوئی لمحہ ہو گا جب مصنف کے دل و دماغ پر یہ موضوع چھایا نہ رہا ہو۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مصنف کو محض علمی انداز سے اس سوال پر غور کرنے کے بجائے میدان عمل میں متحرک رہنے کی بھی توفیق بخشی۔ ۱۹۹۳ء میں ملی پارلیامنٹ کے قیام اور اس کے بعد پھر کوئی دس سال پر مشتمل سرگرم ہنگامی زندگی ایک ایسا تجربہ تھا جس نے اس سوال کے مختلف عملی پہلوؤں کو ان کے قلب و نظر پر منکشف کر دیا۔ ملکی اور عالمی سطح پر مسلم اہل فکر سے گہرے رابطے، ان کے تجربات و مشاہدات سے استفادہ اور کوئی ایک دہائی کے دوران ہر قابل ذکر مسلم مسئلہ، خواہ وہ ملکی ہو یا عالمی، اس کا راست تجربہ اور قریبی مشاہدہ، خدا کا ایک ایسا خاص فضل تھا جس نے غلبۂ اسلام کی مختلف جہات پر آپ کو غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔ گو کہ ان تمام امور کا ایک علمی بیان 'ادراکِ زوالِ امت' (زیر طبع) میں آیا چاہتا ہے۔ البتہ غلبۂ اسلام کے نئے ایڈیشن کی تیاری کے موقع پر ہم نے ضروری جانا کہ اس اہم مسئلے پر ایک ایسی مجلس منعقد کی جائے جس میں موضوع سے متعلق ان تمام سوالات کا آسان اور عام فہم جواب فراہم کر دیا جائے جو فی زمانہ اہل فکر مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہیں۔ ذیل میں اس ہمہ جہتی مجلس (Round Table) کی روداد ملاحظہ کیجیے۔

عصر حاضر میں غلبۂ اسلام کے امکانات

غلبۂ اسلام کا مفہوم

○ پہلا سوال: تجدد پسند مسلمانوں کے بعض حلقے اور اہل تصوف کے بعض گروہ یہ اعتراض وارد کرتے رہے ہیں کہ غلبۂ اسلام ایک دینی ایجنڈے کے طور پر مطلوب و مقصود نہیں ہے۔ تجدد پسند اگر ایک غیر اسلامی نظام میں دین کو ایک اخلاقی فلسفے کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں تو اہل تصوف اسے ذاتی نجات، خدا اور بندے کا ذاتی رابطہ اور اس پر پڑنے والے اثرات تک محدود بتاتے ہیں پھر غلبۂ اسلام کی اصطلاح سے مسلمانوں کے سیاسی غلبے اور تفوق کا بھی احساس ہوتا ہے جس سے غیر مسلم قوموں کو ایسا لگتا ہے گویا اسلام کے نظریاتی لبادے میں مسلمان اپنے قومی غلبے کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں غلبۂ اسلام ایک دینی ایجنڈے کے طور پر کیوں کر قابل قبول ہو سکتا ہے؟

○ جواب: یہ ساری الجھن اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ مختلف ذہنوں میں غلبۂ اسلام کے مختلف معانی موجود ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں تو یہاں تک کہوں گا کہ مختلف لوگوں نے اسلام کے بھی مختلف مفہوم متعین کر رکھے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں اگر غلبۂ اسلام سے ہر شخص اپنے تعمیر کردہ تصورات مراد لے تو کچھ حرج نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غیر مسلم قوموں کے لئے ہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے لئے بھی اسلام کے وہ معانی متعین کریں جو قرآن مجید کے صفحات سے برآمد ہوتے ہیں۔ ورنہ ہوگا یہ کہ ہم غلبۂ اسلام کے نام پر اپنی خواہشات و تصورات کے غلبے کی راہ ہموار کرتے رہیں گے۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کی ذرا سادہ انداز سے وضاحت کر دی جائے۔

پہلا اور بنیادی سوال تو یہ ہے کہ فی نفسہ اسلام ہے کیا؟ اور یہ کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ ہمارا یہ مقام

نہیں کہ ہم کسی کے ایمان یا کفر کا فیصلہ کرسکیں۔ ماضی میں جن لوگوں نے اس فیصلے کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا انہوں نے اپنے علاوہ ساری دنیا پر کفر کے فتوے صادر کئے ہیں۔ ایک گروہ نے اپنے متعین کردہ پیمانے پر جب دوسرے کے اسلام کی پیمائش کی تو اسے اپنے علاوہ کسی اور کا ایمان لائق اعتبار دکھائی نہ دیا۔ اسلامی تاریخ میں شاید ہی کوئی قابل ذکر عالم، فلسفی، دانشور ایسا گزرا ہو جس پر مختلف اوقات میں ان کے بعض خیالات کے لئے کفر کے فتوے نہ لگائے گئے ہوں۔ یا انہیں **ضال مضل** نہ کہا گیا ہو۔ ہماشما کو تو چھوڑئے جن ائمہ فقہ کی اتباع پر آج امت کے مختلف طبقوں کا اتفاق ہے خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ دوسرے کے ایمان کو ساقط الاعتبار قرار دینے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ حتی کہ امام ابو حنیفہ جن کی فقہ آج ایک تہائی مسلمانوں کے لئے الہامی استناد کا درجہ رکھتی ہے ان کے بارے میں امام مالک کا قول ہے کہ اسلام میں ابو حنیفہ جیسا بد بخت کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ میں اس کے علاوہ اور کوئی خوبی نہ تھی کہ وہ ایک اچھے مناظرہ باز تھے۔ سفیان ثوری نے انہیں **ضال مضل** قرار دیا۔ بقول امام شافعی ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی کتابوں میں دو تہائی باتیں کتاب و سنت کے خلاف ہیں بلکہ سفیان ثوری کے بارے میں تو خطیب بغدادی نے یہاں تک لکھا ہے کہ ابو حنیفہ کی موت پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ "**إن فتان هذه الامة قد مات**" کہ آج امت کو ایک ابتلا سے نجات مل گئی۔

مسلمان کون ہے اور یہ کہ کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے کم از کم شرائط کیا ہو سکتی ہیں یا کسی کے کفر کا فیصلہ کن بنیادوں پر کیا جاسکتا ہے، ان سوالات کو جب فقہاء نے اپنے ہاتھوں میں لیا تو مذہبی انارکی کی صورت حال پیدا ہوگئی اور ہم نے دیکھا کہ کبار فقہاء کا دین بھی محفوظ و مأمون نہیں رہا۔ معاصر تاریخ میں پاکستان بننے کے بعد جب وہاں یہ سوال زیر بحث آیا کہ یہاں کس اسلام کو ریاست کا مذہب بنایا جائے تو ایک بار پھر منیر کمیشن نے اس سوال کا حتمی جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مومن کون ہے؟ اس بارے میں مختلف علماء نے جو جوابات ارسال کئے اس میں سے کسی دو کے جواب بھی یکساں نہ تھے۔ ہر شخص نے اپنی فہم، بصیرت اور ذاتی رجحان کی بنیاد پر مسلمان کی ایک تعریف وضع کر رکھی تھی لیکن حیرت ہوتی ہے کہ تحکیم کی کوشش میں اس سخت ناکامی کے باوجود مسلمانوں کے اربابِ حلّ و عقد نے اس سوال پر کسی غیر روایتی انداز سے غور و فکر کی زحمت نہیں کی۔

ہماری مذہبی تاریخ میں مسلم عقیدے پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بعض کتابیں مختلف فرقوں نے اپنے لئے ترتیب دی ہیں اور بعض کتابوں کو اہل سنت میں عمومی اعتبار حاصل ہے۔ مختلف عہد میں لکھی جانے والی ان کتابوں کا ایک تقابلی مقابلہ بآسانی اس راز سے پردہ اٹھادیتا ہے کہ ہر عہد میں جو مسائل بحث و مباحثہ کا موضوع رہے ہیں، یا جس پر امت میں تفرقے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اسے مختلف گروہوں نے اپنے اپنے انداز سے عقیدے کا جزء باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر عہد شافعی میں سنت قولی کی حجیت نے اتنی ہنگامہ خیز صورت اختیار کرلی کہ اہل علم کے ایک گروہ نے اسے "حکمت" کا مماثل اور 'وحی غیر متلو' باور کرایا۔ دوسری طرف وہ لوگ جو سنت کے اس تصور سے متفق نہ تھے انہیں بشمول ابوحنیفہ، منکرین سنت میں شمار کیا گیا، جس کے لئے دوسری صدی میں اہل الرائے کی اصطلاح عام تھی۔ احمد بن حنبل کے عہد میں خلق قرآن کے مسئلے نے اتنی اہمیت حاصل کرلی کہ اس کی بنیاد پر کفرواسلام کا فیصلہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بہت سے خداترس مسلمانوں کو محض ایک علمی مسئلے پر مختلف رائے رکھنے کی وجہ سے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا، جس کی ایک مثال تو خود احمد ابن حنبل ہیں۔ بعد کے عہد میں علماء نے باضابطہ اسلامی عقیدے کا تفصیلی خاکہ تیار کیا اور یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے لئے توحید ورسالت، کتاب اور آخرت اور وہ امور جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اس کے علاوہ اور کیا ایسی باتیں ہوسکتی ہیں جن کی جزئیات پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ عقیدے کی کتابوں میں بیان ہونے والی تفصیلات نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں بلکہ ان میں بیان ہونے والے مسائل بھی صورت حال کے پیش نظر بدلتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ سوال کہ مسلمان کون ہے؟ عقائد کی کتابوں میں ایک مسئلہ لاینحل بن کر رہ گیا۔

حالانکہ اس بارے میں اگر قرآنی چوکھٹے میں غور وفکر کو کافی سمجھا جاتا تو سرے سے یہ ضرورت نہ ہوتی کہ ہم اہل ایمان پر تحکیم کی ضرورت محسوس کریں۔ جو شخص خود دین کا اقراری ہو اس کے ایمان کی پیمائش کو تو چھوڑیئے قرآن تو اس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ مسلمان اہل کتاب یا دوسرے ادیان کے اصحاب خیر کا احتساب کرنے بیٹھ جائیں اور یہ طے کرنے لگیں کہ کون ناجی ہے اور کون غیر ناجی۔ فیصلے کا یہ کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے وہ کہتا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَ

الصّٰبِئِیْنَ وَ النَّصٰرٰی وَ المَجُوْسَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اِنَّ اللّٰہَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَھِیْدٌ" (الحج:۱۷)

اب آیئے سوال کے پہلے لاحقے کی طرف کہ اسلام ہے کیا؟ اس کے بعد یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ غلبۂ اسلام کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور یہ کہ فی زمانہ غلبۂ اسلام سے کیا صورت حال پیدا ہوگی؟

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام مسلمانوں کا ایک قومی مذہب ہے۔ اور چونکہ اس کی پشت پر آج چودہ صدیوں کی تہذیبی تاریخ موجود ہے جسے اسلام ہی کے توسیعہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے اس لئے غیر مسلم ہی نہیں مسلمانوں کے لئے بھی حقیقی اسلام کا راست ادراک کچھ آسان نہیں۔ گویا ہماری تہذیبی تاریخ حقیقی اسلام کے ادراک میں ایک ایسا حجاب بن گئی ہے جس کے چاک کرنے کا خیال تو کسی کو کیا آئے خود اس حجاب کا شعور بھی کم ہی لوگوں کو ہے۔

آج کم ہی لوگ اس شعور سے آشنا ہیں کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" کی بشارت کے بعد ہماری مذہبی تاریخ میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کی حیثیت ایک تہذیبی تاریخ کی ہے جسے کسی بھی طرح امر قاطع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گویا اسلام کی اصل شکل و صورت آپ ﷺ کے اس عہد میں ہے جہاں پیغمبر کی قیادت میں ایک انسانی مثالی معاشرہ قائم ہوا اور اس کا حتمی تحریری وثیقہ قرآن مجید وجود میں آیا اس کے بعد آگے جو کچھ بھی ہے وہ اہل ایمان کی علمی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ ہے جس کی بنیاد پر نہ تو کوئی عقیدہ وضع کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو یہ اختیار ہے کہ وہ تاریخ کی اپنی تفہیم کی بنیاد پر کسی سے ایمان لے آنے کا مطالبہ کرے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اسلام کو اس کی اصل شکل و صورت میں ملاحظہ کرنا ہو تو اس کے لئے لازم ہوگا کہ ہم تاریخ میں ان چودہ صدیوں کو عبور کرتے ہوئے عہد رسول ﷺ میں واپس جائیں اور وحی کے تحریری وثیقے کو اسی نبوی ماحول میں اپنے دل و دماغ پر متحضر کریں۔ یہ تو رہا حقیقی اسلام کے ادراک کا طریقۂ کار۔

رہا مروجہ اسلام جس سے عام طور پر مسلمانوں کا قومی غلبہ مراد لیا جاتا ہے۔ تو اس کی وجہ در اصل یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیبی تاریخ کو پیغام وحی سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ہماری تہذیبی تاریخ مختلف قسم کی غلطیوں سے پُر ہے۔ کسی بھی انسانی معاشرے میں انحراف فکری اور زوال نظر کے جتنے رنگ و

روپ ہو سکتے ہیں وہ سب ہماری تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ہمارے یہاں جب خلافت نبوی منہج سے ہٹ گئی تو سلاطین و خلفاء کچھ اسی انداز کی سلطنتیں قائم کرنے میں لگ گئے جو عام ملک گیر حکمراں کیا کرتے ہیں اور جن کی مختلف شکل و صورت قیصر و کسریٰ کی حکومتوں میں پائی جاتی تھی۔ اموی حکومت میں غیر عرب قوم ایک طرح کی احساس کمتری لئے جیتی تھی۔ موالی کے ادارے کو ہم خواہ مخواہ کتنا ہی جواز بخشنے کی کوشش کیوں نہ کریں یہ سارا تصور "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" سے انحراف کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ عباسی عہد میں ایرانیوں اور ترکوں نے جب امور حکومت میں غیر معمولی دخل دینا شروع کیا تب بھی خلافت عباسیہ بنیادی طور پر ایک عرب ایمپائر نظر آتی تھی۔ ابن خلدون جو ہمارے یہاں پہلا فلسفی مؤرخ ہے اس نے سقوط بغداد کی ایک اہم وجہ عرب عصبیت کا تحلیل ہونا بتایا ہے۔ بعد کے دنوں میں آل ترک کو عباسیوں کے عرب نژاد خلیفہ کی جو آؤ بھگت کرنا پڑی اس کی وجہ یہی تھی کہ اس عرب علامت کے بغیر اس وقت کے مسلم دل و دماغ میں خلافت کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد کی صدیوں میں جب ترک پوری طرح خلافت پر قابض ہو گئے تو عرب قوموں کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ اجنبی قوموں کی حکمرانی میں آگئے ہیں۔ خلافت کا یہ نیا ترکی ماڈل بھی سلطانی و قہاری کی ایک مسلّم شکل تھی جس کو الٹ پھینکنے کے لئے عرب نیشنلزم کا سہارا لیا گیا۔ خلافت کا یہ ادارہ نبوی ماڈل سے انحراف پر مبنی تھا۔ کچھ یہی حال مغل اور صفوی ریاستوں کا تھا جو اپنی تمام تر شان و شوکت کے باوجود اسلام اور اسلامی طرز حکمرانی کے نمائندہ نہیں کہے جا سکتے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص غلبۂ اسلام سے یہ سمجھتا ہے کہ ہم ماضی کی ان مسلم حکمرانیوں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ اس کی سخت بھول ہے۔ اسلام نہ تو با جبروت حکومتوں کے قیام کے لئے دنیا میں آیا ہے اور نہ ہی کسی بھی قسم کی سلطانی و پیری کو اس کے ساتھ منسلک کرنا قرین انصاف ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت سے ہمیں ہر حال میں انصاف کا دامن تھامنا ہوگا اور دنیا کو یہ بتانا ہوگا کہ ماضی کی یہ ریاستیں نہ تو نبوی اسلام کا نمونہ تھیں اور نہ ہی مستقبل میں اسلام کسی ایسی ریاست کی تعمیر کا کوئی پروگرام رکھتا ہے۔ بلکہ اسلام کو تو ایک ایسی صورتحال مطلوب ہے جہاں ہر شخص کے لئے آزادانہ طور پر خود اپنے آپ کو برتنے، الٰہی ہدایتوں کو خود اس کی روشنی میں سمجھنے اور وحی کے نور سے اپنی شمع کو روشن کرنے کے مواقع میسر آجائیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم پر قطعی یہ ذمہ داری نہیں ڈالی

گئی ہے کہ ہم کسی قوم کی جاہ و حشمت کی بحالی کے لئے کام کریں یا غرناطہ، بغداد یا مغل دہلی کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کریں۔ اس کے برعکس اسلام کو ایک ایسی صورتحال مطلوب ہے جہاں رنگ و نسل، وطن اور مذہب کی شناخت سے پرے نجات و ہدایت اور سکون و انبساط کا ایک عمومی ماحول پیدا ہو۔ یہی وہ صورت حال ہے جسے ہم غلبۂ اسلام سے تعبیر کرتے ہیں اور جسے قرآن میں "وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّه لِلّٰهِ" (انفال:۳۹) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسلام کی نئی تعبیرات

○ دوسرا سوال: اس گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اسلام کو ایک نئے defination کی ضرورت ہوگئی ہے آپ نے تو اس بات پر گفتگو نہیں کی کہ "وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّه لِلّٰهِ" (انفال:۳۹) کی صورت کیسے پیدا ہوگی؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ مجرد تصورات پر گفتگو کر رہے ہیں جن کا عملی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ موجودہ زمانے میں جو لوگ غلبۂ اسلام کے کارواں کو آگے بڑھائیں گے وہ بھی روایتی مسلمان ہوں گے، جبکہ آپ سارے علمی سرمائے پر سوالیہ نشان لگا رہے ہیں تو کیا اس بات کا خطرہ نہیں کہ ہم اس سے کہیں بڑے فکری بحران میں گھر جائیں؟ آخر اسلام کو مسلمانوں سے کیسے الگ کیا جا سکتا ہے؟

○ جواب: میں یہ تو نہیں کہتا کہ اسلام کو کسی نئے defination کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کے برعکس میری دعوت یہ ہے کہ اسلام کو تمام نئے definations سے بچایا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد کی صدیوں میں اسلام کی مختلف انداز سے جو تعبیر یا تعریف کی جاتی رہی ہے اس کو یکسر لپیٹ کر رکھ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم عہد رسول کے اسلام پر اپنی نگاہیں مرکوز کر سکیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام ملی، مذہبی یا فرقہ وارانہ شناخت کا نام نہیں۔ قرآن مجید میں بار بار مختلف انداز سے یہ بحث آئی ہے کہ اللہ کو کسی کی مذہبی شناخت سے کچھ غرض نہیں اور نہ ہی پچھلی قوموں کو کسی مخصوص مذہبی شناخت کے ساتھ بھیجا گیا۔ اللہ کا تو مطالبہ صرف یہ ہے کہ سپردگی اختیار کرو یعنی مسلم بن جاؤ گویا اسلام کوئی مذہبی شناخت نہیں بلکہ غیر مشروط سپردگی کی ایک ایسی

کیفیت کا نام ہے جو اللہ کو اپنے مومن بندوں سے مطلوب ہے۔ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ تمام ہی انبیاء اور صالحین مسلم تھے حتی کہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی خود سپردگی میں ایک منفرد اور عظیم شان کے حامل تھے تو دراصل یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے مومن بندوں سے ابراہیم جیسی خود سپردگی مطلوب ہے اور یہی مسلم بندے کی شان ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نجات کا دارومدار مذہبی شناخت پر ہے، یہودی یا نصرانی ہو جانے میں ہے تو قرآن اس خیال کو غلط بتلاتا ہے:

”وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْداً أَوْ نَصٰرىٰ تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً“ (بقرہ:۱۳۵)

اہل یہود اور متبعین مسیح دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جو لوگ ہماری قوم سے باہر ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں وہ اپنے اسی زعم باطل کی بنیاد پر لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ نجات کے لئے یہ لازم ہے کہ تم ہماری امت میں شامل ہو جاؤ۔ امت یہود یا امت مسیح میں لوگوں کا داخلہ چند رسومات کی ادائیگی کے ذریعہ ممکن تھا۔ عام لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آنا مشکل تھی کہ محض چند بول بولنے یا چند رسومات کی ادائیگی سے آخر اتنا بڑا فرق کیسے پڑ سکتا ہے کہ جس شخص کو اب تک مستحق جہنم بتایا جا رہا ہو اسے جنت کی بشارت ملنے لگے۔ آج بھی جو لوگ محض ”لا الہ الا اللہ“ کہنے اور رسمی طور پر مسلمان بن جانے کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ دراصل پچھلی قوموں کی غلط فہمیوں میں مبتلاء ہیں کہ اللہ کو فقہی شناخت مطلوب نہیں بلکہ اس کے نزدیک تو یہ بات اہم ہے کہ خود سپردگی یا طرز مسلمی میں کون سبقت لے جاتا ہے، ایک ایسی سپردگی جو کامل ہو، غیر مشروط ہو اور جس کے نتیجے میں بندہ صرف اسی کا ہو کر رہ جائے۔

اسلام ایک رویہ ہے یا شناخت

○ تیسرا سوال: ہو سکتا ہے کہ دینی شناخت مقصود و مطلوب نہ ہو اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ محض زبان سے اقراری مسلمانوں نے آج تک تاریخ میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ محض چند کلمات کی ادائیگی کسی شخص کے لئے وجہ نجات بن جائے جب کہ اس کے پیچھے عمل کی کوئی قوت موجود نہ ہو، اللہ کی سنت اور اس کے انصاف کے خلاف ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ دعوت حق کے نتیجے میں ایک ملی شناخت تو بہر حال وجود میں آئے گی،

ایک حد فاصل کھنچ جائے گی جو مومن اور کافر کا فیصلہ کر سکے۔ پھر اس نئی امت کا کوئی نام بھی ہو گا، ایک طرز زندگی اور تہذیب بھی ہو گی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرے گی، ایسی صورت میں یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ مسلمان ایک ملی شناخت کے بجائے محض عبودیت کے ایک رویے کا نام ہے ؟

○ جواب: اس میں شبہ نہیں کہ شناخت کے لئے ناموں کا استعمال روز ازل سے انسانی تاریخ میں ایک معروف عمل ہے۔ البتہ یہ انفرادی، قومی یا ملی شناخت فی نفسہ وجہ امتیاز بن جائے اور اس کی بنیاد پر دنیا و آخرت میں مراتب عطا ہو جائیں، قرآن اس خیال کی سخت نکیر کرتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ اکرام و فضیلت کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ ہے اور یہ کہ اگر انسانوں کو مختلف شعوب و قبائل میں پیدا کیا گیا ہے، مختلف رنگ و نسل اور وطنی نسبت سے انسان جانے جاتے ہیں تو ایسا صرف اس لئے ہے تاکہ لوگوں کو باہمی تعارف میں آسانی رہے۔ انسان کو اپنی شناخت کے لئے کوئی نہ کوئی حوالہ، کوئی نہ کوئی نام تو یقیناً چاہیئے۔ البتہ ان شناخت کی حیثیت ضمنی ہے اس کے حصول میں انسان کو چونکہ خود کو کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ محض ان تعارفی حوالوں کو باعث افتخار یا باعث ذلت سمجھا جائے۔

رہی مذہبی شناخت کی بات تو یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ مذہب کی تاریخ میں جتنے بھی انبیاء آئے انہوں نے اپنی امت کو نہ تو کوئی نیا نام دینے کی کوشش کی اور نہ ہی دنیا کے اکثر مذاہب کی تاریخ میں کسی مخصوص مذہب کے حاملین کے لئے کوئی خاص لفظ پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اہل یہود ہی کو لیجئے متبعین انبیاء بنی اسرائیل کے لئے یہودی کا لفظ ایک اجنبی اصطلاح ہے جس کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ معبد کے دوسرے انہدام تک اہل یہود کی ملی شناخت کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ حضرت مسیح جن کی حیثیت بنیادی طور پر بنی اسرائیل کے ہی ایک نبی کی ہے اور جو علی الاعلان بائبل میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو اکٹھی کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ ان کی دعوت میں اس بات کا عندیہ بھی نہیں ملتا کہ وہ ملت ابراہیمی یا ملت موسوی سے الگ کوئی امت تشکیل دینا چاہتے ہوں۔ وہ بنیادی طور پر بنی اسرائیل کو ان کے ایجاد کردہ فقہی اسلام سے نجات دلانے کے لئے آئے تھے۔ یہودی علماء و فقہاء پر حضرت مسیح کی سخت ترین تنقید جو متی کی بائبل میں موجود ہے اس بات کا صاف صاف اعلان ہے کہ اخروی نجات، مذہبی شناخت و رسوم اور بے جان

عبودیت کو اپنانے میں ہرگز نہیں۔ ایسے علماء و فقہاء کو حضرت مسیح جنت کی راہ میں ایک مزاحمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس یہ ایک انتہائی حیرت انگیز اور افسوس ناک بات ہے کہ آج دنیا کی سب سے بڑی آبادی خود کو مختلف رنگ و روپ کا عیسائی کہتی ہے اور اسے اس شناخت پر اصرار ہے۔ حضرت مسیح جو جامد عقائد اور تراشیدہ مذہب سے نجات کے داعی تھے خود ان کے نام لیوا آج ایک ایسے جمود ذہنی کا ثبوت دے رہے ہیں جس کی کوئی نظیر بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ اب ان کا عقیدہ ہے کہ مسیح نے اپنے تمام نام لیواؤں کے لئے گناہوں کا یک مشت کفارہ ادا کر دیا ہے۔ لہٰذا نجات کے لئے اب یہ کافی ہے کہ انسان خود کو ان کے خیمے سے وابستہ کر دے۔ مذہب کی تاریخ میں اس سے بڑی اور حیرت انگیز بات کیا ہوسکتی ہے کہ جو شخص بے جا رسوم اور جامد فقہ کے خاتمے کے لئے آیا تھا آج خود اسی کی ذات ایک جامد مذہبی رویے کا حوالہ بن کر رہ گئی ہے۔

دنیا کے جس کسی قدیم مذہب کو لیجئے وہاں آپ کو اس مذہب کے ماننے والوں کا کوئی ایسا نام نظر نہ آئے گا جس کی بنیاد آسمانی وثیقے میں تلاش کی جاسکتی ہو۔ مثال کے طور پر ہندو مت یا بدھ مت کو لیجئے ہندو کا لفظ اہل ہند کی مذہبی شناخت کے لئے محمد غوری کے ہندوستان پر حملے سے پہلے نہیں ملتی اور بدھ مت تو مہاتما بدھ کے شاگردوں کا عطا کردہ تشخص ہے۔ نہ تو مہاتما بدھ کوئی نیا مذہب ایجاد کرنے کے لئے آئے تھے اور نہ ہی سناتن دھرم کی تعلیمات اس دھرم سے مختلف ہوسکتی ہیں جس کے حاملین مختلف ملکوں میں، مختلف وقتوں میں آتے رہے۔ خود قرآن مجید مذہبی فکر میں آنے والے زوال کی تاریخ پر اسی انداز سے تبصرہ کرتا ہے "إِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَ أَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ"

اس بات کو تو اصولی طور پر سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا میں پہلے نبی کی بعثت کے بعد سے محمد رسول اللہ کی آمد تک الوہی ہدایت کی شکل میں مختلف انبیاء جو کچھ لیکر آئے وہ ایک ہی دعوت تھی جس کا مقصد بندوں کو غیر مشروط عبودیت کا فن سکھانا تھا۔ "حَنِيفاً مُّسْلِماً" بننے کی دعوت دینی تھی اور اس اعتبار سے اہل حق کا یہ گروہ جو مختلف نبیوں کی قیادت میں تاریخ کے مختلف ادوار میں سرگرم رہا ہے دراصل ایک ہی امت ہے جس کا طرۂ امتیاز دین خالص کی دعوت ہے۔ البتہ تاریخ کے آخری لمحے تک ہدایت کی اس مشن کو روشن رکھنے کے فریضے پر مأمور ہیں۔ لیکن آپ کے اس خصوصی امتیاز کے باوجود خود آپ کی ذات

سے کوئی نئی امت وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ کار محمدی بنیادی طور پر اسی پرانی امت یا امتِ اہل حق کے احیاء کی ایک کوشش ہے۔ محمد ﷺ کے گرد جمع ہونے والے اہل ایمان کوئی اور نہیں بلکہ "مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْم" کا ایک حصہ ہیں۔ وہی ابوالانبیاء ابراہیم جن کی شخصیت میں عیسائی، یہودی اور محمدی تمام شناخت ضم ہو جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمیں اس بات کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ آپ ﷺ کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کو کوئی نئی ملی شناخت عطا کی گئی ہو۔ مسلمانوں کو محمدی کہنا یا محمڈن کے لقب سے یاد کرنا نو آبادیاتی عہد کی دین ہے جب مغربی مفکرین عیسائیت کی طرح ہی آخری پیغام کے حاملین کو ان کے نبی کے حوالے سے شناخت عطا کرنا کافی سمجھتے تھے۔ ورنہ قرآن تو اس بات کا داعی ہے کہ محمد ﷺ کسی نئے پیغام کے داعی نہیں اور نہ ہی وہ اچانک تاریخ کے مرحلے میں اپنی ایک نئی امت تشکیل دینا چاہتے ہیں بلکہ وہ صدیوں پر مشتمل ایک انبیائی تسلسل کا نقطہ انتہا ہیں۔ وہ ابراہیمی روایت کے امین ہیں اور اہل حق کے اسی طریقے کو زندہ و تابندہ دیکھنا چاہتے ہیں جو ابوالانبیاء ابراہیم کا شعار ہے۔

بعض لوگوں کو "هُوَ سَمَّاکُم الْمُسْلِمِیْنَ" کے بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اہل حق کو مسلمانوں کے نام سے پکارنا چاہتا ہے یا یہ کہ دوسری مذہبی شناختوں کے مقابلے میں خود کو مسلمان کہلوانے والے اسے زیادہ پسند ہیں۔ حالانکہ یہ آیت فقہی شناختوں اور گروہی عصبیتوں کے خلاف وارد ہوئی، یہاں بھی مسلمین سے مراد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ طاعت گزاروں کا ایک ایسا گروہ جسے دینی شناخت اور فقہی عبودیت کے بجائے کامل سپردگی پر اصرار ہو۔ قرآن مجید کے صفحات مختلف اسلوب میں اس حقیقت کو ذہن نشین کراتے ہیں کہ دین، مذہبی گروہوں سے وابستگی، عیسوی، موسوی یا محمدی امت میں شمولیت کا نام نہیں بلکہ دین تو یہ ہے کہ مومن صرف اور صرف اللہ کا ہو کر رہ جائے، اس کے رنگ میں رنگ جائے کہ قرآن کا مطالبہ ہے "صِبْغَةُ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَة"۔ رہی یہ بات کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحق و یعقوب یا دوسرے انبیاء اہل حق یہودی تھے یا نصرانی یا کسی قومی شناخت سے ان کی وابستگی تھی تو اس خیال کی قرآن سخت نکیر کرتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے "قُلْ أ أَنْتُمْ اَعْلَم اَمِ اللّٰهُ" اے نبی کہ دو کہہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ گویا قرآن اس بات کا سرے سے قائل نہیں کہ انبیاء اہل حق کو کسی نسلی یا ثقافتی گروہ کے ساتھ مخصوص کیا جائے۔ انہیں بھلا یہودی یا عیسائی جیسی شناخت سے کیا

مطلب؟ وہ تو بس طاعت گزاروں میں سے تھے، "حَنِيفاً مُسْلِماً" تھے، لہٰذا ان کے متبعین کی بھی اس کے علاوہ اور کوئی شناخت نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے آپ کو طاعت گزاروں میں شامل کریں۔ طاعت گزاروں کا یہ پورا حلقہ ابراہیم سے لیکر محمد تک اور ابراہیم سے پہلے بھی، ایک امت میں شامل ہے۔ نہ تو ان کے متبعین میں فرق کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کے انبیاء میں۔ قرآن اگر ایک طرف "لا نفرق بين احد من رسله" کی تلقین کرتا ہے تو دوسری طرف امت محمدی سے باہر ساجدین اور ذاکرین کے لئے کلمہ خیر کہنے میں بھی بخالت سے کام نہیں لیتا "لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُوْنَ آيٰتِ اللّٰهِ آنَآءَ الَّيلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ" (آل عمران: ۱۱۳)

دین خالص بنام مذاہبِ فقہ

○ چوتھا سوال: اگر یہ ساری امتیں ایک ہیں اور آپ کے بقول اگر رسول اللہ ﷺ کوئی نئی امت کی تشکیل کے لئے نہیں آئے تھے تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ مسلمانوں کو خود اسی ملت ابراہیمی کے خلاف جنگ کرنی پڑی اور اس طرح بظاہر ملت ابراہیمی کے احیاء کی دعوت کے باوجود یہود و نصاری نے انہیں اپنی ملت میں قبول نہیں کیا اور ان کی ایک الگ شناخت بن گئی؟

○ جواب: رسول اللہ کی مخالفت اہل یہود کے دانشوروں کی طرف سے جس شدت کے ساتھ ہوئی یہ ایک فطری اور متوقع عمل تھا۔ اہل یہود جنہوں نے دین کو رسومات اور فقہ میں محدود کر دیا تھا اور جن کی مذہبی زندگی پر فقہاء قابض ہو چکے تھے، ان کے یہاں نجات کے لئے بڑے سستے اور آسان فارمولے رائج تھے۔ مثلاً اس قسم کے خیالات عام تھے کہ جس کسی نے چار مربع فٹ عرض فلسطین میں چل پھر لیا اس کے لئے نجات یقینی ہوگئی۔ بعض لوگوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ کسی مختون یہودی کو جہنم کی آگ نہیں چھوسکتی اور بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس کسی نے اہل یہود کے بزرگوں کا نام عزت سے لیا اس کے لئے بھی جنت مقدر ہوگئی۔ اس کے علاوہ تورات کی برکت کا طلسم مذہبی حلقوں میں عام تھا۔ دنیا و آخرت میں نجات کے لئے مختلف طریقے رائج تھے۔ مختلف بزرگوں سے منسوب پر تاثیر دعائیں چشم زدن میں بگڑی بنا سکتی تھی۔ نقوش اور وفق پر مشتمل ایک پیچیدہ کاروبار مذہبی حلقوں میں خاصا مقبول تھا جس

کے بارے میں عام عقیدہ تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے خود فرشتوں کو سکھایا۔ کہا گیا کہ اللہ نے طورِ سیناء پر موسیٰ کو بزبانی بعض اسرار و رموز بتائے، اور یہ کہ داؤد و سلیمان بھی اس فن سے واقف تھے جو سینہ بسینہ ان تک منتقل ہوا ہے۔ اہل یہود کی اس اوہام پرست مذہبی زندگی میں دین ابراہیمی کی دعوت ایک اجنبی دعوت کی حیثیت سے دیکھی گئی۔ اہل یہود کے علماء جن کا تمام تر دین اب سینہ بسینہ منتقل ہونے والے اوہام و خرافات پر مشتمل تھا ان کے لئے طریقۂ آباء کو ترک کرنا ممکن نہ ہوا۔ حصول جنت کے سستے اور آسان نسخے کے مقابلے میں کامل سپردگی کا مطالبہ ایک مشکل اور اجنبی دین کے طور پر دیکھا گیا۔ اہل یہود کی بڑی اکثریت نے اسی میں عافیت جانی کہ وہ خود کو روایتی مذہب کے خول میں بند رکھیں اور اسی طریقے سے اپنی نجات کو وابستہ سمجھیں۔

دیکھا جائے تو کچھ یہی صورت حال حضرت مسیح کے ساتھ بھی پیش آئی تھی جو ایک یہودی خانوادے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی قوم کے لئے قابل قبول نہ ہو سکے۔ معبد میں حضرت مسیح کی آمد کو ایک خطرے کے طور پر دیکھا گیا اور ان کی وہ تمام تبلیغی مساعی جو زوال زدہ یہودی فکر کو راہ راست پر لانے کے لئے کی جا رہی تھی اسے یہودیت کے خلاف ایک خطرہ تصور کیا گیا۔ ابراہیم واسحٰق کے نام لیوا ایک ایسے برگزیدہ پیغمبر کے دشمن بن گئے جو ملت ابراہیمی کی احیاء کے لئے آیا تھا۔

مذہبی تاریخ کے مطالعے میں ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ خالص عبودیت کو ہمیشہ روایتی مذہب پرستی سے لوہا لینا پڑا ہے۔ انبیاء کی تاریخ میں یہ چیز بہت واضح نظر آتی ہے کہ خود کو اطاعت گزار کہنے والے گروہ کے پاس جب دعوت حق اپنی اصل شکل میں آئی تو وہ اس کے لئے قابل قبول نہ ہو سکی۔ ایسا اس لئے کہ عبودیت جب فقہ کی سطح پر جلوہ گر ہوتی ہے، جب فقہاء اور احبار و رہبان کی تعبیرات وحی پر حاوی ہو جاتی ہے اور انہیں تعبیرات کو دین سمجھ لیا جاتا ہے تو اس طریقۂ آباء کے خلاف ہمیشہ اور ہر زمانے میں خالص عبودیت کے حاملین کو نبرد آزما ہونا پڑتا ہے ورنہ خالص عبودیت کی یہ شان نہیں کہ وہ مختلف ناموں یا مختلف شناخت کی بنیاد پر باہم آپس میں ٹکراتی رہے۔

مختلف مذہبوں کی باہمی چپقلش کو تو چھوڑیئے آج خود امت محمدیہ کے اندر مختلف گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں یا ایک دوسرے کی عزت اور خون مباح سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ

ان گروہوں نے فقہی رسوم کو دین سمجھ رکھا ہے اور مختلف تاریخی اور تعبیری مآخذ پر بننے والے فہم دین کو نص کی حیثیت دے دی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے جان عبودیت اور ظاہر پرستی اسلام کے نام پر باہم برسرپیکار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم گروہی، مسلکی شناخت کی سنگینی کو محسوس کریں جس کا قیام مانند شرک ہے۔ بھلا جو قرآن امت محمدی کی چھوٹی شناخت کے بجائے ملت ابراہیمی کی بڑی شناخت پر اصرار کرتا ہو وہ اس بات کی کب اجازت دے سکتا ہے کہ اہل حق کے گروہ میں غیر نبی کے حوالے سے سنّی، شیعہ، حنفی، شافعی، نقشبندی، قادری جیسی نسبتیں وجود میں آجائیں۔

قرآن مجید جہاں اسوۂ رسول ﷺ کو اہل ایمان کے لئے ایک model کے طور پر پیش کرتا ہے وہاں دوسری طرف امت محمد یہ یا اس قسم کی کسی گروہی شناخت کی بات نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس کا سارا زور دین ابراہیمی کی تجدید پر ہے۔ محمد ﷺ کی ذات پر غیر معمولی اصرار، انہیں وجہ کائنات بنا کر پیش کرنا "لولاك لما خلقت الأفلاك" جیسے غلو آمیز خیالات غالی صوفیوں نے بعد کے عہد میں رائج کئے ہیں۔ بلکہ تصوف کی دنیا میں تو نور محمدی یا حقیقت محمدی خود ذات باری تعالیٰ کا ہی ایک دوسرا نام ہے۔ اس قسم کی شاعری بھی صوفی حلقوں میں خاصی مقبول رہی ہے جس میں احد اور احمد کا فرق یکسر مٹ کر رہ گیا ہے۔ اس قسم کی غلو فکری نے ہماری فکر کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کی طرف نشاندہی کا یہ موقع نہیں ابھی ہم صرف اتنی بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کارِ نبوت کو جہاں انبیائی سلسلے کی تکمیل کے طور پر دیکھا جاتا ہے وہیں اسے اس روایت کے تسلسل اور امین کے طور پر بھی دیکھا جانا چاہیئے۔ ایک ایسا رسول جس کی دعوت اور تحریک میں سلسلۂ براہیمی کا ارتکاز اور انعکاس ہے اور اس اعتبار سے رہتی دنیا تک اہل حق کا گروہ خواہ وہ کسی بھی نام سے کسی بھی علاقے میں پایا جاتا ہو اس کا تعلق اسی ملت ابراہیمی سے ہوگا۔ بنیادی طور پر دنیا ہمیشہ سے کفر اور اسلام کے خانوں میں بٹی رہی ہے۔ انبیاء کی دعوت کے نتیجے میں ان دو گروہوں کے درمیان حد فاصل بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ آج بھی جب حاملین قرآن اس دعوت حق کے ساتھ میدان میں آئیں گے تو انھیں محسوس ہوگا کہ خود روایتی مسلم خیموں کے اندر اس دعوت کی مخالفت ہو رہی ہے جب کہ اس خیمے کے باہر بہت سے نفوس اس دعوت حق پر کھنچے چلے آتے ہیں گویا وہ لوگ جو اپنا شمار "حَنِیفاً مُسلِماً" میں کروائیں، جو حق کی حمایت

میں اپنا سب کچھ لیکر سامنے آجائیں ضروری نہیں کہ ایسے لوگ صرف روایتی مسلم خیمے سے سامنے آئیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غلبۂ اسلام کی اس عالمگیر جد و جہد میں ایسے تمام لوگوں کو ساتھ لیا جائے اور انہیں خوش آمدید کہا جائے جن کے اقوال واعمال "اَسْلَمْنَا" کی گواہی دے رہے ہوں۔

طاعت گزاروں کا عالمی محاذ

○ پانچواں سوال: اسلمنا کے حاملین اپنا متحدہ محاذ کیسے قائم کرسکتے ہیں؟ اس کی دینی بنیاد کیا ہوگی؟

○ جواب: اسلام بحیثیت دین ایک عالمی تحریک ہے اور رسول اللہ کی حیثیت ایک ایسے عالمی پیغمبر کی ہے جن کا مشن ان کے متبعین کے ہاتھوں جب تکمیل کے مرحلے پر پہنچے گا تو یہ دنیا امن و سکون اور غیر مشروط سپردگی کا گہوارہ بن جائے گی۔ رسول اللہ کو محض نبی عربی کی حیثیت سے دیکھنا نہ تو آپ ﷺ کے منصب کے شایان شان ہے اور نہ ہی اس عالمی پیغمبر اور اس پر نازل ہونے والی وحی کی صحیح تفہیم ہے۔ ایک عالمی منصوبے کے لئے آنے والا پیغمبر اور اس کے متبعین قومی اور علاقائی انداز سے نہیں سوچ سکتے ورنہ ان کا یہ مشن ایک cult میں محصور ہوکر رہ جائے گا۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں۔ قرآن مجید کا یہ اصرار کہ محمد رسول اللہ ﷺ دین براہیمی کے علمبردار ہیں اور آپ ﷺ کی حیثیت اپنے عہد میں تمام اہل حق کے سردار کی ہے خواہ وہ کسی بھی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا ہو یا اس کا کچھ بھی background ہو۔ رنگ و نسل، علاقائی نسبتیں کلمۂ حق کے راستے میں اپنا اعتبار کھو دیتے ہیں۔ آج بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے متبعین جن پر تمام دنیا کے اہل حق کی امامت کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اصولی طور پر انہیں ان تمام لوگوں کی قیادت کرنی ہے جو ظلم، شرک اور دوسری خباثتوں سے برسر پیکار ہیں اور جو اپنے قول و عمل سے ہر لحہ کسی نہ کسی درجے میں اسلمنا کی گواہی دے رہے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کے لئے جنہوں نے حق کو کسی نہ کسی شکل میں سمجھا ہے یا جو خود کو اہل حق کے گروہ سے وابستہ سمجھتے ہیں خواہ ان کی یہ طلب ناقص ہو یا وہ طلب حق کی راہ میں مختلف مغالطوں کا شکار ہوں۔ اگر وہ ظلم کے خلاف اپنے قول و فعل سے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ ظالموں کے خیمے میں نہیں ہیں تو ایسی صورت میں انہیں ان لوگوں میں شمار کیا جائے گا جن کا

تعاون اسلمنا کے خیمے کو مضبوط کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی واضح بنیاد موجود ہے "یٰٓاَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ" ہمارے لئے اسلمنا کے حاملین کو جمع کرنے اور ان کی قوتوں کو channel کرنے کی ایک نظری بنیاد فراہم کرتا ہے۔ آج جو لوگ عالمی نظامِ جبر کے خلاف مختلف انداز سے صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں خواہ وہ دنیا کے کسی بھی معاشرے میں پائے جاتے ہوں اور خواہ وہ کسی بھی مذہبی سلسلے میں پیدا ہو گئے ہوں ہمیں ان سے رابطہ پیدا کرنے، ان کی قوتوں کو مستعار لینے اور اُسے ایک پُر امن دنیا کی تعمیر میں استعمال کرنے میں کسی تکلف یا جھجک کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئیے۔ آج دنیا میں Globalization کے زیر اثر جس طرح چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز ہوتا جا رہا ہے، آزاد منڈی پر جس طرح بین الملکی کمپنیوں نے قبضہ کر لیا ہے، ذرائع ابلاغ کا نامحسوس جبر کہ وہ جس طرح چاہتا ہے ہم اسی طرح دنیا کو دیکھنے پر مجبور ہیں، ایک ایسی سنگین صورتحال ہے جس نے مشرق و مغرب ہر جگہ خدا ترس انسانوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ لوگ جن کے دل دوسروں کے دکھ درد پر روتے ہیں، جو انسانوں کی ہلاکت پر بے چین ہو جاتے ہیں اور جو نئے استعمار کی استحصالی، معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر خود اس تہذیب کے اندر رہنے کے باوجود اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد مغربی معاشرے میں موجود ہے۔ جی ہاں وہی مغربی معاشرہ جس کے بارے میں ہمارے یہاں یہ تصور عام ہے کہ وہاں کا معاشرہ مادے کے دلدل میں دفن ہو چکا ہے اور یہ کہ اس پیٹو سماج یا Consumer Society میں اب کوئی انسانی جذبات و احساسات باقی نہیں بچے ہیں۔ وہی مغرب جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں جنسی انارکی نے سب کچھ تباہ کر ڈالا ہے۔ ناآسودہ روحیں حیوانی شہوتوں میں دم توڑ چکی ہیں۔ اسی مغرب کی ایک تصویر یہ بھی ہے کہ وہاں جنگ، استحصال، غربت اور ہتھیاروں کے خلاف لاکھوں کا مجمع اُمڈ آتا ہے۔ ایسے سعید انسانوں کی کمی نہیں جو اپنی ہی حکومتوں کے استحصالی نظام کو شکست دینے اور تیسری دنیا کو ان کے استحصال سے نجات دلانے کے لئے شب و روز سرگرم ہیں۔ مغرب میں امن، سلامتی، عدم تشدد، حقوق انسانی جیسے ناموں سے بعض لوگ تو یقیناً سیاست کر رہے ہیں البتہ ان ہی حوالوں سے وابستہ ایک بڑا حلقہ صدق دل سے یہ چاہتا ہے کہ دنیا پر امن و سلامتی کی صبح طلوع ہو ایک ایسا عالمی نظام تشکیل پائے جہاں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر

معاشرے کا فرق مٹ جائے۔ اس مقصد کی خاطر بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں بھی قربانیاں دی ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ ایسے لوگ خود کو مسلم تو نہیں کہتے کہ ان کے نزدیک مسلم نام ہے ایک فرقے کا۔ البتہ وہ یہ کہنے کی بھی جسارت نہیں کر سکتے کہ وہ خدا کے نافرمانوں میں ہیں۔ **لسنا بمسلم** W.C.Smith جو بیسویں صدی کے ایک متبحر عیسائی عالم تھے اور جنہوں نے اسلام پر بعض فکر انگیز کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں انگریزی میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ I am not a Mualim کہ تب مسلم سے مراد ایک قوم ہوتی ہے۔ البتہ میں عربی زبان میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ "لَسْتُ بِمُسْلِمٍ"۔ میں ایک خدا کا ماننے والا اور اپنے فہم و بصیرت کے مطابق اس کی تابعداری کرنے والا ہوں بھلا میں یہ کیسے کہہ سکتا کہ میں اطاعت گزاروں میں نہیں۔ آج بھی مشرق و مغرب میں وہ تمام سعید روحیں جو اپنے قول و عمل سے اسلمنا کی گواہی دے رہی ہیں اگر خود کو مسلمانوں سے الگ اور مختلف سمجھتی ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی نظر میں اسلام نام ہے ایک قومی تشخص کا۔ اور بھلا کسی قومی تشخص میں کسی دوسری قوم کے لئے کیا دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر اسلام کو عبودیت کے ایک رویے کے طور پیش کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ آخری وحی کے حاملین پر لازم ہے کہ وہ عالمی سطح پر ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جہاں ظلم و ناانصافی، استحصال اور شرک کا مکمل صفایا ہو جائے، نہ کسی کا روحانی استحصال ہو اور نہ ہی معاشی یا سیاسی استحصال کے لئے کوئی گنجائش باقی رہے۔ گویا ہر فرد کے لئے اس کی جائز آرزؤں کو برتنے، اس کی صلاحیت اور شخصیت کو نشو و نما دینے کا یکساں موقع فراہم ہو، بندوں کی گردنوں میں اپنے ہی جیسے کسی بندے کی معاشی، سیاسی، سماجی یا روحانی غلامی کا کوئی طوق نہ پایا جائے اور تمام ہی انسان بہ تمام کمال صرف ایک رب کی بندگی بجالائیں۔ امن و سلامتی کے جس بین الاقوامی ایجنڈے میں آج مغرب کی نا آسودہ روحوں کو ایک خوشگوار مستقبل نظر آرہا ہے، یہ دراصل بنیادی طور پر شرک کے paradigm سے نجات اور توحیدی paradigm میں داخلے کی ایک کوشش ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلمنا کے ان حاملین کو قرآنی منشور سے آگاہ کریں۔ ہماری توجہ اس بات پر مرکوز اور محصور نہ ہو کہ ان میں سے کتنے لوگ فقہی طور پر ہمارے خیمے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ہماری توجہ کا مرکز تو یہ ہونا چاہئے کہ عالمی نظامِ عدل کے قیام میں ہم ایک

ایسی وسعتِ قلبی اور ژرف بینی کا مظاہرہ کیسے کریں کہ اس طرح کی تمام سعید روحیں غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو ہماری جد و جہد سے وابستہ محسوس کریں۔

مستقبل کا عالمی نظام عدل اور موجودہ فقہی مسلمان

○ چھٹا سوال: توکیا آپ کے خیال میں مستقبل کا عالمی نظامِ عدل موجودہ فقہی مسلمانوں کے تہذیبی اثرات سے یکسر آزاد ہوگا۔ یا یہ سب کچھ موجودہ امت محمدیہ کی قیادت ہی میں انجام پانا ہے۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلمنا کے حاملین کے لئے صلائے عام بلند کی جائے گی تو اس میں دوسری تہذیبوں اور مذہبی گروہوں کی شمولیت کے باعث خلافت کے سابقہ ڈھانچے کو کیسے برقرار رکھا جاسکے گا؟

○ جواب: مسلمانوں کے لئے اپنے عہد زوال میں یہ بات تسلیم کرنا انتہائی مشکل ہو رہی ہے کہ دنیا کی قیادت پھر سے سنبھالنے کے لئے انہیں اپنے تعمیر کردہ فقہی خول اور قومی شناخت سے باہر آنا ہوگا۔ ہم نے چونکہ بالعموم فقہ کو ہی دین سمجھ رکھا ہے اور اس سے کسی طرح دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ایک پریشان کن سوال ہے کہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق قرآن مجید سے ہدایت اخذ کرسکیں۔ چونکہ ہمارا تصور دین قومی، گروہی اور مسلکی شناخت میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اس نکتے کا سمجھنا مشکل ہو رہا ہے کہ اسلام، مسلم قوم کے عروج، اس کے سیاسی جاہ و حشم یا اس کی مادی خوشحالی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ خالق کائنات کا ارسال کردہ ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جو تمام ہی انسانوں کی نجات اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے آیا ہے۔ اصل مقصود و مطلوب یہ ہے کہ دنیا امن و سلامتی کی ایک ایسی فضا سے دوچار ہو جسے توحید خالص پر مبنی معاشرہ کہا جاسکے۔ ایک ایسے مثالی ماحول کی تعمیر میں جہاں تمام انسانوں کے لئے اپنے آپ کو برتنے اور عبودیت کے جملہ ابعاد کا ادراک اور اس سے انبساط ممکن ہو، ایک ایسا نقشہ کار ہے جس میں کسی مخصوص تہذیب نسلی یا لسانی اکائیاں اپنی معنویت کھو دیتی ہیں۔ مستقبل کا معاشرہ جو ایک عالمی پیغمبر کے متبعین کے ہاتھوں برپا ہونے کی وجہ سے اپنے اندر آفاقیت کا رنگ لئے ہوگا۔ وہاں عرب و عجم، سیاہ و سفید کی تمیز یکسر مٹ جائے گی۔ حتی کہ ان لوگوں کو بھی محض اس وجہ سے کوئی فوقیت حاصل نہ ہوگی جو آج روایتی طور پر عربی زبان اور عرب قومیت کی وجہ سے خود کو رسول

اللہ ﷺ کا بہتر وارث سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ عربی زبان، عربی تہذیب اور عرب عادات کی اہمیت صرف اتنی ہے اس قالب کو وحی کی جملہ ابعاد کو برتنے کے لئے استعمال کیا گیا ورنہ اللہ تعالیٰ عرب تہذیب یا زبان کی طرف کوئی جانب دارانہ رویہ نہیں رکھتا۔ کہ اس سے پہلے خود قرآن کے بیان کے مطابق مختلف خطوں سے انبیاء اٹھائے گئے اور مختلف زبانوں میں آسمانی ہدایت کا نزول ہوا۔ تورات و انجیل اور دوسرے آسمانی صحائف جسے قرآن ہدایت اور روشنی سے تعبیر کرتا ہے غیر عربی زبانوں میں نازل کی گئیں۔ اس لئے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ مستقبل کا عالمی نظامِ عدل یا اسلامی معاشرہ عرب تہذیب کا caricature ہو گا۔ ماضی میں ہمارے بعض اہل فکر اس قسم کی غلط فہمی میں یقیناً مبتلا رہے ہیں کہ انہوں نے عرب تہذیب کو اسلام یا اسلامی تہذیب کا ہم معنی سمجھا ہے۔ وہ یہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ عرب تہذیب کے اندر ہمیشہ سے غیر مسلم قومیں اپنی مذہبی، ملی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ خود اس تہذیب کے اندرون سے مداخلت کرتی رہی ہیں۔ آج بھی بلاد الشام اور مصر میں عرب نصرانیوں کی ایک قابل ذکر آبادی موجود ہے۔ اس کے علاوہ دروز اور عرب یہودیوں کو بھی اپنی علیٰحدہ شناخت پر اصرار ہے اس لئے عرب اور مسلم لفظ کو ہم معنی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

یہ خیال کہ مسلمانوں کو عرب تہذیب یا عادات کی اتباع کرنی چاہئے غیر عرب ممالک میں اس لئے بھی عام ہو گیا کہ تبدیلیٔ مذہب کے مرحلے سے گزرنے والی قومیں بالعموم داعی قوموں کو ماڈل کے طور پر اپنانے میں سہولت محسوس کرتی ہیں۔ ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ نئی ایمانی شناخت کو نمایاں کرنے کے لئے اپنے سابقہ تہذیبی ماڈل سے نکلنا اور یہ باور کرانا کہ اب ہم پچھلے تہذیبی دائروں سے باہر ہو گئے ہیں، بالعموم ایک دشوار گذار نفسیاتی عمل ہے۔ اس دشواری کو تہذیب کے ظاہری مظاہر کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ابتدائی عہد میں جب کوئی شخص ایمان لے آتا تھا تو بظاہر اس کی شکل و صورت، رنگ و روپ اور لباس سے اس تبدیلی کا سمجھنا ممکن نہ تھا کہ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" جس قسم کی عرب تہذیب کو اپنے لباس یا ظاہری شناخت سے ظاہر کر رہے تھے۔ کفار قریش لباس یا مظاہر کی حد تک کچھ اس سے بہت مختلف نہ تھے۔ البتہ ایک ایمان تھا جس نے اصحاب نبی کے دلوں میں داخل ہو کر ان کے تصور حیات کو یکسر بدل دیا تھا۔ ابتدائی عہد میں ہمیں اس طرح کے واقعات نہیں ملتے کہ

کسی غیر عرب کو قبول اسلام کے بعد عرب لباس یا عرب عادات کا تابع کیا گیا ہو۔ البتہ زندگی جینے کے جو رہنما اصول قرآن بتلاتا تھا، سپردگی اور تقویٰ شعاری کی جو کیفیت فرد میں پیدا ہوتی جاتی تھی، اس کے اثرات زندگی کے تمام گوشوں پر پڑ رہے تھے۔ یہ غلط فہمی عرب اسلامی معاشرے میں بہت بعد میں پیدا ہوئی کہ عربوں کو لسانی یا نسلی اعتبار سے غیر عرب قوموں پر کوئی تفوق حاصل ہے۔ بالخصوص جب نسل پرستی کے زیر اثر اور بعض سیاسی حالات کے پیش نظر بعض گوشوں سے حضرت علی کے استحقاق خلافت کے لئے صدائیں بلند ہونے لگیں اور جب امت اسلامیہ تیسرے خلیفہ کے عہد میں خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئی تب اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر دبے ہوئے جاہلی جذبات نے دوبارہ سر اٹھایا کسی نے اَلْاَ ئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ کہہ کر "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" کے توحیدی تصور حیات پر ضرب لگانے کی کوشش کی، تو کسی نے قرابت داری اور خاندانی قرب کو استحقاق خلافت کے لئے لازم قرار دیا۔ جب ایک بار قبائلی عصبیت کو پنپنے کا موقع مل گیا تو پھر خلافت کا نبوی منہج سے ہٹ کر اموی سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔ آگے چل کر اس کشمکش نے عباسی خلافت کے لئے نظری جواز فراہم کر دیا۔ اسی صورتحال سے فاطمئین مصر نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اسلام جو عرب و عجم کی عصبیت کو ختم کرنے اور قبائلی بھید بھاؤ کو نیست و نابود کرنے کے لئے آیا تھا عہد عثمانی میں فتنے کے سبب ان عصبیتوں کو ختم نہ کیا جاسکا۔ بہت جلد اموی اور عباسی معاشرے میں غیر عربوں کے لئے موالی کا ادارہ قائم ہوگیا۔ اور ایسا محسوس ہوا جیسے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" کے علمبرداروں نے اس پروجکٹ کو فوری طور پر منجمد کر دیا ہو۔ عہد رسول کے سماجی ماڈل سے اس کھلے انحراف پر کوئی مؤثر صدائے احتجاج بھی بلند نہوسکی۔ صورتحال اتنی خراب ہوگئی کہ ابن خلدون جیسے مؤرخ کو ہمارے سیاسی زوال کے پیچھے عرب عصبیت کا اضمحلال نظر آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اموی اور عباسی خلافتیں عرب عصبیت پر قائم ہونے کے بجائے عرب و عجم کی عدم تفریق پر قائم ہوئی ہوتیں تو ان کا یہ حشر نہ ہوتا اور آج سات آٹھ صدیاں گذرنے کے باوجود ہم خود کو مابعد سقوط بغداد کے عہد میں محسوس نہ کرتے۔

جو لوگ مستقبل میں قرآنی منشور کو برتنے اور اس کی بنیاد پر ایک عالمی نظام عدل کا خواب دیکھتے ہیں انہیں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لینی ہوگی کہ اموی اور عباسی خلافتیں نبوی منہج سے انحراف پر قائم

ہوئی تھیں۔ یہ ہمارے لئے کوئی قابل تقلید نمونہ تو کیا ہوں گی ہاں ہماری تاریخ کا باب عبرت ضرور ہیں جن سے ہمیں مستقبل میں اپنا دامن بچانا ہوگا۔ یہی معاملہ عثمانی ترکوں کی خلافت، اسپین میں عرب اور ہندوستان میں مغل ایمپائر یا ایران کی صفوی ریاست کا ہے۔ یہ تمام ماڈل نبوی منہج سے انحراف پر مبنی تھے جسے دوبارہ دہرانے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔

اسلام رب کائنات کا دین ہے اس کی نظر میں تمام انسان خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں سکونت پذیر ہوں سب کے سب برابر ہیں۔ فضل کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ کسی ایسی زبان یا تہذیبی خطے سے آنے والے فرد کو جو عددی یا غیر اسٹریٹجک محل وقوع کی وجہ سے انتہائی غیر اہم سمجھا جاتا ہو اسے کار نبوت میں صرف اس بنیاد پر اسے محرومی کا احساس نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی کسی قوم کو صرف اس لئے دوسری قوموں پر کوئی (edge) فوقیت ہوسکتی ہے کہ اس کی پیدائش عرب تہذیب کے بطن میں ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے یہاں عرب عادات و تقالید پر اصرار یا احمد سرہندی کے یہاں مقامی عادات واطوار کی طرف تحقیر آمیز رویہ اسلام کے آفاقی تصور سے متصادم ہیں اسے توحیدی چوکٹھے میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب مختلف تہذیب کے لوگ جو موجودہ نظام جبر سے تائب ہوکر ایک ایسی دنیا کی آرزو کر رہے ہیں جو اسلام کا مقصود و مطلوب ہے، جب یہ لوگ اپنے تہذیبی اثرات کے ساتھ قافلۂ حق میں شریک ہوں گے، یا بعض تحفظات کے ساتھ اسے اپنا تعاون پیش کریں گے تو اس قافلے کے تہذیبی قالب پر ایک واضح فرق نظر آئے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس پر عربی اور مشرقی رنگ سے کہیں زیادہ غربی رنگ غالب نظر آئے۔ لیکن اس صورتحال سے ہمیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہمیں اس صورتحال سے پریشان ہونا چاہیئے کہ قافلۂ حق میں مغربی قوموں کی شمولیت سے اس کا مشرقی رنگ جاتا رہا ہے یا یہ کہ امت محمدیہ کے باہر پائے جانے والے اسلمنا. کے حاملین نے اس کی مجموعی شناخت کو متاثر کیا ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام جس نظام عدل کا داعی ہے اس کی طرف واقعتاً پیش رفت ہو رہی ہے یا نہیں؟

اسلام اور مستقبل کی تہذیبی جنگ

○ ساتواں سوال: ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ مستقبل کی اسلامی تحریک پر تہذیبی اثرات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ آپ نے اسلمنا کے حوالے سے کارنبوت میں جن لوگوں کے لئے راستہ کھلا رکھا ہے ان کے تہذیبی اثرات کو بھی آپ خطرہ تصور نہیں کرتے۔ دوسری طرف آج مشرق و مغرب میں ہر جگہ اسلام کے حوالے سے بعض مفکرین، جن میں سیموئل ہنٹنگٹن خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نے مستقبل میں ایک تہذیبی جنگ کی پیش گوئی کر رکھی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اسلمنا کے حوالے سے اس تہذیبی جنگ کو شروع ہونے سے پہلے ہی ہار جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

○ جواب: ہمارے خیال میں یہ اندیشہ دو وجہوں سے درست نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دین کو تہذیب کے طور پر دیکھنا درست نہیں کہ تہذیب کا قالب دین کے جملہ ابعاد کو متشکل نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ خالص اسلامی تہذیب کا وجود میں آنا ابھی باقی ہے۔ یہ نکتہ قدرے وضاحت چاہتا ہے۔ فی زمانہ جو لوگ مختلف تہذیبوں کے تصادم کو مستقبل کے منظرناموں کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ اپنے طور پر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اسلامی تہذیب موجودہ دنیا میں کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہے جس کا راست تصادم عیسائی مغرب کے ساتھ ہونا گویا اب طے ہے۔ یہ ایک بڑا مغالطہ ہے جس سے ہمارے اہل فکر بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ذرا ان سے پوچھئے کہ کہاں ہے وہ اسلامی تہذیب جس سے تم مغرب کے تصادم کی پیش گوئی کرتے ہو۔ اس اسلام کی نمائندگی کون سی قوم کر رہی ہے یا دنیا کے کس خطے میں یہ تہذیب پائی جاتی ہے۔ مسلم دنیا میں اسلامی تہذیب کے جو مختلف قالب فی الوقت دستیاب ہیں انہیں عرب اسلامی، ایفرو اسلامی، ہند اسلامی یا ان جیسے دوسرے لاحقوں کے ساتھ جانا جاتا ہے۔ جو خود اس بات کا اعلان ہے کہ ابھی حقیقی اور خالص اسلامی تہذیب کا وجود میں آنا باقی ہے، ایک ایسی تہذیب جو پوری انسانیت کی مشترکہ میراث ہو اور جہاں اس طرح کے لسانی یا علاقائی لاحقوں نے اپنی اہمیت کھو دی ہو۔ یہ سب کچھ موجودہ شرک پیراڈائم سے نکل کر توحیدی پیراڈائم میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔ جس طرح دنیا کی دوسری قوموں کو اس paradigm shift کے لئے ایک عظیم ذہنی اور

نفسیاتی جنگ لڑنی ہوگی اسی طرح موجودہ فقہی مسلمانوں کے لئے بھی ان لاحقوں کو خیر باد کہتے ہوئے "اُدْخُلُوْا فِيْ السِّلْمِ كَافَّةً" کی شان پیدا کرنا کچھ آسان نہ ہوگا۔ تب ہی اس تہذیب کا طلوع ممکن ہوگا جس کے لئے تمام ہی پیغمبر بھیجے گئے اور جس کے عملی طریقۂ کار کی وضاحت آخری رسول کے ہاتھوں انجام کو پہونچی۔ اب ان کے متبعین کے ہاتھوں برپا ہونا ہے۔ یہ تہذیب جاہلی تہذیبوں کے مکمل انہدام، (total destruction) سے وجود میں آئے گی۔ یہ ایک ایسی تہذیب ہوگی جو اپنے اندر تمام انسانی تہذیبوں کے مثبت پہلوؤں کو جذب کرلے گی اور یہی وہ آخری تہذیب ہے جس کے برپا ہونے کے بعد اس کا کوئی حریف باقی نہ رہ جائے گا۔ مغربی مفکرین ہوسکتا ہے اس صورتحال کو تاریخ کے خاتمے سے تعبیر کریں۔ البتہ توحیدی تصورحیات کے مطابق یہ سب کچھ ایک نئی ابتداء کومہمیز کرنے کا سبب ہوگا۔ جب انسان اپنے تہذیبی سفر میں اس منزل مقصود کو پہونچ جائے گا تو اس پر وہ حقیقت منکشف ہوگی جس کا ادراک نظامِ شمسی کے قیدیوں کے لئے ممکن نہیں۔ تب زمان ومکان کی بندشیں اٹھالی جائیں گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ اور سعید روحوں کو لقاء ربی کے وعدے سے سرفراز کیا جائے گا۔ یہ ہے تہذیب کا وہ سفر جسے مومن اپنی نگاہوں میں متحضر دیکھتا ہے۔

مستقبل کی تہذیبی جنگ میں اسلام کی شمولیت کے لئے لازم ہے کہ اسلامی تہذیب بھی وجود میں آگئی ہو۔ فی زمانہ اسلامی یا عیسائی تہذیب کے نام پر جو مختلف قوتیں متصادم ہیں واقعہ یہ ہے کہ ان کا نہ تو اسلام سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی مسیحیت سے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ حضرت مسیح کے متبعین اور محمد ﷺ کے پیروکاروں کے تہذیبی اہداف مختلف ہوں، یہاں تک کہ ان کے تصادم کی نوبت آجائے۔ اس لئے عالمی سطح پر مشرق ومغرب کے تصادم یا شمال وجنوب کی چپقلش کو مذہبی یا دینی تصادم کا نام دینا غلط ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فطری وسائل پر قبضے کی غرض سے، ایک قوم دوسری قوم کے استحصال کے لئے جنگ کا بگل بجا رہی ہے اور اس کھلی جارحیت اور وحشیانہ پن کو تہذیبوں کے تصادم کا نام دیا جارہا ہے۔

نظامِ عدل اور مسلم حکومت میں فرق

○ آٹھواں سوال: مستقبل کے جس نظام عدل کی آپ تصویر پیش کررہے ہیں اور جسے آپ قرآن مجید

کا مقصود و مطلوب بتلاتے ہیں اس کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ ماضی میں اہل ایمان کے معاشرے کو حکومتی جبر کے بغیر چلانا ممکن نہ رہا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ ریاستی ڈھانچے کو ایک فولادی ہاتھ کے بغیر برقرار رکھنا مشکل ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ دنیا میں مختلف انقلابات کے نتیجے میں جو حکومتیں بنیں وہ بھی آگے چل کر نظامِ جبر میں بدل گئیں۔ مستقبل کا یہ مجوزہ عالمی نظام کہاں تک اس خطرے سے بچ سکے گا؟ کیا یہ اندیشہ نہیں ہے کہ ہماری جدوجہد عالمی سطح پر ایک ایسی totalitarian ریاست قائم کردے جس کے زبردست پنجے سے بچ نکلنا مشکل ہو جائے؟

○ جواب: میں نہیں کہتا کہ یہ اندیشہ بلاوجہ ہے کہ ماضی میں ایسا ہوتا رہا ہے البتہ مستقبل کے عالمی نظامِ عدل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم نبوی ماڈل کی صحیح تفہیم پیدا کریں۔ امیر المسلمین کی شکل میں ایک فولادی ہاتھ تو یقیناً پایا جاتا ہے۔ البتہ اس فولادی ہاتھ پر لگامیں اتنی سخت ہوتی ہیں کہ یہ کسی ظلم یا زیادتی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے جس واقعہ سے آپ متوحش نظر آتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ اس واقعہ میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اہل حق کے امیر کا فولادی ہاتھ اتنا بے ضرر ہے کہ وہ دشمن کو تعمیل جرم سے پہلے سزا دینے یا اس کی گرفت کرنے کو بھی زیادتی خیال کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے فولادی عزم اور سخت گیری کے باوجود خود کو عام مسلمانوں سے ممتاز نہیں سمجھتے یہاں تک برسرِمنبر عام لوگوں کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ آپ سے باز پرس کرسکے۔ خلفاء راشدین کی طرز حکمرانی میں ایک چیز جو سب سے نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ حکمراں رہتے ہوئے بھی اپنی ساری زندگی حکمرانی کے ادارے کی نفی کرتے رہے ہیں۔ محمد رسول اللہ نے انسانوں کو انسانوں کی سیاسی اور روحانی پیشوائی سے جو آزادی دلائی تھی خلافت راشدہ کا بنیادی ہدف اس آزادی کا تحفظ تھا۔ مستقبل میں عالمی سطح پر نظامِ عدل کے قیام کی کوشش اسی نبوی منہج کا پرَتو ہوگی جہاں حکمران تو کہیں نظر نہیں آئے گا، البتہ معاشرے کی ترتیب و تنظیم اور سج دھج پر ایک خود کار حکمرانی کا گمان ہوگا۔ کسی ایسی عالمی حکومت اور نامحسوس حکمرانی کے لئے آج پہلے سے کہیں زیادہ امکانات موجود ہیں۔ رسل و رسائل کی سہولتوں، Information Technology کے انقلاب اور satellite سے کنٹرول ہونے والی دنیا میں عالمی سطح پر اس تجربے کو برتنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ امکانات موجود ہیں۔ قوت کے سیاسی مراکز کے کسی قدر تحلیل ہو جانے

اور متبادل مراکز کے وجود میں آجانے سے اب پہلے سے کہیں زیادہ اس بات کا امکان ہو چلا ہے کہ حکمرانوں کی حکمرانی محض ریاست کے انتظامی امور یا شہری خدمات تک محدود ہو کر رہ جائے۔ سکڑتی دنیا نے ایک مشترکہ تہذیب کے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ گویا مدنی ماڈل کو عالمی سطح پر بروئے کار لانے کے لئے پوری طرح ماحول سازگار ہے۔

صرف اسی پر بس نہیں بلکہ پوری دنیا میں بالخصوص مغرب جسے ہم دین سے بے بہرہ معاشرہ تصور کرتے ہیں وہاں نظامِ عدل کی مبادیات پر نہ صرف یہ کہ سنجیدہ بحث و مباحثے کا سلسلہ چل نکلا ہے بلکہ بہت سے لوگ انسانی حقوق، مذہبی آزادی، حقوق نسواں، حقوق اطفال، حقوق اسیران، انفرادی آزادی کے عناوین سے سرگرم ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے لئے خود کو مضطرب پاتے ہیں جہاں ان اقدار کا حصول ممکن ہو سکے۔ دیکھا جائے تو نظامِ عدل کے ایجنڈے کا ڈول ڈالنے کے لئے ماحول پوری طرح سازگار ہو چکا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم مدنی ماڈل کو موجودہ حالات میں عالمی سطح پر برتنے کا شعور رکھتے ہوں۔ ہمیں اس مدنی ماڈل کو مارکٹ کرنے کا فن آتا ہو اور ہم اسلام کو، جیسا کہ وہ ہے، کسی تہذیبی قالب کے بغیر مضطرب انسانوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ہمارا کام وحی ربانی کو جملہ ابعاد کے ساتھ لوگوں کے سامنے منکشف کر دینے کا ہے۔ اس کے بعد آگے کا راستہ خود وحی کی روشنی میں انجام پائے گا۔

✡ ✡ ✡